بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منازل السائرہ

حصّہ اوّل

تصنیف

مصوّرِ غم علّامہ راشد الخیری مدظلہ

مصنف صبح زندگی، شام زندگی، بنت الوقت، سراب مغرب وغیرہ وغیرہ

جسے

ملا محمد واحدی دہلوی

نے

بماہ صفر المظفر ۱۳۴۷ ہجری النبوی مطابق اگست ۱۹۲۸ عیسوی

چھٹی مرتبہ

[illegible] اینڈ سنز کی [illegible] دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر [illegible]

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

۱۱۹۷

اطلاع وانتباہ

منازل السائرہ کا دائمی حق اشاعت سر شیخ عبدالقادر صاحب (لاہور)۔ مجھے دیدیا ہے اس لئے کوئی صاحب اسے یا اس کے کسی حصتہ کو بطور خود چھاپنے کا ارادہ نہ کریں۔ ورنہ اخلاقی وقانونی جرم کے مرتکب ہوں گے۔ ہاں کتب فروش اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیں تو معقول کمیشن پر اس کی جلدیں دفتر نظام المشائخ دہلی سے خرید سکتے ہیں۔

جس کتاب پر پبلشر کے قلمی دستخط نہ ہوں گے وہ مال مسروقہ سمجھی جائیگی۔

خاکسار واحدی مالک وایڈیٹر نظام المشائخ۔ پوسٹ بکس ۵۱ دہلی

تصنیفات مصور غم علامہ راشد الخیری مدظلہ

صبح زندگی	تیغ کمال	سراب مغرب	جوہر عصمت
شام زندگی	سمرنا کا چاند	فسانہ سعید	روداد قفس
شب زندگی حصہ اوّل	منازل السائرہ حصہ اوّل	تائید غیبی	قطرات اشک
شب زندگی حصہ دوم	منازل السائرہ حصہ دوم	لڑکیوں کی انشا	نانی عشو
نوحۂ زندگی	عروس کربلا	اعمالنامے	بچہ کا کرتہ
اُمت کی مائیں	محبوبہ خداوند	سنجوگ	منازل ترقی
الزھرا	آفتاب دمشق	گوہر مقصود	ستونتی
قطرات اشک	موؤدہ	دُرِ شہوار	امین کا دم
جوہر قدامت	ماہ عجم	شاہین و دراج	گلدستہ عید
شام	بنت الوقت	انگوٹھی کا راز	نوبت پنج

ملنے کا پتہ : منیجر نظام المشائخ پوسٹ بکس ۵۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

سائرہ تھی تو مسافر مگر رستے کی فضا منازل کی دلچسپی پردیسیوں کی محبت نے کچھ ایسا جادو کیا کہ غرض سفر اور سبب سفر سب بھول بھلا گئی۔ ایسی ٹھسکہ بیٹھی کہ نکلنے کو جی ہی نہ چاہا۔ چاہیے تھا کہ جن آنکھوں آئی انہی آنکھوں جاتی مگر یہاں کے سیمیائی جلوے دیکھکر ایسی عاشق ہوئی کہ مرگئی اور جانے کا نام نہ لیا۔ معاملے کی بات یہ تھی کہ مسافر بنگلے کی مہمان بنکر رہتی۔ جان لیکر آئی ایمان لیکر جاتی۔ ماں باپ کی خدمت کرتی، بہن بھائیوں سے محبت، میاں کی اطاعت کرتی، ساس کی عزت، میکے میں رہتی، ماں باپ نہال ہوتے سسرال جاتی لالوں کی لال ہوتی۔ دنیا میں ہر دلعزیز رہتی۔ خدا کے ہاں سرخرو ہو جاتی۔

کچھ خدا ہی مددگار تھا کہ سائرہ جیسی گنہگار جسکا بال بال تعلقات دنیا میں گرفتار تھا آخر وقت اس مرحلہ بے ثبات سے ایسی بیزار ہوئی کہ تمام دنیا واہ واہ کرتی تھی۔ سمجھ آئی مگر دیر میں، ہوش آیا مگر سخت بیہوشی کے بعد۔

وہاں کا حال تو خدا ہی جانے مگر قیاس چاہتا ہے کہ سائرہ کا سفر آخرت اس سفر سے

اچھا رہا۔ جو کچھ کیا اس پر منفعل اور نادم تھی، گنہگار ضرور تھی مگر رحم کی خواستگار اور بخشش کی امیدوار، کیا تعجب ہے کہ یہی تاسف و انفعال باعث مغفرت ہوگیا ہو بہر حال بقدر دعائے خیر کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہی تکلیفیں اس کے گناہوں کا کفارہ ہوجائیں۔

سائرہ کے واقعات و تعلقات و عادات از ابتدا تا انتہا غالباً بلکہ یقیناً مگر انشاء اللہ اس کی ہم عمر لڑکیوں اور عورتوں کے واسطے اگر دنیا کے دھندوں نے مہلت دی اور اس مضمون پر غور کیا جیسے واسطے سینکڑوں صفحے سیاہ ہوئے تو بلا شبہ دین دنیا دونوں کے واسطے سفید ثابت ہوں گے۔

منزل اوّل

عالم شیر خوارگی

یہ ایک چھوٹا سا مگر خوشنما و شاداب باغیچہ تھا۔ مختلف عمروں کے آدمی مرد اور عورتیں باد بہاری کا لطف اٹھاتے پھر رہے تھے صبح سعادت کا وقت تھا۔ گلہائے رنگین کی پیاری صورتوں نے زمین چمن کو ابو قلموں کر رکھا تھا۔ شبنم نے موتیوں کے ہار بچھا دیے تھے۔ باد صبا فرحت و انبساط کے مژدے دیتی پھرتی تھی، عورتوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ مرد جوق در جوق ہاتھ میں ہاتھ دیے ہنستے بولتے ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ امید و اُن کے چہرے مالا مال اور دل چونچال کر رکھے تھے۔ ہرے بھرے گلزار آنکھوں کے لہلہا رہے تھے۔ ارمانوں کے قدرتی چشمے کشتِ امید کو تر و تازہ کر رہے تھے۔ انتہائے اور حد خیال تک چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ شاداب دکھائی دیتا تھا۔

وسط چمن میں ایک دودھ کی نہر لہریں لے رہی تھی۔ کیا بیفکری کا زمانہ تھا۔ مسافر وہی چھوٹے چھوٹے بچے، بھوک لگی کنارہ پر آئے۔ منہ جھکایا اور سیر ہوگئے۔ یہ مسافر ایک نعمت تھے کہ کلیجے سے لگا کر دنیا بھر کی کلفت دور ہوجاتی تھی۔ افکا

ملال خواب وخیال ہو جاتے تھے۔ رنج وغم غلط ہو جاتا تھا۔ کیا نعمت تھی جسکے مقابل ہفت اقلیم کی سلطنت ہیچ و بے وقعت تھی۔ بادشاہ وقت کا حکم اتنا۔ مناسب تھا کہ ہر شخص مسافر نوازی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس خدمت سے محروم رہ جاتا تو اپنے تئیں نہایت بدقسمت تصور کرتا۔ کیا مبارک سرزمین تھی جو مرد نظر آیا وہ شگفتہ اور جو عورت دکھائی دی وہ باغ باغ۔ عورتوں کے پرے کے پرے جس وقت ان مسافروں کو گود میں لیکر گلگشت کو نکلتے تھے درختوں سے آفریں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔

یہ محافظ و خبر گیر جو مسافروں کی خدمت پر متعین تھے کیسے اچھے لوگ تھے کہ سو جان سے نثار۔ ذرا مسافر کے پھانس لگی اور بے چین ہوئے۔ اُن لوگوں کی پیشانیاں ستارۂ صبح کی طرح روشن تھیں اور اُن کے دل برکت نور سے معمور۔ محبّت کا سرمہ اُن کی آنکھوں میں لگا ہوا تھا اور خدمت گزاری کی روشنی اُن کے چہروں پر چمک رہی تھی۔ مکر کا نام نہ تھا، ریا کا کام نہ تھا، خالص محبت تھی اور سچی خدمت! اللہ اللہ کیا لوگ تھے کہ جان تک دے دریغ نہ کرتے تھے۔ خوش قسمت میزبان تھے کہ کامیابی کے ساتھ مہمانوں کی خدمت ختم کرتے تھے۔ اگر کوئی مسافر اُن کی خدمت ہی میں ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو جاتا تو روتے تھے اور پیٹتے تھے۔

یہاں ایک بات دیکھکر بہت ہی تعجب ہوا۔ بہت کم مسافر ایسے نظر آئے کہ خدمت محافظین کو مدنظر رکھا۔ اس خدمت کا معاوضہ تو خیر ناممکن تھا۔ مگر جب وہ وقت آتا کہ وہ اُن کے محتاج ہوتے تو یہ آنکھ چرا جاتے، لذائذ نفسانی کے پابند ہو جاتے، غیروں سے محبت کرتے۔ دوستوں سے اختلاط کرتے، خود محافظ ہو کر مسافروں کی خدمت کرتے، لیکن وہ خدمت فراموش کر دیتے جس کی بدولت خدا نے اس قابل کیا۔ پھر بھی وہ اللہ کے بندے ہر حال میں خوش تھے جسکو سنا یہی کہتے سُنا "خدمت کرو تمھاری سعادت ہے، نہ کرو کچھ شکایت نہیں"۔

اس پر بھی منزلوں مسافروں کے ہمراہ جاتے اور حتی المقدور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ ہر منزل میں خدمت کرتے اور ہر مصیبت میں شریک رہتے۔ ان میں بعض تا قیامت

اندیشں ایسے بھی تھے جو عقل کی آنکھوں پر پردے ڈال لیتے تھے اور ہر درجہ محبت کو کمال پر پہنچا کر امتیاز کو کھو دیتے تھے۔ اپنے برے اعمال اور ناقص فعال کا نمونہ دکھا کر مطلب اصلی خبط کر دیتے تھے اور پہلی ہی منزل سے مسافر بیچاروں کی بات مارنی شروع کر دیتے تھے، مسافر کے اسباب میں یہیں سے گھن لگنا شروع ہو جاتا تھا۔ جو اندر ہی اندر بیخ کنی کرتا ہوا تمام جسم کو کھوکھلا کر دیتا تھا۔

ہر حیثیت کے مسافر اس منزل میں موجود تھے مگر سب بفکر اور فارغ البال۔ دو ڈھائی برس تک کے بچے یہاں قیام کرتے تھے اور اس کے بعد آگے روانہ ہو جاتے تھے منزل پُر لطف تھی، مگر سفر خطرناک۔ رستہ حیرت انگیز تھا اور نتائج رنج آمیز تقریباً دو سال سائرہ نے یہاں قیام کیا اور پھر سرائے طفولیت کی طرف روانہ ہوئی۔

(۱)

پردیسی کے آنے کا نہ کوئی وقت مقرر تھا نہ دن معلوم۔ پندرہ پندرہ دن سے روز صبح شام ہو رہی تھی۔ ٹھیک اطلاع تھی نہ ہو سکتی تھی۔ شاکرہ کے پورے دن ہوتے ہی اوپر والیاں نئے مہمان کی آمد کا انتظار کرنے لگیں۔ تیاریاں تو پہلے ہی مہینے سے شروع ہو گئی تھیں مگر نویں کے بعد ایک ایک دن کاٹنا قیامت ہو گیا سلیم چار بھائیوں میں ایک لڑکا، چھ بہنوں میں ایک لڑکا، پانچ لڑکیوں میں ایک لڑکا۔ تین لڑکوں پر ایک لڑکا۔ سینکڑوں منتوں اور ہزاروں تعویذ گنڈوں سے نوجوان ہوا۔ اب خدا نے یہ دن دکھایا کہ سلیم کے ہاں بچہ ہو۔ جس قدر اللہ آمیں ہوتی سب بجا و درست تھی۔ سینکڑوں کرتے ٹوپی تیار ہو رہے تھے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بیسیوں منتیں مانی جا رہی تھیں۔

استقرار حمل شاکرہ غریب کے واسطے گویا کسی سنگین جرم کا ارتکاب تھا۔ قیدیوں سے زیادہ حفاظت ہونے لگی۔ یہ جیٹھ بیساکھ کی گرمی کہ رات بھر پنکھا ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اس بیچاری کو پانچ ہی بجے سے دالان میں چلے جانیکا حکم چڑھ جاتا۔ پھر اندھیری تو اندھیری

چاندنی رات تک ہیں کیا مجال جو صحن میں تنہا قدم رکھ لے۔ ذرا جگہ سے ہلی اور خلیا ساسوں کی فوج ساتھ چلی۔ انگنا لگتے ہی تو ایک وقت کی معمولی غذا بھی موقوف ہو گئی کہ نون مرچ کا اثر بچے پر نہ ہو جائے۔ شام کا کھانا فقط دودھ ہی دودھ رہ گیا۔

ہاتھوں میں تعویذ، گلے میں گنڈے، انگارا شاہ کا دم کیا ہوا پانی، بڑے پیر جی کی پڑھی ہوئی کھیلیں، حافظ جی کے فلیتے غرض ہر وقت ایک نہ ایک شعبدہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر لوں کا اللہ ہی حافظ تھا۔ زچاؤں پر یہ سال بہت ہی بھاری تھا شاید ہی ایک آدھ بچی تو بچی، ورنہ ہر طرف سے موت کی آوازیں آ رہی تھیں یہاں تک کہ کمشنر صاحب کی میم بھی اسی سلسلہ میں رخصت ہوئیں۔ سلیم کا باپ جو اسسٹنٹ سرجن تھا ابتدا میں تو ان خبروں کو لغو سمجھتا رہا مگر مس فورڈ کی موت دیکھ کر بالکل سٹ پٹا گیا۔ سول سرجن اور لیڈی ڈاکٹر بیٹھے کے بیٹھے ہی رہی اور میم صاحب چل بسیں۔ اسپتال آیا تو توانزدہ ہو گیا اور سنیں چھکے چھوٹ گئے۔ گھر پہنچا تو حکیم شفاء اللہ برابر میں رہتے تھے، بیوی پورے دن پیٹ تھیں اُنکی میت نکل رہی تھی۔ صبح کو حکیم جی سے ملا گیا کچھ ذکر نہ تھا۔ دس بجے درد لگا بارہ بجے سرد ہو گئیں۔ اندر آیا تو چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، بیوی نے تسلی تشفی کی تو ذرا اطمینان ہوا مگر ڈاکٹر ہو کر دل کا ایسا کچّا نکلا کہ عورتوں سے زیادہ زچہ خانہ کا صدمہ دل پر بیٹھ گیا۔

حتی الوسع احتیاط کی جاتی تھی کہ شاکرہ کے کان تک یہ آوازیں پہنچنے پائیں مگر ہزار احتیاط لاکھ معقول انتظام ہو شہر کی خبریں کہاں تک چھپ سکتی ہیں۔ پہلوٹی کا بچہ تھا بجائے موٹا تازہ ہونے کے جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے مُردے سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔

رمضان کا مبارک مہینہ تھا۔ جمعہ کی رات صبح کو منجھلا روزہ۔ دو بج رہے تھے کہ شاکرہ کو درد لگے یوں تو دو عورتیں باری باری رات بھر ہی پہرہ دیتی تھیں مگر اس وقت سارا گھر سحری کے واسطے جاگ رہا تھا۔ شاکرہ کی طبیعت شام ہی سے بےچین تھی، مگر پہلا اتفاق تھا تیرہ مہینے کی بیاہی ساس نندوں سے ابھی اچھی طرح بے تکلفی بھی نہ ہوئی تھی کسی سے

ذکر تک نہ کیا۔ اس وقت بھی کچھ دیر ضبط کیے بیٹھی رہی مگر درد کی نا قابل برداشت تکلیف اور پے در پے حملوں نے بے اختیار کر دیا۔ رونے لگی مگر چپکے چپکے۔ کراہنے لگی لیکن آہستہ آہستہ خلیا ساس برابر بیٹھی تھیں مگر ایسی آنکھوں کی اندھی کہ بہو کئی بار اٹھی۔ پھر بیٹھی پھر اٹھی۔ روتی رہی کراہتی رہی اور ان کو خاک خبر نہ ہوئی۔ ایسی ننھی بھی نہ تھیں پانچ چھ بچوں کی ماں تھیں۔ گو بچہ ایک نہیں یہ ہوئے چھ۔ ایک کچا گیا ایک اٹھوا لسا گیا۔ تین دودھ پیتے گئے، ایک پلا پلایا گیا۔ دیکھ سکتی تھیں اور سمجھ سکتی تھیں جان سکتی تھیں اور پہچان سکتی تھیں، مگر اس اللہ کی بندی کو تو تمام دنیا کے جھگڑا اسی وقت بندھنے تھے۔ خدا جانے کس سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔

شاکرہ اسی طرح پہلو بدل رہی تھی کہ ساس نے آ کر کہا بیٹی کل روزہ رکھنے کو کہہ رہی تھیں شام کو دودھ بھی نہیں پیا۔ لو یہ چاولوں کا نوالہ کھا لو نہیں تو دن بھر کلیجہ بچے گا۔

جھک کر دیکھتی ہیں تو بہو کی حالت ہی کچھ اور ہو رہی ہے اور بہن بیٹھی اونگھ رہی ہیں برتن وہیں چھوڑے اور ضروری چیزوں کا ٹھیک ٹھاک کرنے لگیں۔ چھپر کھٹ تیار ہی کھڑا تھا۔ بچھونا صاف کر بہو کو لٹایا۔ پانی کی گھڑیا چولھے پر رکھ دی اور بہو کے پاس آ بیٹھیں۔

خدا کی شان، دائی یا تو مہینے سوا مہینے سے روز یہیں سویا کرتی تھی یا اس دن نہ آئی۔ تقدیر کی خوبی ڈاکٹر صاحب بھی موجود نہ تھے۔ باہر کے دو نوکر ایک ڈاکٹر صاحب کے ساتھ دوسرا تہجد پڑھ کر جو وظیفے میں بیٹھتا تو فجر ہی کو اٹھتا۔ وہ بھی گھر پر نہیں، مسجد میں۔ اندر کی مامائیں، ایک رات کو دیکھنے سے معذور، دوسری باہر نکلنے سے مجبور۔ ہمسائی کے بیٹے کی خوشامد کی، لالٹین جلا کر ہاتھ میں دی، ماما کو ساتھ کیا۔ خوش قسمت دائی گھر پر نہ ملی بیٹی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ مگر ماما تھی ہوشیار پتہ پوچھ کر وہیں پہنچی اور دائی کو ساتھ لیکر آئی۔

علی الصباح ڈاکٹر صاحب آئے۔ تو گھر کی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ بیوی پریشان

سالیاں بدحواس، بہنیں گھبرائی ہوئیں۔ بھاوجیں سٹ پٹائی ہوئیں کسی کے ہاتھ میں تسبیح۔ کسی کے لب پر دعا۔ اِدھر مامائیں مشکلکشا مشکلکشا پکار رہی ہیں۔ اُدھر بیوی اللہ اللہ کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا نمبر اس معاملہ میں سب سے بڑھا رہا۔ عورتوں کی یہ حالت دیکھ کر آپ بھی دیوار سے لگ کر ایک کونے میں کھڑے ہو گئے اور لگے نصر من اللہ و فتح قریب چیخ چیخ کر پڑھنے اوّل تو مرد اس پر ڈاکٹر۔ چاہیئے یہ تھا کہ حالت دیکھتا، کیفیت پوچھتا، کچھ صلاح دیتا کوئی دوا بتاتا، دوا نہ بتاتا تدبیر بتاتا مگر وہ تو عورتوں سے بھی بدتر نکلا۔ اس سے تو شاکرہ ہی اچھی رہی۔ یہ کچھ تکلیف تھی اور جان پر بن رہی تھی مگر کیا مجال جو مُنہ سے آواز تک نکالی ہو۔ بیوی کسی ضرورت سے باہر آئیں تو میاں کو دیکھ کر بولیں خدا کے واسطے کوئی علاج بتاؤ دو بجے سے تڑپ رہی ہے۔ دردوں پر درد اُٹھ رہے ہیں اور بچہ ہے کہ کسی عنوان ہونے کا نام نہیں لیتا۔ بلا سے میم ہی کو بلا لاؤ۔

ڈاکٹر صاحب جانے ہی کو تھے جو منجھلی بہن نے آکر کہا۔ نہیں بھئی میم کو نوج لاؤ خدا نہ کرے جو اس کے آنے کی ضرورت ہو۔ جب اللہ کا حکم ہو گا آپ ہی ہو جائیگا۔

ڈاکٹر صاحب نے ارادہ فسخ کیا اور دائی کو بلا کر کہا:۔

واہ بی فرخ! میں تو سمجھا تھا کہ تمہارا ثانی آج اس شہر میں کیا دور دور نہیں ہے۔ بڑے شرم کی بات ہے اگر تمھاری موجودگی میں میم کے آنے کی ضرورت ہو۔ بتاؤ تو سہی کیا دیر ہے؟

فرّخ۔ کیا بتاؤں میری بھی اتنی عمر ہونے کو آئی۔ سینکڑوں ہی بچے میرے ہاتھوں ہوئے مگر میں نے ایسے درد آج تک نہیں دیکھے۔ دیر کیا بتاؤں بس اُس کے حکم کی دیر ہے۔ کرنے کی جو تدبیریں تھیں وہ میں سب کر چکی۔

بیٹے کی ماں اور بیٹی کی ماں یعنی سلیم کی ماں اور شاکرہ کی ماں دونوں موجود تھیں اور دونوں کے تعلقات کی اس وقت بخوبی آزمائش ہو سکتی تھی اور ہوئی۔ سلیم کی ماں بہو کے

واسطے بیچین تھیں، بدحواس تھیں پریشان تھیں، مضطرب تھیں، سب ہی کچھ تھیں۔ مگر یہ نہیں چاہتی تھیں کہ بہو بچ جائے اور بچے پر آنچ آجائے۔ شاکرہ کی ماں ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ چپکے سے نہیں آواز سے اپنوں ہی میں نہیں سمدھن تک کے سامنے کہہ چکی تھیں۔ بوا، میں بچے سے باز آئی میری بچی کا دم بچ جائے تو غنیمت ہے۔ میں نے سب کچھ بھر پایا۔

الامان! الحفیظ!! دو بجے رات کے درد لگنے لگے دوسری رات کے دو بج گئے آدھی رات کے قریب آتے وہ گذری۔ سارا دن یہ گذرا اور رات گذری۔ دوا، علاج، تدبیر، تعویذ گنڈے سب کچھ ہوا پر بچہ ہی نہ ہوا سب اکتا گئے، سونا کیسا روزہ کھولکر کھانا تک نصیب نہ ہوا۔ زردہ تو خیر طلب کی وجہ سے کھا لیا۔ ورنہ چھوٹے سے بڑے تک سب نہار منہ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ آخر دائی کھڑی ہوگئی۔ پرے ہٹ کر کہا بیویو! مجھکو اولاہنا نہ دینا۔ میرے بس کی اب بات نہیں ہے۔ میم کو بلاؤ۔ مجھکو ڈھنگ کچھ اور معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکی کو پڑے پڑے کون وقت ہوگیا، کم بھی تو بیڑا ہوگئی ہوگی۔

دائی یہ کہکر باہر آئی۔ ایسی نمک حرام تو نہ تھی کہ آدھی رات کے وقت ادھڑ میں چھوڑ کر چمپت ہوتی۔ ایسی بیوقوف بھی نہ تھی کہ برسوں کے لگے ہوئے ٹھکانے کو گھڑی بھر کے واسطے غارت کر دیتی۔ مگر شہر کی حالت دیکھکر سہمی ہوئی تھی۔ سوچتی تھی کہ اگر خدانخواستہ کچھ نیکی بدی ہوگئی تو یہ نیکبختیں میرا سر مونڈ ڈالیں گی۔ کہ کمبخت تو اتنا بھی نہ سمجھ سکی اور اگر سمجھ گئی تھی تو بتانے میں کیا ہرج تھا۔ جتا کیوں نہ دیا۔ ہوتا تو وہی جو اللہ کو منظور تھا مگر ہم اپنے ارمان تو نکال لیتے، کچھ یہ عاقبت اندیشی کچھ رات بھر کی زحمت دن بھر کی تکان کمر سیدھی کرنے لیٹ گئی۔ ذرا ایک جھپکائی ہوگی کہ فرخ فرخ آوازیں ملنی شروع ہوگئیں دائی اندر گئی۔ ڈاکٹر صاحب باہر کان لگائے کھڑے تھے کہ بچے کے رونے کی آواز آئی۔ خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ عورتوں نے آپس میں مبارکبادیں دینی شروع کیں،

حالانکہ ابھی لڑکے لڑکی کا امتیاز دائی کے سوا کسی کو نہ تھا۔ مگر شاکرہ کی زندگی سے
سب ایسے مایوس ہو گئے تھے کہ بچے کی پیدائش گویا شاکرہ کی از سر نو پیدائش تھی۔
بیٹی کے ہونے سے ذرا دل بجھ جاتا ہے، مگر اس خاندان میں تو جو بچہ کا بچہ
بھی اندر کا تارا تھا۔ اس گھر کی لڑکی سات لڑکوں سے افضل تھی۔ گھر تو گھر محلے بھر میں
خوشیاں منائی جانے لگیں۔

جس دھوم دھام اور تزک و احتشام سے چھٹی ہوئی اسکے بالتفصیل لکھنے کی
چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ سائرہ نام تجویز کیا گیا۔ ہم کو زیادہ تر سائرہ کے اُن
معاملات سے بحث کرنی ہے جو اس وقت وقوع میں آئے۔ جب وہ مرنا جینا شادی غمی
لینا دینا کھانا پینا، ایمان بے ایمانی، اچھا برا، قبر حشر، دوزخ جنت سب باتوں کو سمجھ سکتی تھی
ان حالات سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہی کہ سائرہ کی پرورش کس ناز و نعم سے ہوئی ہوگی
عورت اور مرد بوڑھا اور جوان نوکر اور ماما کوئی ایسا نہ تھا جو اس پر جان نہ چھڑکتا ہو۔ سائرہ
کچھ بچپن ہی سے ایسی ظلمن تھی کہ سب ہی کے ایمان غارت کردا گر جوان ہوئی۔ پوت کے پاؤں
پالنے ہی میں معلوم ہو جاتے ہیں، چھوٹی سی ایسی باتیں ملکاتی تھی کہ ماں باپ تک کو اندیشہ
تھا دیکھئے بڑی ہو کر کیا آفت ڈھائیگی۔ سائرہ کے کچھ ابتدائی حالات بھی لکھنے مناسب ہیں
اس کی محبت نے یہاں تک دلوں میں گھر کیا تھا کہ اس اتنی سی فتنی کے واسطے شاکرہ
کی ماں بعض اوقات جوان بیاہی بچہ والی بیٹی کو برا بھلا کہہ ڈالتی تھی۔ جب نانی کی یہ
کیفیت تھی تو پھر ساس تو ساس ہی تھیں۔ ذرا لڑکی روئی اور انہوں نے کہا پیٹ
میں درد ہوگا کوئی ثقیل چیز کھالی۔ لڑکی کو چھینک آئی اور خالیا ساس بولیں
منع کرتے کرتے شاموں شام سرد ہو گیا ہے۔ دیکھ لو بچی کو زکام ہو گیا۔ صبح کو دیر تک سوتی
اور ایک نے کہا خبر نہیں کتنی افیم دیدی جو ابھی تک نہیں اٹھی۔ بھلا وہ اندھیرے کی اٹھنے
والی اس وقت تک سونا کیا جانے۔ اب شاکرہ ہیں کہ قسمیں کھا رہی ہیں اور

کسی کو یقین نہیں آتا۔ عورتیں تو عورتیں ڈاکٹر صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ جب تک اندر رہتے اسکو اکثر لیئے رہتے اور جب تک چلتے وقت گود میں لیکر پیار نہ کر لیتے باہر نہ نکلتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کپڑے پہنے لڑکی کو لیا اور اس نے پیشاب کر دیا۔ اول اول تو دو چار دفعہ اچکن تبدیل کر لی۔ پھر یہ ہوا کہ کھڑے کھڑے پانی ڈلوا لیا مگر جب کا لشئ یعنی وصیم۔ آخر یہ ہوا کہ نہ دھلوانے کی ضرورت نہ سکھوانے کی حاجت وہی پہنے پہنے چلدیئے۔

ہزاروں ٹوٹکوں اور گنڈے تعویذوں سے خدا خدا کر کے سائرہ تیسرے برس میں لگی۔ اس وقت تک بیسیوں شادیاں اس کے نام سے موسوم ہو چکی تھیں۔

برسویں دن سالگرہ مہینے کے مہینے ماما نے تو خیر مقررہ تھے اسکے علاوہ ذرا نیڈا گرم ہوا اور دو بکرے مارنے گئے۔ آنکھ لال ہوئی اندر ملا نے بلائے گئے۔ عقیقے کی شادی، دانتوں کی شادی، ٹیکے کی شادی۔ لاڈلی بچی اور پھر ٹھہری آئے دن کی بیمار رسم نے تو جب اٹھا بیٹا رہے یا شادی ہے۔ کبھی سیسری آواز کان میں آئی۔

دودھ چھٹنے کی تیاریاں مہینوں سے ہو رہی تھیں۔ عورتوں کے عقائد میں پہلا رنج ہے جو بچہ کو دنیا میں محسوس ہوتا ہے۔ کس کے دل میں تاب تھی کہ سائرہ کے بادشاہی تخت چھٹنے کا عذاب اپنے سر پر لیتا اور اس رنج کی تحریک کرتا۔ دن گزرے چلے جاتے تھے اور سب آپس میں ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر خاموش ہو جاتے تھے۔ اتنی ہمت کسی میں تھی کہ اس عظیم الشان مہم کو سر کرتا۔

بارے ڈاکٹر صاحب ہی نے صبر کا پتھر کلیجے پہ رکھا اور مرد بنے۔ بیوی سے کہنے لگے تم نے اب تک اس کا دودھ نہیں بڑھایا۔ سچ پوچھو تو اب حرام ہے بس بسم اللہ کرو۔

بیوی۔ کیا بتاؤں روز یہی سوچتی رہتی ہوں مگر مجھے تو امید نہیں کہ سائرہ صبر کرے۔ خدا ہی ہے جو اس کی زندگی ہو۔ کچھ کھاتی پیتی نہیں یہ نہیں کسی اور چیز پہ لگی

ہوئی ہوتی تو کچھ بات نہ تھی۔ کھانا پینا جو کچھ ٹھہرا وہ لے دیکر ماں کا دودھ چھٹا تو پھر آخر کھلاؤں کیا۔ جب تک یہ اور کسی چیز پر نہ لگ جائے میں تو دودھ نہیں بڑھا سکتی۔

ڈاکٹر صاحب۔ کسی چیز پر لگانے کی کوشش بھی کی؟ یا آپ سے آپ لگ جاتی۔

بیوی۔ کیوں کی کیوں نہیں۔ سب کچھ کر چکی۔ کھچڑی پر میں لگا چکی۔ بازار کا دودھ میں منگا چکی۔ ارا روٹ میں پلا چکی۔ وہ منہ ہی نہیں لگاتی۔ خبر نہیں یہ کس پر ہوئی ہے میرا سلیم تو ایسا نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب۔ اچھا میں آج ایک چیز منگوا دیتا ہوں۔ بہت خوشی سے پیئے گی۔ تم دودھ چھڑانے کی تیاری کرو۔

بیوی۔ پہلے دیکھ تو لوں کہ پیتی بھی ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اسی وقت ایک پرچہ لکھ کر آدمی کو دیا وہ بازار سے ایک چھوٹا سا ڈبہ لایا تھوڑا سا نکال کر پانی ملایا۔ لڑکی کو دیا۔ اس نے غٹ غٹ پینا شروع کر دیا۔

مجبوراً دودھ چھڑایا گیا۔ تقدیر کی خوبی۔ اتفاق کی بات آج دودھ چھٹا کل آنکھیں دکھنے آگئیں۔ پوری پوری رات سارا سارا گھر گود میں لیئے پھرتا اور اسکی چیخم دھاڑ نہ تھمتی۔ دودھ تو خیر چھٹنا تھا چھٹ گیا مگر کیسی آفتوں اور کس قدر مصیبتوں سے۔ اس فتنی نے کیا کیا پٹخنیاں کھائی ہیں کیا کیا لوٹیں لگائی ہیں کہ سب کا دم ناک میں آگیا شادی کے موقعوں پر جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سب خدا کی عنایات سے موجود تھیں۔ روپیہ، ارمان، دل۔ جو کچھ نہ ہوتا وہ تھوڑا تھا۔ اس دھوم سے شادی ہوئی کہ اس صرف میں خاصی اچھی طرح آٹھ دس لڑکیوں کے بیاہ رچ جاتے۔

ڈیڑھ دن دو رات کی مہانداری ہوئی۔ ناچ گانا، رنڈی بھانڈ امیرنیں ڈومنیاں سب ہی کھڑاک ہوئے۔ کوئی شیطانی کام ایسا نہ تھا جو نہ ہوا ہو۔ اور کوئی بیہودہ رسم

ایسی نہ تھی جو نہ کی گئی ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا۔ ہم کو اُن کے پیٹھ پیچھے نکتہ چینی کرنی مفت کی غیبت خواہ مخواہ کا گناہ۔ مگر منہ پر آئی نہیں رکتی۔ سینکڑوں روپے اُٹھے مگر جس خدا نے یہ دن دکھایا اُس کے نام کے چار دانے بھی نہ نکل سکے۔ ڈاکٹر صاحب کی نانی کی سگی بھانجی کا لڑکا سوئیاں پچکیں بیچتا پھرتا تھا۔ جس طرح ہوتا ڈھائی تین آنے روز پیدا کر لیتا۔ عیالدار تھا مگر غریب مفلس تھا لیکن شریف۔ آٹھ دموں کا سہارا اسی کی آمدنی پر تھا۔ ایک آپ ایک ماں ایک بیوی دو لڑکے تین لڑکیاں۔ یہ آٹھ دم اسی کی کمائی سے پلتے تھے اچھی بُری طرح روٹی چلی جاتی تھی۔ دو وقت نہیں ایک وقت، سالن سے نہیں روکھی غرض لشتم پشتم گذر ہوتی تھی۔ کچھ بیوی سی پرو لیتی تھی، کچھ لڑکیاں ہاتھ بٹا لیتی تھیں۔ ملا جلا کر چار پانچ آنے ہو جاتے تھے۔ میاں بیوی میں سلوک تھا چار پانچ آنے چار پانچ روپیوں کی برکت رکھتے تھے۔ جو میسر ہوا سب بیٹھ گئے اور سر جوڑ کر سلوک سے کھا لیا۔ کیا خدا کے نیک بندے تھے کسی موقع پر اور کسی حال میں شکایت زبان پر نہ آئی۔ میاں کو جب دیکھو خوش بیوی کو جب دیکھو شکر گذار۔ امیر غریب کا رشتہ کیا۔ مفلسی نے ڈاکٹر صاحب کے خاندان سے رشتہ ناتا۔ لین دین، آنا جانا ملنا جلنا سب بند کروا دیا تھا۔ مگر اتنی غیرت فقیر بھی رکھتا تھا کہ کسی امیر رشتہ دار کے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلایا۔ ہونی شدنی نفع کا لالچ آمدنی کی امید یہ خبط سمایا کہ شب برات آ رہی ہے آتشبازی کی دوکان کروں۔ لٹوؤں میں بیٹھا پیاس بھر رہا تھا ہتیلی کی ٹھپکی زور سے پڑ گئی۔ لٹو تھا بُرا پرخچے اُڑ گئے۔ دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ ساتھ ہی ایک ہاتھ بھی شہید ہوا۔ تین چار مہینے گھر میں پڑا رہا۔ ایک بیوی کی سلائی پر سارا گھر پڑا اور وہ بھی کس طرح کہ جب میاں کی خدمت سے فرصت ہوتی اور گود کی لڑکی چین لینے دیتی تو ٹانکا بھرنے بیٹھ جاتی۔ کچھ دن یوں گذر ہوا۔ پھر لڑکی کے نکلی چیچک وہ نون کا سہارا تھا وہ بھی گیا گذرا ہوا، میاں یوں گئے۔ بیوی یوں گئیں۔

دو دو تین تین وقت ہوجاتے اور اُڑکر وا نہ مُنہ میں نہ جاتا۔ برتن بھانڈا لوٹا کٹورا پتیلی رکابی جو دو چار چیزیں موجود تھیں سب خالصے لگ گئیں۔ آخر اسکے سوا کچھ بن نہ آئی کہ بڑے لڑکے کو ساتھ لیا۔ لکڑی ہاتھ میں لی اور بھیک مانگنے نکل کھڑا ہوا۔ خواہ مخواہ نہیں شادی کی خبر سنکر، بھیڑ نہیں کھانا دیکھ کر، ڈاکٹر صاحب نہیں اللہ کا بندہ جان کر۔ لڑکا باپ کو ادہر لے آیا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت عمائد شہر کی خاطر تواضع میں مصروف تھے۔ غریب نے ہاتھ جوڑکر سوال کرنا شروع کیا۔ فقیر کو دیکھ لیا پہچان لیا سمجھ گئے جان گئے اور نوکر کو حکم دیا کہ نکال دو۔

یہ کہنا غالبًا نہیں یقینًا بیجا ہوگا کہ دودہ چھٹنا پہلی تکلیف تھی جو سائرہ کو تعلقات دنیوی سے اس سفر میں پہنچی۔ اس سے پہلے بھی اکثر تکلیفیں پہنچی ہوں گی۔ وہ بلکی روئی بیسیوں دفعہ۔ بیمار ہوئی سینکڑوں مرتبہ۔ ضرورت کے وقت دو دو چار چار منٹ بعد دودہ ملا۔ بلکہ بے روئے بہت ہی کم ملا۔ یہ دوسری بحث ہے کہ وہ تبانے کے قابل یا جتانے کے لائق نہ تھی۔ حالت قابل اظہار نہونے سے اثر تکلیف معدوم نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ ٹیکا لگنے کی اذیت اس سے بھی بڑھ گئی ہو۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قابل شمار دودہ چھٹنے ہی کی تکلیف تھی جو بیان کی گئی۔

منزل دوم

سرائے طفولیت

سرائے طفولیت ایک عالیشان محل حیات آباد میں آسمان سے کھڑا باتیں کررہا تھا۔ شہر کے ہر چہار طرف چونہ گچی کی پختہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ سرا کے دروازۂ خاص پر رنگ برنگ کے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ دیواروں کی گلکاریاں محرابوں کے نقش ونگار موسم بہار کا مزہ دیتے اور رنگا رنگ کے جواہرات جڑے ہوئے جگمگ جگمگ کر رہے تھے

لوگ خوشحال و فارغ البال۔ کوئی مفلس نہ کنگال۔ بازار کشادہ و بارونق، دکاندار خلیق و منکسر المزاج۔ عجیب مقام تھا کہ ہر طرف بے فکری کے ڈنکے بج رہے تھے۔

سائرہ کی سواری تاروں کی چھاؤں میں یہاں داخل ہوئی۔ مرغان سحر درختوں پر بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ شمیم نسیم عطر کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ قافلے کی خبر کئی دن سے مشہور تھی۔ بیسیوں آدمی شہر سے باہر کھڑے اور پڑے انتظار کر رہے تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ آدمی پہ آدمی گرا پڑتا تھا۔ حسرت دیدار یہانتک کہ ہمہ تن شوق بنے ہوئے تھے۔ مسافروں کو دیکھ کر سب کی جان میں جان آگئی۔ سائرہ کو ہاتھوں ہاتھ سرائے طفولیت میں لیگئے۔ دروازے کے پاس سنگ مرمر پر یہ عبارت کندہ تھی۔

"ماں باپ! یہی وقت کام کا ہے۔ اتنی محبت نہ کرنا کہ دین و دنیا دونوں سے کھودو"

سرائے کے اندر ہر طرف وسیع پختہ کمرے بنے ہوئے تھے، بے فکری کا دورہ تھا۔ اطمینان و فارغ البالی کی حکومت تھی۔ اسیری کا کارخانہ تھا۔ بادشاہت کا زمانہ، محافظ زیادہ تر وہی تھے جو منزل اول میں۔ مگر محبت کا نمبر پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ مسافروں کی قدر و منزلت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کیا مبارک سرزمین تھی کہ رنج و غم پاس آکر بھی نہ پھٹکتا تھا۔ ناعاقبت اندیشی انواع و اقسام کی نعمتیں اُن کے دسترخوان پر چُن دیتی تھی۔ کھیل کود کے خلعت گراں بہا زیب تن خوشی کا تاج سر پر لگائے اِدھر اُدھر پھرتے تھے۔

کیا دن تھے کہ پھر نہ آئے اور کیا جگہ تھی کہ دوبارہ دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ بغض و حسد کا گزر نہ تھا۔ فکر معیشت کا پتہ نہ تھا۔ دولت و عسرت کا امتیاز نہ تھا۔ نخوت و غیبت کا نام نہ تھا۔ جو ضرورت ہوئی وہ رفع، جو خواہش ہوئی وہ پوری۔ اُنکی بھولی بھولی باتوں اور سیدھے سادے معاملوں پر آسمان انصاف سے موتی برس رہے تھے۔ فراغت و اطمینان کا باغبان خوشی و خرمی کے پھول نچھاور کر رہا تھا

محبت و پیار کے ہار گلے میں پڑے تھے۔ کامیابی کے گلدستے طاقوں میں چنے ہوئے۔ آرام و آسائش کی بیلیں دیواروں پر چڑھی ہوئی۔ غرض ہر قطعہ گلزار ارم بنا ہوا تھا۔

محافظ و خبر گیر کیسے کیسے خدمت گزار کہ حکم کی دیر اور تعمیل کو طیار ایسے نازبردار کہ ذرا سے اشارے پر جان نثار کرنے کو طیار۔ انتظام اتنا معقول کہ بڑے بڑے سرکش اور تاجدار مسافروں کے سامنے عاجز و لاچار تھے۔

اس منزل کا تمام زمانہ آزاد و بے باکانہ گزر گیا۔ ضرورت سے پہلے اور حاجت سے پیشتر ہر چیز تیار اور موجود کسی بات کا کھٹکا تھا نہ کسی قسم کا خوف، عزت کی خواہش تھی نہ دولت کا ارمان۔ نخوت کے اسباب نہ غرور کا سامان۔ جو ملا وہ کھا لیا۔ جہاں نیند آئی وہاں پڑ رہے۔ طبیعت میں شر نہ تھا، دل میں فساد نہ تھا۔ "کیا ہوگا" کا فکر نہ تھا۔ "کیا ہوگیا" یہ یاد نہ تھا۔ کوئی بات خلاف مزاج ہوئی رو دیے۔ کوئی چیز اچھی ہاتھ آگئی ہنس دیے۔ مگر طبیعتوں میں قبولیت کا مادہ موجود تھا۔ جو سنتے تھے وہ کہتے تھے جو دیکھتے تھے وہ کرتے تھے۔ نتائج سفر کا دارومدار اسی جگہ تھا۔ ذرا سی لاپروائی بد سے بدتر بنا دیتی تھی۔

یہاں محافظین کی محبت سائرہ کے حق میں سم قاتل ہوگئی۔ خود پسندی کا مرض ایسا لگا کہ آگے جاکر رستہ چلنا بھاری ہوگیا۔ مآل اندیشی کا ہوش نہ تھا متعلقین کی غفلت و لاپروائی سے جو کچھ لائی تھی سب غارت ہوگیا۔ اسباب میں دیمک لگ گئی کپڑوں کو چوہے کتر گئے۔ نو برس سے کچھ زیادہ سائرہ نے یہاں قیام کیا۔ پھر سنا کہ اور قافلہ آرہا ہے۔ مجبور سرا خالی کرنی پڑی اور قدم آگے بڑھایا۔

(۲)

جس رنگ ڈھنگ سے سائرہ کی پرورش ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں ہوش سنبھالتی گئی۔ دنیا بھر کے عیب پیدا ہوتے گئے۔ خود پسند مغرور شیخی خوری گستاخ بے ادب

بدتمیز، نالائق ناہنجار، لتری، پوہڑ زبان دراز، فتنہ پرداز، خیر سے انگنا شروع ہوتے ہی سب کچھ ہوگئی۔ کوئی نقص ایسا نہ تھا جس سے پاک ہو اور کوئی برائی ایسی نہ تھی جو موجود نہ ہو۔ بات بات میں کوسنے، دس پانچ اور کو ایک آدھ اپنے تئیں۔ ہنستے ہنستے بگڑ جاتا کبھی سچ مچ کبھی خواہ مخواہ۔ ایک منہ میں بیسیوں فضیحتیاں، ایک سانس میں سینکڑوں باتیں۔ کچھ یوں ہی سا لحاظ باپ دادا کا تھا۔ اُن بزرگوار نے داد دے دیکر وہ بھی کھویا۔ وہ کوس رہی ہے آپ ہنس رہے ہیں۔ وہ بگڑ رہی ہے آپ خوش ہو رہے ہیں۔ ماں پہلے ہی سے پاؤں کی جوتی تھی۔ رہ گئیں دادی نانی۔ ایک عاشق ایک دیوانی۔ جب چاہا گھرک دیا۔ جب چاہا ڈانٹ دیا۔ آٹھ نو برس کی لڑکی کی وہ زبان کہ محلے والے تک الامان پکارتے تھے کس کا روزہ اور کیسی نماز۔ کہاں کا پڑھنا اور کیسا لکھنا۔ صبح سے شام تک استانی جی سیپارہ لیئے لیئے پیچھے پھرتیں۔ باپ دادا کی چہیتی نانی دادی کی پیاری۔ جتنی خواری ہوتی سب بجا و درست۔ پکانے ریندھنے کو اس کا جی نہ چاہتا۔ سینے پرونے پر اس کی طبیعت نہ لگتی۔ لگتی کہاں سے۔ ضرورت نہ عادت خواہش نہ ارمان جوان ہوکر آپ ہی آجائیگا۔ لڑکی کا ہے کو شیر تھی جس کو چاہا کوس ڈالا۔ جس کو چاہا پیٹ ڈالا۔ ہمسائے کی عورتیں آتی ہوئی ڈرتی تھیں کہ پاؤں رکھا اور ٹانگ لی۔ ماما کی پیٹھ میں ایک دفعہ اس زور سے کاٹا کہ آگے کے چاروں دانت بیٹھ گئے۔ مگر کیا مجال جو اُف کرلیتی۔ لگا ہوا روزگار کھوتی۔ چڑھی ہوئی تنخواہ گنواتی۔ چور بنتی مردار بنتی۔ چڑیل بنتی۔ مکار بنتی۔ جب اُلٹے کا نام لیتی۔ ایک دن سقے کا لڑکا پانچ چھ برس کا ہوگا۔ شامت جو آئی کھیلتا ہوا ادھر آنکلا۔ ہاتھ میں سرکنڈا تھا۔ سائرہ کو پسند آگیا زبردستی چھیننے لگی لڑکے نے کیا انکار۔ ہاتھ پکڑ کر آگے گھسیٹ لیا اور وہی سرکنڈا چار پانچ ایسے لگائے کہ بلکتا ہوا بھاگ گیا۔ سقنی ذلیل تھی یا رذیل جو کچھ بھی تھی مگر بچے کی بدھیاں دیکھ کر بے قرار ہوگئی۔ ماما کے آگے کچھ نہ سوجھا۔ لڑکے کا ہاتھ پکڑے

لیے چلی آئی - پردے کی وجہ سے اندر تو نہ آسکی مگر دروازے ہی میں سے کھڑے ہو کر وہ کھری کھری سنائیں کہ اماں اور باوا - دادا اور دادی سب بیٹھے سنتے رہے آخر ڈاکٹر صاحب کو کہنا ہی پڑا - اچھا جاؤ - اب لڑکے کو نہ آنے دینا -

ڈاکٹر صاحب کا اتنا کہنا ایک مہمیز تھی جس نے سقنی کو اور بھی تیز کر دیا - کہنے لگی ڈاکٹر صاحب! تم کو اپنی لڑکی پھوٹی آنکھ کا دیدہ ہو مگر دوسروں کے بھی کوٹے کے نہیں - امیروں کے بچوں میں لال نہیں ہوتے - مزا تو جب ہے ایک ہاتھ میں دادی کی چوٹی ہو اور دوسرے میں دادا کی ڈاڑھی - سقنی یہ کہکر چلی گئی اور تمام گھر کھلکھلا کر ہنس پڑا

(۳)

لاحول ولاقوۃ الا باللہ - ڈاکٹر کہلائیں، معزز کہلائیں، امیر کہلائیں، شریف کہلائیں اور اس اولاد کمبخت کے کارن یہ باتیں سننی پڑیں - اس درجہ رسوائی اسقدر فضیحت اور کسی کے بھانویں بھی نہیں - "پھٹے منہ" بھی تو نہ کہا گیا - غارت ہو جائے ایسی اولاد جو اماں باوا کے ساتھ دادا دادی اور نانا نانی تک کو نچوائے -

اس میں شک نہیں کہ شاکرہ لاکھ عورتوں میں ایک عورت تھی جیکا پر چھاواں پڑنے سے انسانیت آجائے - اس کا بس چلتا تو ساجدہ کو کچا کھا جاتی مگر تقدیر کی خبر نہ تھی کہ پیٹ میں یہ پتھر پڑینگے - مارنا یا گھرکنا تو درکنار - اتنی مجال نہ تھی کہ سمجھا سکے - جو کچھ ہوتا چپکی بیٹھی دیکھتی - دل جلتا کلیجے پر سانپ لوٹتا - دیکھتی کہ بچی ہاتھ سے نکلی چلی جا رہی ہے - مگر زہر کے سے گھونٹ پی کر چپ رہجاتی - جانتی تھی کہ اگر آدھی بات بھی کھولنگی تو سارا گھر بلا کی طرح چمٹ جائیگا - ساس کے طعنے، میاں کی فضیحتیاں سسر کا عتاب بیٹی کے جواب - ان سب باتوں پہ آمادہ ہو جاؤں تو سمجھانے کا ارادہ کروں - شاباش شاکرہ کی ساس کو - خوب جی کھول کر پوتی کا ناس کیا - اور پھر بھی پیٹ نہ بھرا -

شاکرہ بظاہر دب گئی تو کیا وہ بیٹی کی طرف سے غافل نہ تھی۔ جب موقع پاتی اور جس وقت رُخ دیکھتی میاں کو ان بدعنوانیوں پر متوجہ کرتی۔ سلیم سعادتمند ضرور تھا مگر پھر بھی بُرا بھلا اپنا انجام کچھ نہ کچھ سوچ ہی سکتا تھا۔ ادھر بیوی نے بھرے کان۔ اُدھر ایک روز اتفاق کی بات ہونی شدنی۔ ماما ہوئی بیمار کھانے میں ہوئی دیر۔ لڑکی نے بڑھیا کی ہزاروں فضیحتیاں کر ڈالیں۔ سلیم آہٹ پا ہی چکا تھا بیٹی کی زبان دیکھکر دم بخود رہ گیا۔ بیوی سے کہنے لگا تم نے بہت ٹھیک کہا تھا یہ تو بالکل ہی بیہودہ ہو گئی۔ بغیر تمھاری مار اور میری تنبیہ کے سائرہ درست ہونے والی بندی نہیں۔ لاتوں کا بھوت باتوں سے نہیں مانتا۔ تم چاہو زبان سے کام نکلنا یہ ہونا نہیں اس کی زبان کھُلی ہے منھ، دل ہو گیا ہے شیر۔ کوسنے میں اسے باک نہیں، پیٹنے میں اسے خوف نہیں۔ آتا اسے خاک نہیں۔ جانتی یہ کچھ نہیں۔ سچ پوچھو تو یہ قصور سراسر تمھارا ہے۔ اماں کو اسکی پرواہ نہیں ابا کو اس کا خیال نہیں۔ اب رہے خالہ خالو ماموں ممانی۔ ان کی بلا سے کسی کا کیا بگڑا۔ بیٹی بگڑی تو ہماری بگڑی۔

سلیم کی یہ گفتگو اگر کہیں ماں کے کان تک پہنچ جائے یا خالہ ماموں کوئی بھی سُن لے تو مزا ہی آجائے مگر وہ سب تھے اپنے اپنے کاموں میں مصروف۔ بہو کا کمرہ تھا الگ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی۔ شاکرہ نے میاں کو باتوں باتوں میں ٹھنڈا کیا بات گئی گزری ہوئی مگر سلیم کے دل میں ادھر تو پیدا ہوا یہ خیال اُدھر سوچ ہوا انجام کا۔ بیٹی کو جو دیکھا تو دن دونی اور رات چوگنی۔ دل پھٹتا گیا طبیعت ہٹتی گئی۔ چار ہی دن میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ وہی سلیم جو دروازے میں سے سائرہ سائرہ پکارتا ہوا گھستا اور جب تک دسترخوان پر ساتھ نہ بیٹھتا حلق سے نوالہ نہ اُترتا۔ صورت سے بیزار ہو گیا۔ محبت میں ہوا فرق۔ حالت میں ہوا انقلاب۔ بیوی کے سوا سارا گھر تعجب کرتا تھا۔ دو چار روز تو کوئی کچھ نہ بولا۔ مگر ہفتہ کا پورا ہونا تھا کہ عورتوں میں

کرید نی شروع ہوگئی۔ جب دیکھو یہی چرچا اور جدھر دیکھو یہی مذکور۔ چند روز خوب
کھچڑی پکی۔ مگر تھوڑا سا اُبال آکر رہ گیا۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ سب اپنی اپنی جگہ
خاموش ہو گئے۔

(۴)

گرمی کے دنوں میں ایک روز شام کے وقت سب باہر صحن میں بیٹھے تھے۔ مالن
بغل میں ٹوکری دبائے گھر میں آئی۔ سائرہ کا جی پھول لینے کو چاہا۔ دلی ہی میں نہیں ہر
جگہ دستور ہے کہ کنواری لڑکیاں ایسی چیزوں سے کوسوں دور رہتی ہیں۔ مگر سائرہ نہ کسی
دستور کی پابند تھی نہ کسی رسم سے مجبور۔ اس کے نزدیک دنیا بھر کے قانون اس کا اپنا
ارادہ تھا۔ جو برخلاف کہے وہ بے وقوف، جو تردید کرے وہ پاگل۔ کیسا قاعدہ اور کس
کے اصول۔ مالن سے کہا دو پیسے کے پھول مجکو بھی دیتی جا۔ ماں نے لیئے پیسہ کے۔
آپ پھینکے دو۔ مالن کا کیا بگڑتا تھا۔ تین مٹھیاں بھر جھولی میں ڈالدیں۔

سائرہ کو پھول لیتے دیکھ کر شاکرہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ کچھ دیر تو اسی امید پر
چپکی بیٹھی دیکھتی رہی کہ شاید ساس اب بھی کچھ بولیں، اب بھی کچھ بولیں مگر بولنا کیسا انھوں
نے خیال بھی نہ کیا۔ سائرہ اتنی دیر میں ایک بالی بھی بھر چکی تھی۔ شاکرہ یوں تو کوئی دن کیا
گھنٹہ اور کوئی گھڑی ایسی نہ گزرتی ہوگی جو بیٹی کو دیکھ کر جلتی بھلتی نہ رہتی ہو مگر اس
وقت کچھ تو یہ حرکت معمولی سے بڑھی ہوئی۔ پھر میاں پتے پر، اُٹھی پھول چھین لیئے
اور کہنے لگی۔

چاروں طرف سے فریادیں آچکیں۔ اب تمام دنیا میں ناک کٹوا۔ ایک تو
ہی لاڈلی بگڑی ہے۔ میکے میں پھول پہنے گی۔

سائرہ وہ لڑکی جس نے آج تک تو بھی نہ سنا اگر کوئی بات خلاف مزاج ہو جائے
تو گھڑیوں گھنٹوں دنوں راتوں دادی سے دادا سے ماں سے باوا سے ناک رگڑوا لے

جب کہیں جا کر مزاج درست ہو، ماں کا اتنا کہنا وہ پہلا روز بلکہ پہلا اتفاق تھا کہ شاکرہ نے بیٹی کی شان میں اتنی بڑی گستاخی کی وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ یہ آج اماں کو کیا خبط ہوا کہ ساس پنجے جھاڑ بہو کے پیچھے پڑ گئیں۔ واقعہ کا اثر دادی کی حمایت، وہی کہاوت ہوگئی کہ کریلا اور نیم چڑھا۔ سائرہ نے سینکڑوں باتیں ماں کو سُنا ڈالیں۔ ماما لونڈی کو بھی کوئی اتنا نہ کہتا ہوگا۔ جتنا اس کمبخت نے ماں کو کہہ ڈالا وہ کہتی جاتی تھی اور دادی شہ دے دیکر تیز کرتی جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر تک تو شاکرہ ضبط کیے بیٹھی رہی مگر جب سائرہ کی زبان بڑھتی چلی گئی اور تو تڑاک پر نوبت آگئی تو آگ بگولا ہوگئی۔ ساس سے تو کچھ نہ بولی مگر آؤ دیکھا نہ تاؤ اٹھ کر ایک وہ تھپڑ بیٹی کے اس زور سے رسید کیئے کہ پانچوں انگلیوں کا نشان پڑ گیا۔ بہو کا ہاتھ لگانا تھا کہ ساس بلبلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں وہ تو خدا نے یہ خیر کی انکا قدم بڑھنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے گھر میں پاؤں رکھا۔ ورنہ خدا معلوم کیا گل کھلتا۔ شاکرہ کی ساس ساس ہوگئی تھیں تو کیا، ایسی بڑھیا بھی نہ تھیں۔ پھر کھائی پی عورت بندھی ہوئی کاٹھی۔ گٹھا ہوا بدن، ہٹی کٹی سوٹی تازی۔ اب رہیں شاکرہ۔ جوان تھی تو کیا دہان پان۔ پتلی۔ دبلی۔ چہرہ سفید پڑا ہوا۔ بدن تھر تھر کانپ رہا۔ ساس ایک ہاتھ سے دونوں ہاتھ پکڑ لیتیں تو بیوی صاحب کے چھٹانے نہ چھٹتے۔ سسر کو دیکھکر شاکرہ تو اندر کوٹھری میں جا بیٹھی مگر دادی پوتیوں نے ملکر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ کیسی کیسی فضیحتیاں کیا کیا رسوائیاں کہ سُننے والے بھی کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر واہ ری شاکرہ صد آفریں اس تحمل کو۔ ساس نے لاکھوں ہی کیڑے ڈالے مگر کیا مجال جو اُلٹ کر جواب دیا ہو۔ دو ڈھائی گھنٹہ تک سائرہ روتی پیٹتی چیختی چلاتی، بکتی جھینکتی رہی۔ شاکرہ اس وقت تو کچھ نہ بولی مگر رات کو تمام قصہ میاں کے آگے کہہ سُنایا۔ مگر کب جب سب سو گئے کہ غصہ کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا اور اچھے اوپر بات نہ آئے۔

سلیم پہلے ہی بیٹی کی نالائقی پر رو رہا تھا۔ ہر وقت یہی خیال اور ہر دم یہی ملال دن

رات اسی اُدھیڑ بن میں لگا رہتا تھا کہ کیا تدبیر کروں، کون سی کوشش کروں کس طرح اصلاح کروں۔ اماں نے اسکو غارت کر دیا۔ اس قدر شغف اس درجہ محبت۔ دخل دیتا ہوں تو میری صورت سے بیزار ہو جائیں گی۔ خیر تھوڑی دیر کے واسطے یہ بھی گوارا کر لوں تو کہوں کیا۔ یہ تو مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ میں اُن کے سامنے اس کو ہاتھ لگاؤں۔ میں اگر ایک ماروں گا تو وہ چار مار کر بھی بس نہ کرینگی۔ دوسرے میں باپ بیٹی پر کس طرح ہاتھ اٹھاؤں۔ عجیب کشمکش میں ہوں گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ جس انجام پر نظر کرتا تھا خراب اور جو نتیجہ نکالتا تھا وہ بُرا۔ نہ کوئی کارگر اصلاح سمجھ میں آتی تھی نہ کوئی سود مند تدبیر۔ جو کرنا چاہیئے وہ کر نہ سکتا تھا جو کر سکتا تھا اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ جس رخ پر نظر کرتا تھا راہ نجات مسدود اور جس تجویز پر غور کرتا تھا آخر کار بے سود۔ آج کی روئداد سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا۔ بیٹی کی حرکت، بیوی کی تنبیہ، ماں کی حمایت، باپ کی اجازت سُنکر سناٹے میں آگیا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد بولا۔

یہ قصور سائرہ کا ہے نہ اماں کا۔ سب سے زیادہ تمہارا اور تم سے کم میرا۔ اسکی اصلاح اور درستی سب تمہارے اور میرے ہاتھ میں تھی۔ تم نے کی نہیں۔ میں نے کرنی نہ چاہی پھر اب رونا بے سود اور پچھتانا بیکار۔ اگر تم اس کو اوّل ہی دن سے دبائیں اور بچپن سے ڈانٹ میں رکھتیں تو اس کی مجال تھی کہ آج تمہارا سامنا کرے۔ پانچ چھ برس کی بات ہے مگر مجکو اب تک یاد ہے اس نے تمہارے مُنہ پر تھوک دیا اور تم نے ہنسکر ٹال دیا۔ اگر اسی وقت دو تھپڑ مار دیتیں تو پھر عمر بھر ایسی گستاخی نہ کرتی۔ ابتدا میں کی لاپروائی۔ دل بڑھتا گیا پھر دا کھلتا گیا۔ طبیعت ہو گئی راسخ مزاج ہو گیا شاہی۔ دیدہ ہو گیا ہوائی۔ اب جیسا بویا ویسا کاٹو۔ جیسا کیا ویسا پاؤ۔ جیسا اٹھایا ویسا بھگتو۔ اماں ایک دفعہ بگڑتیں دو دفعہ بگڑتیں۔ آخر کہاں تک آپ ہی ہار کر چپ ہو جاتیں۔ اب تم چاہو اصلاح ہو وہ کیونکر ہو مفت کی رسوائی، خواہ مخواہ کی فضیحت، کنبے بھر میں بے عزتی، محلے بھر میں بدنامی۔ بھلا

کہیں ٹھنڈے لوہے بھی پیٹنے سے درست ہوئے ہیں۔ برابر کی لڑکی ڈانٹو تو برا، گھر کو تو برا۔ ہاتھ اٹھاؤ تو اس سے بُرا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ صبر کرو اور سمجھ لو کہ لڑکی ہاتھ سے گئی۔

شاکرہ۔ میں تو پہلے ہی جانتی ہوں سارا زمانہ میرے ہی جسم میں تھوکیگا کہ کیسی ناہموار لڑکی اٹھائی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ پیٹ سے سانپ ہو جائیگا۔ تمہیں کوئی کچھ بھی نہ کہیگا خرابی میری ہی ہے۔ اپنی اولاد کو جان بوجھکر کوئی نہیں بگڑنے دیتا۔ مگر میرا اختیار ہی کیا ہے کسی دن ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ لیتی تو یہ سب مجھ جیتی کو کھا جاتے۔ میں نے کیا منت مانی تھی۔ دیکھ لو ایک ذرا سے پھولوں کے منع کرنے پر سارے محلہ میں ڈھنڈورا پٹ گیا آخر اس کے سوا کچھ بن نہ آئی کہ اپنی کوٹھری میں آکر بیٹھ گئی جو جو اس کے منہ میں آیا وہ کہتی رہی میں سنتی رہی۔ اگر اور کچھ بولتی تو شاید گھر ہی سے نکلنا پڑتا۔

سلیم تمام رات اسی پیچ وتاب میں غرق رہا۔ بیسیوں منصوبے اور سینکڑوں تجویزیں سوچ ڈالیں مگر ایک بھی ٹھیک نہ بیٹھی۔ صبح ہوتے ہوتے ادھر کچھ غصے میں کمی ہوئی ادھر بیوی نے کرنا شروع کیا دھیما۔ سب ارادے خبط ہو گئے۔ صلاح یہ قرار پائی کہ اب چند روز تک میاں بیوی میں سے کوئی بھی بیٹی سے بات نہ کرے۔

چاہیئے تھا کہ میاں بیوی کی صلاح کا کوئی نتیجہ مترتب ہوتا کوئی اثر ظاہر ہوتا تو یہ! سائرہ کو پرواہی نہ ہوئی۔ کچھ دن تو وہ یہی سمجھتی رہی کہ میں خود ہی بات نہیں کرتی اور ایک اعتبار سے اسکی سمجھ درست بھی تھی۔ ماں نے تو رات کو تجویز کی وہ دن ہی کو ارادہ کر چکی تھی کہ جب تک ماں سے ہاتھ نہ جڑوالونگی۔ انشاءاللہ بات نہ کروں گی۔ باپ نے پندرہ پندرہ روز سے مُنہ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا نہ بولنا نہ کوئی نئی تجویز تھی نہ انوکھی صلاح۔ اس کو اس بات کا کبھی شبہ بھی نہ ہوا کہ ماں کی وجہ سے باپ بھی ناخوش ہے اور بالفرض اس کو یہ یقین بھی ہو جاتا تو کچھ ماں خوش ہوئی ہوگی کچھ باپ

نہال ہو جاتا۔ شروع شروع میں باپ کے بات نہ کرنے سے ذرا خیال پیدا ہوا تھا وہ بھی کس کو سائرہ کو نہیں اور سب کو۔ چار پانچ روز بعد وہ بھی جاتا رہا۔ شاکرہ کا بات نہ کرنا تو اتنا بھی اثر نہ رکھتا تھا جتنی اڑد پہ سفیدی۔ بلکہ جب تک ماں بیٹیوں کی صفائی ہوئی کنبہ بھر میں کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو اس کو شیر کی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو۔

(۵)

سائرہ کی عادات قبیحہ روز بروز ترقی کرتی جاتی تھیں۔ کوئی سودے والا ایسا نہ تھا جو خالی جاتا ہو۔ دروازے پر جاتا، آپ ہی پکارنا، آپ ہی چکانا، اور آپ ہی لینا۔ نہ کسی سے پوچھنا نہ کسی سے کہنا۔ جو چاہا وہ لیا۔ جو ضرورت ہوئی وہ خریدا۔ دس گیارہ برس کی لڑکی، کنکوؤں میں وہ شریک ہوتی۔ گیند بلے میں وہ شامل ہوتی۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ بھائیوں کی اجازت سے بلکہ حکومت سے، بھائیوں میں ذرا کسی نے ہوں کی گیند اٹھائی اور پڑوس میں۔ بلا لیا اور چولھے میں۔ کنکوا لیا اور جھیر جھیر۔ ڈور لی۔ اور مٹکے میں۔ بھائی رو رہے آپ ہنس رہی ہیں۔ دادی تک شکایت پہنچی تو انھوں نے کہدیا۔ اچھا روؤ نہیں اور منگوا دیں گے۔

سائرہ کے علاوہ شاکرہ کے ہاں اس وقت ماشاء اللہ دو لڑکے تین لڑکیاں اور تھیں۔ چھوٹی لڑکی تو خیر گود میں تھی مگر باقی چاروں بچے کیسے جیسے بھلے مانسوں کے ہونے چاہئیں۔ لڑکوں کو اول تو پڑھنے لکھنے ہی سے کم فرصت ہوتی تھی۔ پھر بھی اگر کسی وقت کھیل میں لگے ہوئے کیسے ہی مصروف کیوں نہ ہوں۔ ذرا ماں نے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا اور چھوڑ چھاڑ پاس آ بیٹھے۔ باپ کی شکل دیکھ کر تو درحقیقت ہوتی تھی۔ سلیم بھی سائرہ کی اُستاد سے سبق پا چکا تھا۔ کبھی اس قدر بے تکلف ہو کر لڑکوں سے بات ہی نہ کی کہ سر پہ چڑھ بیٹھیں۔ لڑکیاں، سنجھلی تو سبحان اللہ۔ گو ابھی ساتویں ہی

برس میں تھی۔ مگر آدھا قرآن شریف پڑھ چکی۔ دونوں وقت تختی لکھنا اور ماں سے اصلاح لینی۔ کم سخن مسکین۔ قانع شکر گزار۔ سچ مچ شاکرہ کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ سنجھلی تیسرا ابھر کر چوتھے میں لگی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کس پر اُٹھے۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ جس بات کو ماں نے منع کیا فوراً چھوڑ دیا۔ رہی چھوٹی وہ ابھی کیڑا ہی تھی۔

منجھلی سے بڑے اور سائرہ سے چھوٹے شاکرہ کے بڑے لڑکے کی شادی ختنہ قرار پائی۔ رسم ختنہ سال گزشتہ ہی میں ادا ہو چکی تھی مگر کچھ ایسی منحوس گھڑی کی کہ جب شادی کا نام لیا۔ کوئی نہ کوئی وجہ حارج ہو گئی۔ سال کے اندر ہی اندر تابڑ توڑ تین چار موتیں ایسی جوان ہوئیں کہ سب کے دل بیٹھ گئے۔ ایک دفعہ تو تاریخ تک مقرر ہو گئی۔ بلاوے بھی پھر گئے۔ مگر مجبور ملتوی کرنا پڑا۔ پچھلا تو اب کے بھی ایک لگ چکا تھا۔ مگر سمدھیانے کا معاملہ تھا زیادہ خیال نہ کیا۔ شادی کا نام کچھ ایسا نکل گیا تھا کہ جہاں بلاوا پہنچا، وہیں خون خشک ہوئے۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر خائف کہ خدا خیر کرے۔ ایسی بدنام شادی دیکھنا کیسا خدا سنوائے بھی نہیں، رشتے دار اور پڑوسی جان پہچان اور میل ملاپی جو کہتا تھا وہ یہی کہتا تھا شادی سے فراغت ملے تو اطمینان ہو۔

خدا خدا کر کے شادی کا دن آیا۔ عورت اور مرد ماشاء اللہ سینکڑوں ہی مہمان جمع ہوئے۔ شاکرہ کی سگی بھاوج میکے گئی ہوئی تھی۔ شادی سے آٹھ روز پہلے بیچاری کی بھتیجی چھ برس کی پلی پلائی بچی کھیلتی مالتی دو گھنٹے میں چٹ پٹ ہو گئی اس کا دل کیونکر برداشت کرتا۔ ابھی بھتیجی کا دسواں بھی نہیں ہوا۔ بھانجے کی شادی میں آ بیٹھے۔ ادھر نند ادھر بھاوج۔ وہاں بھائی یہاں میاں۔ اُدھر گرے تو کھائی ادھر گرے تو کنواں۔ عجیب کشمکش میں پڑی ہوئی تھی۔ ہر چند عذر کیئے مگر میاں کے آگے ایک پیش نہ گئی۔ بھائی کو خبر ہوئی۔ اس نے آ کر کہا، بھئی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا

اب تم کیوں اپنے گھر میں مفت کا رنج کرو۔ جاؤ چلی جاؤ۔ مجبور نند کے ہاں شریک ہوئی۔ مغرب کا وقت ہوگا کہ شاکرہ کا بھائی بیوی کا حال دریافت کرنے آیا۔ سائرہ دروازہ چوپٹ کھولے کھڑی تھی۔ بھانجی سے پوچھا "تمھاری ممانی آگئیں؟"

سائرہ۔ سارا گھر ان کی راہ دیکھ رہا ہے۔ تین آدمی جا چکے ہیں۔

کمبختی کا مارا ڈیڑھ کوس پر سسرال پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا بیوی چار گھڑی دن کی گئی ہوئی ہیں۔ پلٹ کر آیا، ماموں کی آواز سنتے ہی سائرہ پھر دروازے پر جا پہنچی لاکھ اس بیچارے نے کہا مگر وہ یہی کہے چلی گئی کہ وہ ابھی نہیں آئیں۔ ماموں کے زیادہ اصرار سے دو تین منٹ کے واسطے اندر گئی۔ ادھر ادھر پھر پھرا کر چلی آئی اور وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔ ماموں سے کہنے لگی تم جا کر اچھی طرح تحقیق کرو۔ میں نے کونہ کونہ اور چپہ چپہ ڈھونڈھ ڈالا۔ ایک ایک مہمان کو دیکھ لیا۔ یہاں آجاتیں تو چلی کہاں جاتیں۔ میں سب سے پوچھ آئی۔ کسی نے دیکھا ہو تو بتائے۔ سوئی تھوڑی ہیں جو چھپ گئیں۔

ماموں۔ اچھا تم شاکرہ کو بلا لاؤ۔

بھانجی۔ وہ اپنے کام میں لگ رہی ہیں اس وقت ہرگز بھی نہیں آئینگی کہہ رہی ہوں ممانی جان نہیں آئیں۔ اس گھر کی تو میں کہتی ہوں یہاں تو آئیں نہیں۔

ماموں۔ خیر تم اماں کو بھیجدو۔

بھانجی۔ بخار میں ہل ہلا رہی ہیں۔ دیکھ لو وہ سامنے پڑی ہائے ہائے کر رہی ہیں

ماموں۔ بخار کب چڑھا؟

بھانجی۔ ڈولی سے اترتے ہی۔

ماموں بیچارے عجیب مصیبت میں پھنسے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا بیوی کہاں غائب ہوئیں۔ بیوی کی گم شدگی نے متحیر کر ہی رکھا تھا۔ ماں کا بخار مرے کو مارے

شاہ مدار ہو گیا۔ چار ناچار پژمردہ نڈھال پھر سسرال پہنچا وہاں پہلے ہی پھیرے پر کچھ کچھ پریشانی شروع ہو گئی تھی۔ اب جاکر آواز دینا تھا کہ سب بدحواس ہو گئے صاحب خانہ سٹ پٹا کر باہر نکلے۔ دیکھیں تو بہنوئی کہتے کچھ ہیں منہ سے نکلتا کچھ ہے۔ کہنے لگے بھائی صاحب چلیئے جمیا کے پاس۔ یہی ڈولی پہنچا کر آیا ہے۔ آج کل کا کہار بھی نہیں۔ برسوں کا لگا بندھا کہار ہے۔

جمیا روٹی کھانے بیٹھا تھا۔ سنتے ہی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ گڑگڑا کر کہنے لگا سرکار! میں خود اسی مکان پر ڈولی اتار کر آیا ہوں۔ سینکڑوں ہزاروں سواریاں پہنچائی ہیں کیا میں ڈاکٹر صاحب کا گھر نہیں جانتا۔ چلیئے میں ساتھ چلتا ہوں۔ بڈھا غریب روٹی چھوڑ چھاڑ ساتھ ہو لیا۔ بدنصیب ماموں رستے بھر فکر میں ڈوبے رہے۔ یہاں پہنچے تو بیوی کھڑی ہوئی بچے کو پکار رہی تھیں۔ کہار نے ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ سالے بہنوئی دونوں کو جواب دیتے نہ بن آئی۔ اب ماموں صاحب نے بھانجی کو بلایا۔

ماموں ۔ سائرہ! تمھاری شرارت سے مجکو چار کوس کی پڑ پڑی۔ بھائی صاحب سے الگ شرمندہ ہوا۔ کہار کے سامنے جدا ذلیل ہوا۔ میری اتنی پریشانی سے تمھارے کیا ہاتھ آیا۔

بھانجی ۔ واہ بھئی واہ۔ میں نے کیا شرارت کی میرے سر کیوں ہوئے۔ میں علم غیب تھوڑی پڑھی ہوں۔ گھر میں ہوتیں تو میرا بتانے میں کیا ہرج تھا ڈولی سے اُترتے ہی نہ کسی سے ملیں نہ جلیں سیدھی پہنچیں علیمن کے ہاں۔

ماموں ۔ تم ذرا احسن کو بلا تو لاؤ۔

اب ایک اور قصہ پیش آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے پچھواڑے ایک پشیکار رہتے تھے ان کی بیوی کا نام علیمن تھا علیمن اصل میں شاکرہ کی بھاوج کی سہیلی تھی دونو میں بے انتہا محبت اور بہنا پا تھا۔ خدا معلوم کس وجہ سے شاکرہ کا بھائی پشیکار سے ملکدر ہو گیا اور ملکدر بھی

کیسا کہ صورت سے بیزار۔ بیوی کا ملاپ جلاپ قطعًا ترک کردیا۔ سائرہ نے جو علیمن کا نام لیا۔ کچھ کھٹکا ہوا کچھ جلا ہوا۔ آگ لگ گئی۔ بھاوج پر تو بس چلا نہیں بیوی کو بلاکر بھرے مہمانوں میں برا بھلا کہنا شروع کیا۔ وہ بیچاری آپ ہی چپ رہی بیٹھی تھی اس سرے سے اُس سرے تک سب بیویاں منہ جوڑ رہی تھیں میاں کو آگ بگولا دیکھکر بالکل ہی دھم ہوگئی۔ شاکرہ کی بھاوج بیچاری اتنی سیدھی کہ ساس نندوں کے پاس بیٹھے رہنے کی بیسیوں قسمیں کھانے لگی اور میاں اتنے بڑے گدھے کہ خاک یقین نہ کیا۔

شاکرہ کا بھائی واللہ اعلم کس قماش کا آدمی اور کس مزاج کا مرد تھا۔ بہن کے گھر پر سینکڑوں عورتوں میں بیوی کی عزت دو کوڑی کی کردی۔ عورتوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ دروازہ پر آموجود ہوا۔ سسرال والے تو ایسے موقعوں کی تاک ہی میں رہتے ہیں۔ شاکرہ کی ساس دوڑی دوڑی بہو کے پاس پہنچیں اور کہنے لگیں جاؤ دیکھو بھیا کے منہ سے کیا شرافت کے پھول جھڑ رہے ہیں۔ بہت تعریف کیا کرتی تھیں۔ بیوی بیچاری آٹھ آٹھ آنسو کھڑی رو رہی ہے ایسی زبان بھی کس کام کی۔ اتنا خیال نہ آیا کہ یہاں تو سینکڑوں آدمیوں میں ذلیل نہ کروں گھر ہی پر جاکر جو کچھ کہنا ہے کہہ لونگا۔ ایسی ہی بیویاں تو خوش رہتی ہیں۔

شاکرہ مسکین چھوٹی بچی کی پہنچیاں خدا جانے کہاں رکھکر بھول گئی تھی۔ تمام کوٹھری چھان ڈالی اور دالان دیکھ مارا مگر نہ ملیں وہ اس رنج میں گم سم بنی بیٹھی تھی کہ ساس یہ خوشخبری لیکر پہنچیں۔ آکر دیکھتی ہے تو درحقیقت بھائی نے ایک آفت مچا رکھی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا ساری آگ سائرہ کی لگائی ہوئی ہے اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ غصہ افسوس ندامت رنج سب دامنگیر ہوگئے۔ بیٹی کو تو کچھ نہ کہہ سکی۔ بھائی کے سر ہوگئی۔ قصہ مختصر بات نے طول پکڑا۔ میاں بیوی کی تو ہو ہی رہی تھی۔ بھائی بہن میں بھی ہونے لگی۔ جمالو کی چنگاری یہانتک بڑھی کہ تمام بھس جلکر خاک ہوگیا۔ بھائی بہنوں کی ختم نہ ہوئی تھی کہ اِدھر ساس بہوؤں میں شروع ہوئی۔ اُدھر ماں بیٹیوں میں ہو پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاکرہ کا بھائی

آدھی رات کو ڈولی لا بیوی کو سوار کر گھر لے گیا۔ بیوی کے جاتے ہی شاکرہ کی ماں بھی چلی گئی
وادا ہی شادی ختم ہوتے ہوتے بھی تین چار بھینٹیں لے ہی لیں۔ خیر مرا تو کوئی نہیں مگر
کہاں کہاں لڑائیاں پڑ گئیں۔ اور واہ وا بی سائرہ۔ لاڈ ہو تو اتنا اور پیار ہو تو ایسا
سارے گھر میں ٹھٹے مارتی پھری اور کسی نے آدھی بات بھی نہ کہی۔

تیسری منزل

چمنستان شباب

چمنستان شباب کی سرحد میں داخل ہوتے ہی طبیعت خود بخود شگفتہ ہونے لگی۔
ہوا کے فرحت بخش جھونکے دل و دماغ کو تازہ کرنے لگے۔ پھولوں کی تیز اور مست خوشبو سے
کوسوں تک جنگل مہک رہا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے دل میں امنگ اور خواہشیں پیدا
ہوتی گئیں۔ پاس پہنچکر دیکھا ایک خوشنما باغ دور تک پھیلا گیا ہے۔ دروازے لگے ہوئے ہیں۔
چار دیواری کھنچی ہوئی ہے مگر اندر جانے کے واسطے اجازت عام ہے کسی قسم کی روک ٹوک
نہیں۔ آگے قدم بڑھایا۔ تمام عالم سرسبز و شاداب نظر آیا۔ ہر قطعہ چمن بہشت بریں بنا ہوا ہے
رنگ برنگ کے پھول کھل رہے ہیں۔ خوشبوؤں نے ہوا اور ہوا نے باغ کو لٹکا رکھا ہے۔ گلاب
کے تختے پھیلے ہوئے ہیں۔ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے بہہ رہے ہیں۔ بار آور درخت جھنڈ
کے جھنڈ جھوم کر زمین کو چوم رہے ہیں۔ طائران خوش الحان ڈالیوں پر بیٹھے چہکار رہے ہیں
ہرے بھرے درخت کھڑے لہلہا رہے ہیں۔ پرند کلیلیں کر رہے ہیں۔ گھلے قطار در قطار چلے
گئے ہیں، کیلے کی چھاؤں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ سنگ مرمر کے حوض بنے ہوئے ہیں
رنگ برنگ کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ وسط چمن میں ایک بارہ دری ہے۔ پتا پٹی کے
پردے پڑے ہوئے۔ مخملی روئی دار شالی کا فرش بچھا ہوا۔ کنیزان سر سے
پاؤں تک جواہرات میں ڈوبی زرق برق لباس سے آراستہ و پیراستہ

ادھر اُدھر پھر رہی ہیں۔

سرائے طفولیت کی طرف سے مسافر بھاگے چلے آرہے تھے اور چمنستان شباب کے اسباب دیکھ کر اس طرح دلدادہ ہوتے تھے کہ گویا اب تمام عمر یہ فرحت و شگفتگی اُن کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ اس سرزمین کی ہر چیز میں کچھ ایسا مقناطیسی اثر تھا کہ دل خود بخود کھنچا چلا جاتا تھا۔ دو چار صورتیں ایسی بھی دکھائی دیں جنہوں نے اس بات کا پتہ لگا لیا کہ یہ دلفریب جلوے عارضی و فانی ہیں۔

غور سے دیکھا تو درحقیقت تمام چمنستان ایک جادو کا کارخانہ تھا۔ گلاب کے پودے کانٹوں سے پٹے پڑے تھے چنبیلی کے پھولوں میں شہد کی مکھیاں بھی چھپی تھیں۔ بیلوں میں سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ چشموں کا پانی دیکھنے میں صاف شفاف مگر پینے میں زہر ہلاہل چور قزاق گرہ کٹ اٹھائی گیرے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے اور اپنے فن کے ایسے کامل و ہشیار کہ کیسا ہی تجربہ کار آدمی کیوں نہ ہو بات کی اور گرفتار ہوا۔ نشے کا سا عالم تھا جو نظر آیا وہ بیخود و سرشار۔ دیواروں پر خوبصورت تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ مگر ہر تصویر ایک دام تزویر تھا۔ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھا اور گلے کا ہار ہوئی۔ جو چیز تھی دیکھنے میں کچھ اور برتنے میں کچھ۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں تک میں سمیت ملی ہوئی تھی۔ ذرا ہوا لگی اور مسافر کچھ کا کچھ ہوا۔ باغ کے اس طرف ایک بیابان تھا۔ ڈھاک کا جنگل کوسوں دور چلا گیا تھا۔ جانوران صحرائی ہر طرف بسے ہوئے تھے۔ درندوں کی خوفناک آواز سے رات کو تمام جنگل گونج جاتا تھا۔ بھیڑیے لمبا دو تات اندر گھس آتے تھے شیروں کے منہ کو خون لگا ہوا تھا۔ چیتے ہر وقت تاک لگائے رہتے تھے۔ ہاتھیوں کا غول بارہا ادھر سے نکل جاتا تھا۔

چمنستان شباب کے پانی میں خاص طور پر یہ تاثیر تھی کہ مسافر اپنی اصلیت بھول جاتا تھا۔ حرص و تمنا دامنگیر ہو جاتی تھیں۔ خواہش و ارمان کا ہجوم ہو جاتا تھا۔ مزاج میں

نخوت آجاتی تھی۔ آنکھوں پر پردۂ غفلت پڑ جاتے تھے۔ حسن و عشق کی تصویریں دلوں کو مسخر
کر لیتی تھیں۔ اتلاف حقوق ظلم و تعدی عادات ہو جاتے تھے۔ خوف خدا غارت ہو جاتا تھا
خود غرضی ایک مرض متعدی تھا کہ انسان و حیوان وحوش و طیور سب میں پھیلا ہوا تھا
طمع دنیا کا جال ایک طرف بچھا ہوا تھا۔ علائق کی زنجیریں دوسری طرف پڑی ہوئی
تھیں۔ غرض از ابتدا تا انتہا چمنستان اور بارہ دری ایک سانچا تھا کہ مسافر کو
ڈھالا اور دوسری طرف پھینک دیا۔ گرفتاران بلا ہاتھ میں ہتکڑیاں پاؤں میں بیڑیاں
جکڑے ہوئے اور کسے ہوئے دھکے کھا کھا کر باہر نکلتے تھے۔ زمانہ گذشتہ کی یادگار
دو چار کلنک کے ٹیکے۔ دس پانچ بدنامیوں کے تمغے باقی رہ جاتے تھے گناہوں کی
بھاری گٹھری سر پر ہوتی تھی۔ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے مگر جو قدم اٹھ جاتا تھا۔ پھر
پلٹ نہیں سکتا تھا۔

یہ لوگ اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑیاں مارتے تھے ورنہ خود چمنستان
شباب کے واقعات اگر چشم بصیرت سے دیکھتے اور تامل صحیح کرتے تو اصلاح کو کافی تھے۔
بیمار پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ مصیبت زدہ چیخ چلا رہے تھے۔ قبرستان قبروں سے
اور مرگھٹ کھوپریوں سے پٹ رہے تھے۔ کوئی ماں کے غم میں سوگوار تھا۔ کوئی باپ کے
رنج میں بے قرار کسی کی بہن چھٹ رہی تھی۔ کسی کا بھائی جدا ہو رہا تھا۔ ایک جوان بیٹی کو
کو رو رہا تھا۔ دوسرا بیٹے پر جان کھو رہا تھا کہیں پیدائش کہیں چھٹی کہیں برات کہیں دن کہیں رات
چمنستان شباب سے ملا ہی ہوا ایک شہر معیشت آباد بسا ہوا تھا۔ زمین سے لیکر
آسمان تک ہر چیز رنج و فکر میں ڈوبی ہوئی۔ مرد مغموم، عورتیں متفکر غرض جو تھا بڈھا ہو
یا جوان حیران و پریشان عظیم الشان محل ویران پڑے تھے۔ سنگین و پختہ عمارتیں سنسان
کھڑی تھیں۔ آبادی بیشمار تھی مگر ہر ایک اپنے دکھ درد میں گرفتار تھا۔ بہت سے ایسے
بھی تھے جن کو خدا نے ہر اعتبار سے مالا مال کر رکھا تھا۔ عنایت ایزدی شامل

حال تھی۔ صاحب اولاد تھے، فارغ البال تھے۔ مگر غور سے دیکھا تو رنج و آفات میں بال بال جکڑے ہوئے۔ غفلت و مساہلت کی انگلیاں اُن کے کانوں میں ٹھسی ہوئی اور طمع و حرص کے پردے آنکھوں پر پڑے ہوئے۔

معیشت آباد میں ایک محلہ سسرال پور کے نام سے موسوم تھا۔ اس میں زیادہ آس پاس کی لڑکیاں آباد تھیں۔ مگر ان اللہ کی بندیوں کے واسطے یہ محلہ ایک دوسری دنیا تھی۔ نئے لوگوں سے سابقہ، اجنبی آدمیوں سے واسطہ۔ تعجب انگیز بات یہ تھی کہ جو ایک آدھ جان پہچان بھی تھا اس نے اجنبیوں کو مات کیا تھا۔ یہ محلہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک مظلوموں کی گلی کہلاتی تھی۔ دوسرا زبان درازوں کا کوچہ مشہور تھا۔ مظلوموں کی گلی میں سب کی سب بیچاریاں دکھیاریاں آفت کی ماریاں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں اکثر ایسی تھیں جو ناز و نعم سے پلیں لاڈ پیار سے بڑھیں چاؤ ارمان سے بیاہی گئیں مگر تقدیر کی خوبی نے دنیا بھر کی بہار میکے ہی میں ختم کر دی۔ ایسے شریر النفس آدمیوں کے پھندے میں جا کر پھنسیں کہ زندگی دوبھر ہو گئی۔ رحم کی آنکھیں اُنکی حالت پر آنسو بہاتی تھیں۔ اور ہمدردی کا کلیجہ اُن کی داستان مصیبت پر پاش پاش ہوتا تھا، ساس نندوں نے اُنکے کلیجے چھلنی کر ڈالے نا امیدی نے اُنکی عمروں کا خاتمہ کر دیا۔ شریفوں کی بیٹیاں تھیں اطاعت و فرمانبرداری کا جُو ہر حچک رہا تھا۔ صبر و شکر کی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اُن کے کمبخت خاوند ظلم کا پیشہ کرتے تھے۔ قزاقی کی دکان کھولے تھے۔ دل آزاری اُن کا طرز عمل تھا۔ لوٹ مار اُن کا اصول۔ پرایا مال تاکنا اور آنکھ بچتے ہی لے بھاگنا ہنر سمجھتے تھے۔ العظمۃ للہ کیسے ظالم بے غیرت اور ناشکرے لوگ تھے گھر کی نعمتیں چھوڑ کر بازاروں میں بھیک مانگتے اور فقیروں کے بھیس میں چوریاں کرتے، اے اللہ وہ کس قسم کے خاوند تھے کہ ان مظلوم بے زبانوں کو الٹی چھری سے حلال کرتے تھے اور کس قماش کی فتنہ پرداز ساس نندیں تھیں کہ دُم کسا کر تماشہ دیکھتی تھیں

ماں باپوں کی بدنصیب پیاریاں شامت کی ماریاں دکھڑا کرتی تھیں اور پیٹ پالتی تھیں۔ اس میں بھی کسر لگی ہوئی تھی۔ ایک بدنصیب ایسی دیکھی کہ ہزاروں کا سامان لیکر آئی اور اب پیٹ بھرنے کو ٹکڑا نہ تھا۔ تن ڈھکنے کو چیتھڑا۔ دن بھر سر گری سے محنت کرتی اور شام کو پیٹ کے دوزخ کو ٹھنڈا۔

وہ دوسرا فرقہ بالکل ان کے برعکس تھا۔ زندگی کے غرور نے اُن کے مزاج آسمان پر چڑھا دیئے تھے۔ شرم وحیا کا پانی اُن کی آنکھوں سے ڈھل گیا تھا۔ غیرت وحمیت کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ خاندان کی لاج اُن کے پاس آتے ہوئے ڈرتی تھی تمیز و سلیقہ اُن کی صورت سے خوف کھاتا تھا۔

اُن عقل کی دشمنوں نے اپنے کرتوتوں سے اپنی اور اپنے ساتھ والوں کی زندگی عذاب کر رکھی تھی۔

(۶)

تیرھویں برس تک سائرہ کی حالت بدستور رہی۔ دادی۔ دادا۔ ماموں خالہ ایک سے ایک افضل اور ایک سے ایک اعلیٰ۔ کوئی روکنے والا نہ ٹوکنے والا۔ کہنے والا نہ سننے والا۔ دن عید رات شب برات۔ مگر چودھویں میں قدم رکھنا تھا کہ ہر طرف سے تکالیف کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ اُفتاد پڑی بُری۔ اصلاح کچھ ہوئی نہیں۔ اس پر جس قدر مصیبتیں آئیں سب درست تھیں اسکے گن اسی قابل اور اسکے کوتک اسی لائق۔

اس میں مطلق کلام نہیں کہ اس کی "عادات کالطبیعۃ" ہوگئی تھیں۔ آرام طلبی و خود پسندی کے عیوب اس کے مزاج میں اس قدر گھس گئے تھے کہ اُن کا نکلنا اب بہت مشکل تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ اس کا قصور کم تھا اور دادا دادی کا زیادہ۔ اس پر ماں باپ کی غفلت ایک تازیانہ تھی۔ ان کو اگر فکر بھی ہوا تو نام و نمود کا نہ کہ مواخذۂ عاقبت کا اُنھوں نے اگر اصلاح چاہی تو اپنی تکالیفوں سے اکتا کر اور بدنامی کے خیال سے نہ یہ کہ اس کی

آئندہ زندگی کی تباہی و بربادی کے خوف سے اور چاہی بھی تو اس طرح کہ چاروں ہاتھ پاؤں پھیلا کر بیری کے نیچے لیٹ گئے منہ کھول دیا اور بیر کو تاکنا شروع کیا۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہ کسی سے مانگنے کی حاجت پکا پکایا خود بخود منہ میں آ پڑے۔

نعوذ باللہ من شرور انفسنا چودہ برس کی لڑکی۔ لڑکی کیوں عورت۔ شادی ہو جاتی تو دو ایک بچے ہو جاتے جس نے آج تک خدا کو سجدہ نہ کیا۔ کرتی کہاں سے۔ کسی کو بھی نماز پڑھتے دیکھتی تو شوق پیدا ہوتا۔ گھر میں آدمی گنتی میں تو ماشاءاللہ بیس پچیس مگر ایک سے ایک بڑھا اور چڑھا۔ دادا صبح اُٹھے منہ دھویا ناشتہ کیا اور چل بھئی ہسپتال۔ دادی آٹھ بجے کے قریب تو سو کر اٹھیں کبھی منہ دھویا کبھی یوں ہی زردہ کھایا اور باورچی خانہ میں جا گھسیں۔ بادا ابھی سورج نہیں نکلا کہ چھت پر پہنچ کبوتر کھول دیے اور محلے کو سر پر اُٹھا لیا۔ ماں کو ارتے کی تو ایسی نماز ن کہ آندھی جائے مینہ جائے اور اس کی نماز نہ جائے مگر "الصحبۃ مؤثر" سسرال میں آ کر دیکھا تو رنگ ہی اور چھایا ہوا تھا۔ گھونگھٹ تک تو شرم کے مارے نہ پڑھ سکی۔ عادت تو جب ہی سے پڑتی چلی مگر خدا کی عظمت اور نماز کی وقعت دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ تو نہ کر سکی کہ ایک ہی دفعہ رسّی تڑا منحرف ہو جاتی۔ کبھی پوری پڑھ لی۔ کبھی فرضوں پر ٹرخائی۔ کبھی یوں ہی گنوائی۔ غرض پابندی سے ہوئی گنڈے دار، ایک سال اس طرح گزرا۔ زچہ خانے میں مہینے سوا مہینے قطعی نہ پڑھ سکی۔ فارغ ہونا تھا کہ وہ گنڈے دار بھی گئی گذری ہوئی۔ پھر بھی اتنا تھا کہ جہاں کوئی تکلیف پہنچی، ذرا کوئی بچہ بیمار ہوا، نہائی دھوئی اور نماز کو کھڑی ہو گئی۔ باقی گھر والے تکلیف تو تکلیف مصیبت میں بھی خدا کو یاد نہ کرتے تھے۔

چودھویں سالگرہ کا ہونا تھا کہ جوانی ایک آفت ناگہانی ساتھ لیکر سر پر آ سوار ہوئی۔ سب سے پہلے دادا کو موت آئی۔ پنشن کی تجویز ہو رہی تھی۔ گورنمنٹ سے منظوری

بھی آگئی تھی۔ صرف انسپکٹر جنرل کی اجازت کا انتظار تھا۔ شام کو خاصی اچھی طرح تحصیل دار کے ہاں چھٹی میں گئے۔ کھانا کھایا اپنے پاؤں سے گھر آئے۔ بارہ بجے استفراغ ہوا۔ دست شروع ہوئے چار بجتے بجتے تو تشنج، امتلاء اسہال، ضعف بیہوشی سب چیزیں اشتداد پہ تھیں۔ عجیب قسم کی موت ہوئی۔ بارہ بجے رات کے بیمار ہوئے چار بجے سکرات شروع ہوئی اذان کے وقت رخصت ہوئے۔ کچھ کہہ سکے نہ بتا سکے۔ لینا لوانا کچھ بھی نصیب نہ ہوا۔ گورنمنٹ حقیقی نے موت کا حکم دیکر زندگی ہی کو پنشن دیدی۔ بات تک کرنے کی مہلت نہ ملی کیسی سختی سے جان نکلی ہے کہ سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں حالت نزع میں کیسا سر دے دے ٹپکا ہے کہ معاذاللہ۔

ڈاکٹر صاحب کی آنکھ کا بند ہونا تھا کہ سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ ڈھائی سو روپے تنخواہ پچاس ساٹھ کا کرایہ زمانہ موافق تشخیص کی دھاک، ہاتھ میں شفا، آمدنی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ سب مال جلا کر پانچ چھ سو کا اوسط پڑتا تھا۔ بے تعداد آمدنی، بے غل و غش خرچ، ایک کوڑی نہ بچی۔ انجام پر نظر نہ عاقبت کا خیال۔ میاں بیوی بیٹے بیٹیاں ایک سرے سے سب بے ڈھنگے اور پھوہڑ۔ کنبے کا کنبہ گمراہ اور آوے کا آوا بیوقوف تنخواہ گئی، بالائی آمدنی بند ہوئی، کورے پچپن رہ گئے۔ وہ بھی پیدا کئے ہوئے نہیں موروثی۔ جن ہاتھوں سے پانچ پانچ چھ چھ سو روپے مہینے میں صرف ہوتے تھے اب اُن میں کرائے کی ایک محدود رقم رہ گئی۔ وہ بھی کس طرح۔ آج نیم والا مکان خالی پڑا ہے کل بوڑی والا دو مہینے کا کرایہ مار کر چل دیا پرسوں حکیم جی مدارا تقاضا کر رہے ہیں تو یہ لے روز تقاضائی سر ہو رہا ہے کہ دونوں کواڑوں کی چولیں اتری پڑی ہیں کہہ دیا کہ ڈلوا دیجیے۔ غرض مشکل سے پچپن کے چالیس پلے پڑتے تھے اس میں بھی اکثر روپیہ منشی جی کا بیوڑنے انتالیس ہی رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں صبح سے شام تک روز کچھ نہ کچھ آتا ہی رہتا تھا۔ الغاروں گھی منوں کھانڈ

سیروں مٹھائی۔ یہ وہ سب قطعًا موقوف ہوگیا۔ لوگ اپنی غرض کو بھیجتے تھے ڈاکٹر صاحب کا قرضہ تو تھا ہی نہیں کہ مرے پیچھے بھی قسط چلی آتی۔ رشتہ نہیں ناتا نہیں غرض تھی وہ رہی نہیں، بھیجے تو کون اور آئے تو کیوں۔ گھر میں آدمی ماشاءاللہ درجنوں۔ ڈاکٹر صاحب کی سالیاں ایک دو بھی نہیں اکٹھی چھ اور سب مفلس بہن کا مہمان بلانا اونگتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوگیا۔ باری باری سے یہیں ڈھئی دیدی اور رہنے لگیں۔ بیویوں نے تو خیر یہی بے غیرتی کی کہ میاں نکھٹو تھے بہن کی ٹہل کی اور پیٹ پالا مگر میاں چھ کے چھ ماشاءاللہ اتنے بڑے بے غیرت کہ مہینہ بیس روز تو یوں ہی آتے جاتے رہے اور پھر نمبروار ایک ایک کرکے سب ساڑھو کی روٹیوں پہ آپڑے ڈاکٹر صاحب کے حقیقی بھائی چار اور سب بیاہے ہوئے۔ کوئی رنڈوا نہ کوارا۔ آٹھ آٹھ میاں کے بارہ بیوی کے اپنے بچے الگ رہے۔ ایک لڑکا پانچ لڑکیاں۔ تین تو خیر اپنے اپنے گھر کی تھیں ایک بیوہ اور ایک کواری۔ دو کوڑی کے قریب آدمی تھے مکان وسیع گنجائش معقول آمدنی بے انتہا حوصلہ فراخ آپس کا معاملہ۔ بیوی کی بہنیں میاں کے بھائی بیوی کا گھر میاں کی کمائی۔ بیوی بول سکتی تھی نہ میاں دم مار سکتے تھے۔ آج کے دن تک یوں ہی نبھے چلی گئی۔ اب جو یہ مصیبت آکر پڑی اور تعلقات کی آزمائش کا وقت آیا تو حقیقت کھلی کہ سب کھانے اور غرانے والے تھے۔ بنی کے سب تھے بگڑی کا ایک نہ نکلا۔ ڈاکٹر صاحب کا مرنا تھا کہ ادھر دیور جیٹھ ادھر چھوٹے بڑے بہنوئی سب نے مل کر بیوی بیچاری کو باڑھ پہ رکھ لیا۔ پھولوں میں بریانی ہو۔ چالیسویں میں متنجن۔ سلیم ماشاءاللہ اتنے سیدھے آدمی کہ جو جس نے کہا ہاں میں ہاں ملادی۔ ڈھائی تین ہزار روپے کا زیور اسی میں گیا گزرا ہوا چار پانچ مہینے یوں بھی کٹے۔ اب مہینے کے دن تیس اور روپے وہی اڑتیس۔ آٹا دونوں وقتوں میں چاہیئے بیس سیر۔ اڑتیس روپے کے دن کے۔ ایک ایک

کر کے سب رخصت ہوئے۔ ان طفیلیوں پر یہاں سے جا کر جو کچھ بیتی ہم کو اس سے بحث نہیں۔

(۷)

ڈاکٹر صاحب کی موت سے گھر کی بالکل خاک اُڑ گئی۔ یوں تو تھوڑا بہت انقلاب ہر شخص کی حالت میں ہوا مگر بڑے زمانہ کا گرم و سرد دیکھے ہوئے تھے پیتہ مارنا پڑا۔ رونا کمبخت سائرہ کا ہے عادت بگڑی ہوئی چسکے پڑے ہوئے دل بڑھا ہوا زبان چھوٹی ہوئی صبح سے شام تک دو ڈھائی آنے اسکے چٹورپن کو چاہئیں۔ اب دو ڈھائی آنے میں ایک وقت کی ہنڈیا سیدھی ہو۔ سب سے پہلی تکلیف جو سائرہ کو دادا کے مرنے سے پہنچی وہ سودے کی کمی تھی جو کم ہوتے ہوتے قریب قریب بند ہو گیا۔ دادی کا پیٹھ پیچھا ہے حتی المقدور اس کی ناز برداری میں کمی نہیں کی مگر "عصمت بی بی از بے چادری" پیسہ تو پیسہ کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جسکو بیچ کر اس کا بھرنا بھر دیں میاں کے مرنے سے خاک میں مل ہی گئی تھیں پوتی نے اور بھی دم ناک میں کر دیا۔ تین چار ہی مہینے میں زندگی دوبھر کر دی۔ ذرا پیسہ ملنے میں دیر ہوئی اور شیشہ کا گلاس چھن سے دو چینی کی طشتری تڑ سے زمین۔ رکابی جھکراتی ہوئی یہ آئی۔ لوٹا لڑکتا ہوا وہ گیا۔ پتیلی خالی ہو یا بھری چولھے سے موری پر۔ پیالی تانبے کی ہو یا چینی کی دسترخوان سے چوکھٹ پر۔ مگر اب بھی اتنی مجال کسی کی نہ تھی کہ ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے۔ شاکرہ نے ایک دفعہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بیجا کہا مگر یہ ضرور ہے کہ جو کچھ کہا زیادہ کہا۔ بساطی چیزیں بیچتا ہوا دروازہ پر آیا۔ سائرہ نے موزوں کی ایک جوڑی پسند کی۔ اندر کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ وہیں کھڑے کھڑے پسند بھی کی چکالی۔ لے بھی لی اور پہن۔ دادی سے آ کر کہا تین آنے بھیجدو۔ امر واقعی یہ ہے کہ سائرہ کی خواہشوں کے پورا نہ ہونے یا اس کے احکام کی تعمیل نہ ہو سکنے سے جس قدر رنج سائرہ کو ہوتا تھا اس سے بدرجہا زیادہ اُن بیچاری کو۔ بعض دفعہ

عزیز نے یہانتک کیا ہے کہ تمام تمام دن خالی زردہ کھایا اور اس کو سودا منگوا کر دیا۔ اس فقیری میں بھی کہ اپنا گذارہ جنا کفاف سے کرتیں اس کے واسطے پیسہ دو پیسہ لگائے رکھتیں خبر نہیں کس وقت بگڑ بیٹھے اور کس بات پر اڑ جائے۔ شروع مہینہ ہوتا یا پیسہ ہاتھ میں ہوتا تو سائرہ کی دادی انکار کرنے والی بندی نہ تھیں۔ ان سے تو یہانتک امید تھی کہ چاہے روٹی گھر بھر کو ایک ایک کم دیتیں، مگر کتر بیونت کر کے اس کا بوت پورا کرتیں۔ آخر مہینہ تھا اور ان کے پاس کل پانچ پیسے بٹوے میں پڑے تھے۔ سات پیسوں کے واسطے ایک ایک کے آگے بھیک مانگتی پھریں اور نہ جڑے۔ لاکھ گھر بگڑ چکا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا کہ شاکرہ کے پاس سات پیسے بھی نہ ہوں لیکن سائرہ کے نام کے تو وہ مر کر بھی دینے والی عورت نہ تھی۔ بساطی سے کہا پرسوں لیجائیو۔ اس نے بھی نہ مانا۔ پاؤں میں پہنی ہوئی موزوں کی جوڑی کا پھیرنا بساطی کے واسطے تو دقت ہی تھی۔ مگر سائرہ کے واسطے آفت۔ سائرہ کو ہوئی نا امیدی بساطی کو ہوئی دیر۔ اندر لڑکی برخوردار باہر دوکاندار۔ دونوں نے چنچنا شروع کیا۔ موزے تو خیر جوں توں واپس ہوئے مگر سائرہ کے غصہ کا کیا ٹھکانا تھا۔ چھوٹے سے بڑے تک ایک ایک کا نام لیکر سب کو کوسنا اور اپنے تئیں پیٹنا شروع کیا۔ ماں باپ ہی کم کرتی تھی۔ دادی نے منت کی خوشامد کی۔ ماما نے سمجھایا ہاتھ جوڑے مگر جتنی خوشامد ہوتی گئی اتنی ہی زبان بڑھتی گئی۔ اتفاق سے چھوٹا بھائی یہ کہتا ہوا پاس سے گذرا "ہم تو مدرسے یوں ہی چلے جائیں۔ یہ بیوی صاحب گھر میں موزے پہنیں گی"۔ لڑکے کا اتنا کہنا تھا کہ سائرہ نے اور تو کچھ نظر نہ آیا کٹورا پاس پڑا ہوا تھا چھوٹتے ہی منہ پر کھینچ مارا۔ خیریت یہ ہوئی کہ اچٹتا ہوا لگا۔ نہیں تو خدا جانے آنکھ پھوٹتی یا سر۔ شاکرہ سامنے بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ سائرہ کی یہ حرکت دیکھ کر غصہ تو بہت آیا اور اُٹھی بھی اور اسی ارادے سے تھی مگر لڑکے کے ہنس دینے سے بیٹھ گئی مگر اتنا کہہ ہی دیا۔

غارت ہوجائے الٰہی تو اور نہ رہے دنیا پر، ٹوٹیں تیرے ہاتھ نامراد۔ جن ہاتھوں سے تو بھائیوں کو مارے۔ دیکھیے یہ تیری ہر وقت کی کل کل کیا کرتی ہے۔ دادا کو کھا چکی اب بھی پیٹ نہیں بھرا۔ خبردار جو میرے بچوں کو ہاتھ لگایا۔ انہیں کو جوتیاں مار جنھوں نے سر پر چڑھایا ہے۔

جوتیوں کا نام سنکر تو ساس آپے سے باہر ہوگئیں۔ کہنے لگیں بیٹی جم جم ایسی بہوئیں آئیں جو ساسوں کو جوتیاں لگائیں۔ بیٹی سے کیوں پٹواتی ہو۔ تم خود ہی لیکر آؤ میں نے قصور ہی ایسا کیا ہے۔ بیٹیا جنا ہے کچھ تو اس کی سزا بھگتوں۔

شاکرہ۔ سائرہ تو تھی ہی نہیں جو جا بیجا ایک کی چار اور دو کی دس سُنا کر بھی پیچھا نہ چھوڑتی۔ قصور پر نادم ہوگئی اور مصالحت کی باتیں کرنے لگی۔ ساس بھی آخر دشمن نہ تھیں۔ بہو کو عاجزی کرتے دیکھ چپ ہوگئیں۔

(۸)

ڈاکٹر صاحب کو مرے ہوئے سال پورا ہونے آیا وہ زمانہ خواب خیال اور وہ باتیں کہانیاں ہوگئیں۔ بیوی کو ڈاکٹر صاحب کے بعد پھر کوئی خوشی دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ہر وقت متفکر و پریشان۔ ناداری کی تکلیف بیچاری کے واسطے سب سے بڑی آفت تھی۔ خدا کی شان ہے تمام عمر تو اس عیش و آرام میں بسر ہوئی۔ سینکڑوں کے ساتھ سلوک کیے کنبہ تو کنبہ محلے بھر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جو ان کا شرمندۂ احسان نہ ہو۔ کوئی مرجائے کسی کے ہاں شادی ہو یہ ممکن نہیں کہ وہ دس پانچ روپے سے سلوک نہ کرتی ہوں پھر یہ بھی نہیں کہ دنیا اور احسان جتانا۔ خود جانا چپکے سے دینا اور چلا آنا۔ خرچ کی ضرورت روپے کی حاجت رفع کرنے والا تو خدا ہے مگر کبھی کسی کی اٹکی نہ رہی۔ جو آیا اور جو مانگا ہمیشہ دیا۔ اب تک یہ کیفیت تھی کہ لوگ قرض کے نام سے لیجاتے تھے اور پھر آکر شکل بھی نہ دکھاتے تھے۔ خود تنگ رہتی تھی۔ گھر میں تکلیف ہوتی تھی، بیٹے بگڑتے تھے۔

ہوئیں چھیڑتی تھیں۔ مگر یہ کبھی نہ بتایا کہ کس پر کتنا لینا ہے۔ میاں کے بعد دس گیارہ مہینے بہت ہی مصیبت سے کاٹے۔ اکثر روتی تھیں اور تنگ آکر کہتی تھیں کہ خدا مجکو اٹھالے اب میں دنیا میں رہنا نہیں چاہتی۔ دل میاں کے مرتے ہی بیٹھ گیا تھا۔ نو دس مہینے تک بخار آیا کھانسی ہو گئی۔ دو تین مہینے تک سخت پریشان رہیں۔ محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ عصر کے وقت جان بحق تسلیم کی۔

نند بھاوجوں کے دلوں میں پہلے ہی سے غبار تھے۔ بڑی بی کی زندگی جھاڑو کا بندھن تھی کہ سب ایک جگہ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ اُن کے مرتے ہی دونوں کے دونوں آزاد ہو گئیں۔ نند تھی چھوٹی مگر سدا کی کھوٹی۔ بھر منہ کوستی تھی۔ اماں مرجائیں تو اس آفت سے چھٹکارا ہو۔ اُن کا مرنا تھا کہ دونوں کے زخم پھوٹ نکلے۔ بیاہی ہوئی نند دس روپے کا کرایہ الگ کر سسرال چلی گئی۔ رہی کنواری اس کو اور ٹھکانا ہی کونسا تھا بھاوج ہی کے ساتھ رہی۔

(۹)

دادا دادی مر گئے، وہ فارغ البالی گئی گذری ہوئی۔ ہاں اُن دونوں کی یادگار ایک سائرہ رہ گئی۔ ان دونوں کا مرنا ایک مصیبت کا پہاڑ تھا۔ میکے ہی میں تارے نظر آنے لگے۔ عادت رہی بدستور حالت گئی کوسوں دور۔ دادا دادی رہی نہیں۔ اماں باوا نے زیادہ پرواہ کی نہیں۔ مہینہ ہی بھر میں اُن کی شفقتوں کا مزا آنے لگا۔

شاکرہ جس رفتار سے چلی تھی اگر چند روز دل اور کڑا رکھتی اور اسی ڈھرے پر چلی جاتی تو سائرہ ایسی درست ہوتی کہ سو دو سو میں ایک۔ گو اس کی عادتیں زنگ کی طرح جم گئی تھیں لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ رگڑ کا اثر ہی نہ ہو۔ سب سے بڑی جیت یہ تھی کہ اب بھی ابتدا تھی انتہا نہ تھی۔ اسکی اصلاح دیر طلب تھی غور طلب تھی دقت طلب تھی مگر محال نہ تھی لیکن سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ شاکرہ بھی نوماں تھی کوئی غیر نہ تھی۔

ساس کی زندگی میں جو وہ بیٹی کی طرف التفات نہ کرتی تھی تو کیوں؟ وہ جانتی تھی کہ مجھ سے زیادہ ان کو اس کا عشق ہے۔ کہتی ہمیشہ یہی رہی کہ اس کے کوئی پر نہ اُڑا دے تو آہ نہ کروں، مگر آکر پڑی تو حقیقت کھل گئی۔ سائرہ نے کھانے سے انکار کیا تو اپنے حلق سے بھی نوالہ نہ اُتر سکا۔ خود منہ نہ لگتی کہ ایک کھونگی سوسنونگی مگر بھائی سے بہن سے کبھی کبھی باپ سے کہلوا کر جب تک کھانا نہ کھلواتی آپ نہ کھاتی۔

باپ جیسا جب تھا ویسا ہی اب رہا۔ ماں خود بات کم کرتی تھی لیکن یہ نہیں چاہتی تھی کہ باپ بھی متنفر رہے۔ کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا تھا کہ وہ بیٹی کی تعریفیں میاں کے سامنے نہ کرتی رہتی ہو۔ مگر سائرہ کے منہ پر نہیں پیٹھ پیچھے۔

کچھ دن یوں بھی گذرے۔ مگر افسوس شاکرہ بھی بودی نکلی۔ وہ زور شور چند ہی روز کا تھا۔ چاہا ہر چند کہ سائرہ درست ہو مگر اسکو ایسے کالے کا زہر چڑھا تھا کہ ان چھوٹے موٹے منتروں کے بس کا نہ تھا۔ علاج معقول ہوا نہیں زہر تھا کہ تمام جسم میں سرایت کر گیا۔ مہربان ہوئی تو چھوٹے بھائیوں تک کی خوشامد کر لی تھر واں ہوئی تو باپ تک کو کوسنے دے ڈالے۔ گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ نازبرداری کی توقع ذرا متنزلزل ہو گئی لیکن کس کام کی۔ ایک عیب گھٹا چار بڑھے۔ خود پسندی میں حسن وصورت کا اضافہ ہوا مکاری میں عقل نے رہبری کی۔ سلیقہ شعاری کا خبط سمایا۔ دانشمندی کی ہوا لگی۔

شہر میں اونٹ بدنام مری ہوئی دادی کو جو چاہے کہہ لو۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ مرحومہ کا قصور سیر بھر تھا تو باپ کا آدھ سیر اور ماں کا تین پاؤ۔ ضرور بالضرور شاکرہ نے ایک دفعہ نہیں بار ہا دیکھا کہ بیہودہ حرکتیں کر رہی ہے اور منہ پھیر لیا۔ ساس کی زندگی میں ساس کے بعد اپنے کانوں سے سنا کہ باپ کو کوس رہی ہے اور ٹال دیا۔ باپ نے جب نہیں،

اب ایک دفعہ نہیں کئی مرتبہ دیکھا کہ بے قصور بھائیوں کو مار دیا، بہنوں کو نوچ لیا اور
چپ ہو گیا۔ یہ خیال ایک حد خاص تک گو قرین قیاس ہے کہ وہ سمجھائے۔ کس کو۔ اور
کرتے کیا۔ گھُرکنے کی عمر تھی نہ مارنے کا وقت۔ چار سُنی ہوتیں تو ایک کہتے مگر یہ
وجہ بریت نہیں ہو سکتی۔ جو جو کچھ کر سکتے تھے سب کر کے دیکھتے۔ شاکرہ اور سلیم کی
یہ احتیاط کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ مانا کہ شاکرہ کی مامتا
اُن تدابیر کی اجازت نہ دے سکتی تھی جو سائرہ کی اصلاح کے واسطے ضروری تھیں،
مگر سلیم کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے تھے۔ اتنا نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کو اور جگہ جانا ایک
گھر سنبھالنا اپنی زندگی گذارنی اور ایک خاندان پر حکومت کرنی ہے۔ ٹوٹا باسن
کسیرے کے سر۔ دادی تو تھیں نہیں جو اُن کا نام جھنڈے پر چڑھا دیا جاتا۔ اپنی
عزت کا تو بہانا تک بچاؤ کیا کہ بیٹی سے بلا ضرورت بات کرنی چھوڑ دی اور جو در حقیقت
سمجھنے اور خیال کرنے کی بات تھی۔ اس کی پرواہ نہ کی۔ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی کہ
سلیم دو ایک دفعہ بیٹی کو پاس بٹھا کر سختی سے نہیں نرمی سے سمجھاتا۔ دنیا کا نشیب و فراز
دکھاتا۔ سائرہ بچہ نہ تھی جوان تھی۔ ممکن تھا کہ نصیحت کا اثر ہو؟ شاکرہ یہ تو نہیں کہا
جاتا کہ بیٹی کی کھال اُدھیڑ دیتی یا کھانا نہ دیتی۔ کپڑا نہ پہناتی۔ آہستگی سے کام لیتی
بیٹی کی یہ خوشامد کچھ عیب نہ تھی۔ دو چار باتیں خدا اور رسول کی سُناتی۔ ایک آدھ
بات دنیا داری کی بتاتی۔ اپنی طرف سے لگی لپٹی رہتی کچھ نہیں تو اتنا تو ہو جاتا کہ
سائرہ برائی سے احتراز نہ کرتی پر برائی کو بُرا تو سمجھتی۔ مگر نوشتۂ تقدیر یہ ہی
تھا۔ شاکرہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ سائرہ میں اور جو عیب ہوں مگر خوشامد سے تو
کوئی اس کی کھال تک اُتارے تو عذر نہ تھا۔ شاکرہ کے نیکبخت مطیع سلیقہ شعار
باتمیز شکرگزار ہونے میں ہم کو مطلق کلام نہیں۔ مگر سائرہ کے معاملہ میں اس نے کچھ نہ کیا۔
اس کے کیا معنی کہ سائرہ نے بھائی کی کاپی چھین لی۔ اور شاکرہ یہ کہہ کر چُپ ہو گئی

"میں اس کے منہ نہیں لگتی"۔ سلیم اپنی آنکھ سے جو کچھ دیکھ لیتا اس میں تو مجبوری ہی تھی۔ لیکن شاکرہ نے میاں کے سامنے بیٹی کا جب ذکر کیا بھلائی کے ساتھ۔ اس سے تو ساس کی زندگی ہی اچھی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مہینوں نہیں تو دنوں بیٹی سے بات نہ کرتی تھی۔ اب یہ وضع نہ نبھ سکی حالانکہ ضرورت اب ہی تھی۔ ارادہ بہتیرا کرتی تھی کہ دو چار دن نہ بولوں مگر کیسے دن اور کس کے گھنٹے۔ گھڑی بھر بھی تو ضبط نہ ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹی اور بھی شیر ہوتی گئی۔ باپ البتہ احتیاط کرتا تھا۔ مگر اس غریب پر ایک یہ آفت کیسی تھی۔ ادھر وہ بیٹی سے ناخوش ہوا۔ اُدھر بیوی میاں سے بگڑیں۔ سلیم لاکھ مستقل مزاج تھا، مگر بیوی کے آگے تمام استقلال خاک میں مل گیا۔ شاکرہ نے جب دیکھا کہ میاں کی تیوری پر بل آیا پہلے بگڑی اور جو بگڑنے سے کام نہ نکلا تو اس کی تعریفیں کرنی شروع کردیں اور جب تک میاں کے دل میں بیٹی کی طرف سے گھر نہ کرلیا چین سے نہ بیٹھی۔

دوپہر کے وقت ایک روز سلیم باہر سے تھکا ہارا آیا۔ بیوی سے کہا تھوڑا سا شربت بنادو۔ شاکرہ نے ماما کو آواز دی۔ وہ بیچاری بخار میں لوتھ پڑی تھی۔ تین چار دفعہ سائرہ نے بلایا اس غریب کو خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ واضح رہے کہ ماما کو تنخواہ وغیرہ اب اللہ کا نام ہی ملتا تھا۔ اگلے زمانہ کی عورت وضع داری نباہ رہی تھی۔ شاکرہ اٹھکر خود کھانڈ نکال لائی اور شربت بنا میاں کو دیدیا۔ مگر بی سائرہ کا آواز دینا تو حکم تھا کہ جس نے تعمیل میں دیر کی وہ قطعی سزا کا مستوجب۔ اٹھی اور دیا سلائی جلا کر بڑھیا کے سفید بالوں میں لگادی ڈھیر سارے بال بھڑ بھڑ اُڑ گئے۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھی وہی دیا سلائی اوپر پھینک ہنستی ہوئی بھاگ آئی۔ شاکرہ نے دیکھا اور کچھ نہ کہا۔ سلیم نے سنا اور خاک نہ بولا۔ مار و پیٹ چپکی ہوگئی۔ سائرہ ایسی ننھی یا نادان بچہ یا بے سمجھ نہ تھی۔ جانتی تھی جو کرتی تھی اور سمجھتی تھی جو کہتی تھی۔ مگر مزاج چشم بد دور۔ اوّل ہی دن سے ایسا واقع ہوا تھا کہ

کسی کی دل آزاری کا خیال نہ تکلیف کا افسوس کرتی تھی اور سمجھتی تھی کہ خوب کیا۔ کہتی تھی اور جانتی تھی کہ خوب کہا۔

(۱۰)

کل بی سائرہ کی پیدائش کا سامان ہو رہا تھا۔ آج وہ جوان ہیں۔ ہونے والی بات کے واسطے بھی ویسے ہی سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس بدنصیب کی تقدیر میں خدا معلوم کیا کیا لکھا ہے۔ بچپن کا زمانہ فراغت و بادشاہت کا تھا گذر گیا۔ جوانی کا سامنے آنا تھا کہ ہر عیب میں ترقی ہوتی گئی۔ اب شادی کی عمر تھی جس پر تمام زندگی کا دارمدار اور اس سفر کا انحصار تھا۔ پیغام آج سے کیا تین تین برس سے آرہے تھے بلکہ ایک مالدار سوداگر کی بات ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں آئی مگر ذلیل سمجھ کر نامنظور کر دی۔ وہی نقشہ اب بھی تھی۔ گو دادا دادی موجود نہ تھے مگر اماں باوا بھی اُن بزرگوں سے کچھ کم نہ تھے۔ جو بات آئی وہ واپس اور جو پیغام آیا وہ نامنظور۔ پتلے ملکانہ تھا مگر دماغ میں وہی بو سمائی ہوئی تھی۔ چالیس پچاس روپے سمجھ میں آتے تھے ہزار پانسو والا نصیب نہ ہوتا تھا۔ پھر یہ بھی تو نہیں کہ ناپسند ہوا واپس کر دیا نہیں سیوں کیڑے ڈالکر اور دس پانچ عیب بتا کر۔ مشاطہ ایک دفعہ نہایت خوبصورت ریشمیں رومال میں کوتوال کے ہاں کا رقعہ لیکر آئی۔ شاکرہ کی ماں اتفاق سے اس روز آئی ہوئی تھیں کوتوال کا نام سنتے ہی رومال اٹھا کر موری پر پھینکدیا اور ہزار فضیحتیاں مشاطہ کی کر ڈالیں۔ مشاطہ ایک بان زور چلتی ہوئی عورت، کہنے لگی بیوی لڑکی کی نانی ہو تو کیا میں تو جانوں دیوانی ہو۔ ڈاکٹر صاحب مر گئے اب تیہا کس برتے پر۔ دادی کو جاکر قبر سے اکھاڑ لاؤ۔ پوتی کو بیاہ جائینگی۔ تم بیچاری حکومت کی قدر کیا جانو۔ کوتوال کے ہاں بیٹی دیتیں تو نصیبہ کھل جاتا۔ بیٹی کو لیئے بیٹھی رہو۔ بیس برس کی تو ہو ہی گئی۔ کل کو بال سفید ہو جائینگے۔ بڑھیا دلہن کو پالکی میں بٹھا دینا شہر یا

نام تو ہو جائیگا۔ بیوی ہونی کروان ہونی نہ کرو۔ یہ تو تمہاری صوفی سمد صعق کا منہ تھا جو میں بات یہاں لے آئی۔ تمہارا منہ اس لائق کہاں۔ تم تو نکھٹوؤں کی قدر جانتی ہو تمہارے ہاں کوئی کماؤ آیا ہو تو جانو۔"

کچھ نانی کا لحاظ کچھ ماں کی شرم کچھ دنیا کا دستور سائرہ مجبور اور معذور اندر کے دالان میں بیٹھی ہوئی مشاطہ کی چرب زبانی سنتی رہی ورنہ نانی تو پیچھے پہلے وہ خود ہی مشاطہ کو ایسا ٹھیک بناتی کہ عمر بھر یاد رکھتی۔ مگر اتنا کیئے بغیر پھر بھی نہ رہی۔ ادہر تو مشاطہ بگڑ بگڑا کھڑی ہوئی ادہر سائرہ نے کتے کو لشکار دیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ شاکرہ نے چمکار لیا نہیں تو اور آفت آتی۔ تاہم مشاطہ کا پاجامہ جھیر جھیر ہو ہی گیا۔

مشاطہ تمام شہر کی پھرنے والی اونچے اونچے گھروں میں آنا جانا جہاں جہاں گذر ہوا ایسی ایسی جڑیں کہ لوگ نام سُنکر کانوں پر ہاتھ دہرنے لگے۔

(۱۱)

سچی بات یہ ہے کہ سائرہ کی خاندانی عزت یا شرافت جو کچھ تھا وہ ڈاکٹر صاحب ہی کے دم تک۔ اُن کو مرے ہوئے برسوں ہو گئے وہ ثروت وحشمت تمام ہوئی کوئی چھپی ڈھکی بات نہ تھی۔ بچہ بچہ جانتا تھا کہ میاں سلیم کی کل کائنات پچیس تیس روپیہ کا کرایہ ہے پھر سائرہ میں کیا ایسے لال لگے تھے کہ ہاتھ جوڑتے اور بیٹی لیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برس صاف نکل گیا۔ رقعہ بھیجنا کیسا کسی نے جھوٹے منہ بات بھی نہ پوچھی۔ بڑے بول کا سر نیچا۔ شاکرہ کو خود عورتوں سے کہنا پڑا۔ بوا کہیں کا رقعہ لاؤ۔ لوگ یہانتک بدظن ہوئے تھے کہ اگر کسی نے اشارۃً بھی ڈاکٹر صاحب کے ہاں کا ذکر کر دیا تو سنتے ہی کہدیا۔ بیوی بس دور ہی سے سلام ہے۔ جو رقعہ لے کر ہزاروں باتیں بنائیں وہ بیٹی کو دے کر تو سر مونڈہ ڈالیں گے۔ اُن کے ہاں تو پیغام بھیجنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے۔ باتیں کریں گی تو ٹیڑھی۔ جو دیکھی نہ سُنیں۔ شرطیں کریں گی تو انوکھی۔ جو

دہری جائیں نہ اُٹھائی جائیں۔ پچیس روپیہ مہینہ پٹاری کا۔ گیارہ ہزار کا مہر، دینے کو بالیاں تک نصیب نہیں۔ چڑھاوے میں مانگیں جھلنیاں۔ صاحبزادی کے وہ گن کہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ آنکھ میں شرم نہ دل میں ڈر۔ نہ ہمارے سر پہ اتنے بال نہ بیٹیوں کا کال۔ شہر بھرا پڑا ہے۔

چار برس اور گذر گئے اور ایک بات ڈھنگ کی نہ جُڑی۔ اب شائرہ اکیسویں میں تھی۔ مشاطہ نے اس وقت غصے میں کہا پڑ کر کہا جلکر کہا مگر بات پتے کی کہی اور ٹھیک کہی۔ شباب کا پُرلطف زمانہ، ماں باپ کے غصے خفگی، بہن بھائیوں کی توتو میں میں، نانی خالہ کی جوتی پیزار میں گذرا۔ جوان بیٹی، انتظار کی کوئی حد اور صبر کی کچھ انتہا۔ اس نے دیکھا کہ اماں باوا کی سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آتی۔ جو پیام ہے وہ مسترد اور جو گھر ہے وہ بے ڈھنگا منہ سے تو کچھ کہہ نہ سکی مگر جا بے جا موقع بے موقع ضرورت بلا ضرورت ماں اور باپ بہن اور بھائی غرض سب کو خواہ مخواہ بات نہ چیت تنگ کرنا شروع کیا کہ کسی طرح تو اُکتا جائیں مگر تقدیر کی ایسی ہیٹی نکلی کہ جب سے یہ عمل شروع کیا وہ جو گاہے ماہے بھولے بسرے شادی کا ذکر گھر میں ہو جاتا تھا وہ بھی موقوف ہوا۔ اب تو شاکرہ بھی گھبرا گئی مگر کس کے سر منڈھ دیتی۔ سلیم بھی پریشان مگر کہاں دھکے دیتا۔ بچپن کی نالائقیوں پر تو یہ سمجھ لیا تھا کہ بچہ ہے ناسمجھ ہے۔ بڑی ہو کر ٹھیک ہو جائیگی۔ اب کیا کہکر دل کو صبر دیتا۔

اکیس بائیس برس کی لڑکی ہٹی کٹی موٹی تازی مگر کیا مجال جو دم بھر کو چولھے کے پاس جا کر پھٹکے یا سینے پرونے میں ماں کا ہاتھ بٹالے۔ خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا اولاد کو ہر طرح بھرنا ہی پڑتا ہے مگر اس کمبخت نے تو سب کی مٹی برباد کر رکھی تھی صبح سے شام تک تراہ تراہ مچی رہتی تھی۔ ایسی ناہموار بیٹی خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ چال کیا بھونچال تھی۔ جس طرف نکل گئی ایک آفت۔ زبان الاماں۔ جس کے سر ہوئی جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گئی۔ بائیس برس کی لونٹا بیٹی آنکھ مچولی وہ کھیلے۔ کوٹھوں پر وہ پھرے

درختوں پر وہ چڑھے۔ بیٹی کیا غضب آلہی تھا کہ ماں باپ بہن بھائی سب نام سے تھرّاتے تھے۔ بھائی کو مارا بہن کو پیٹا، ماں کو ڈانٹا، باپ کو کوسا۔ دن بھر یہی سانگ کرتی رہتی تھی۔ کس میں اتنی ہمت تھی کہ اس سے زبان ملاتا۔ بہن بھائی البتہ سامنا کرتے اور پٹتے۔ ماں آج سے کیا ہمیشہ ہی سے برابر کی سہیلی تھی۔ نانی اول تو یہاں رہتی ہی نہ تھیں اور رہتی بھی ہوتیں تو وہ اکیلی کیا کر لیتیں۔ رہا باپ سو اس بیچارے کا خوف اور رعب آج کیا اور آج سے دس برس پہلے کیا کبھی ہوا ہی نہیں۔ ہاں ایک تھوڑا سا حجاب سمجھ لو جو باپ بیٹیوں میں تھا۔ بیٹی کی حرکتیں دیکھکر دونوں میاں بیوی سر پیٹ لیتے مگر یہ وہ لاعلاج مرض تھا کہ شفا تو درکنار افاقے کی بھی کوئی صورت نظر نہ آتی۔ چور کی ماں گھٹنوں میں سر دے اور روئے، باپ دیکھتا اور منہ پھیر لیتا۔ ماں دیکھتی اور ٹال دیتی۔ سائرہ کا مزاج دادی کی زندگی میں میل تھا اسکے بعد میل کا بیل ہوا۔ اور اب بیل کا سانڈ۔ پھوہڑ، بدمزاج، لڑاکا، زبان دراز، بے ادب، بدتمیز، گستاخ، ناہنجار، بے حیا، بد لحاظ، کوارپتے ہی میں سب گن پورے ہو گئے

شاکرہ ایک روز ماں کے ہاں مولود شریف میں جانے کو تیار تھی۔ یقچی سے کپڑے نکال الگنی پر ڈال اور نہانے چلی گئی۔ نین سکھ کا نیا ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ نہایت محنت و جانفشانی سے تیار کیا تھا۔ پائچوں پر کیکری۔ کیکری کے آگے چین۔ کلی کلی بخیہ ماں اُدھر گئی، سائرہ نے پاجامہ اُتار پہن لیا۔ بھائی کو بلا کر کہا دیکھ مس صاحب آئیں۔ یہ کہہ کر سٹر پٹر تمام انگنائی میں چکر کھانے شروع کئے۔ صاف شفاف اجلا پاجامہ کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ ماں نے باہر نکلکر دیکھا تو ناکا جوڑی کے بخیہ پر کیچڑ کی افشاں اس خوبصورتی سے ہوئی ہے کہ بخیہ سے تین دن میں بھی نہ ہوتی۔ شاکرہ بدنصیب نے کیسں مہینوں میں جاکر پاجامہ ختم کیا تھا۔ وہ بھی راتوں کو بیٹھ کر۔ دن

کو اول گھر کے دہندوں ہی سے چھٹکارا نہ ہوتا تھا اور اگر گھڑی دو گھڑی کو رہائی ہوئی تو بچے پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ سب سے بڑی آفت اسی کم بخت کی تھی۔ دس بجے رات تک اس کی شرارت سے فرصت نہ ملتی۔ جب سب سوجاتے تو لے بیٹھتی۔ ایک آدھ کلی پر بخیہ کیا اور رکھدیا۔ ان دقتوں اور مصیبتوں سے تو پاجامہ تیار ہوا اور لڑکی کمبخت نے دم بھر میں خاک میں ملادیا۔ شاکرہ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھی سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور رو دھو کر صبر کر لیا۔

اب سلیم بدنصیب کا قصہ لیجئے اس غریب کو بھولا بھالا دیکھ کر کسی نے کہدیا۔ میاں سبحان ربی الاعلیٰ کی تسبیح میر حسن کی مثنوی اور حاتم طائی کا قصہ پڑھا کرو۔ اللہ چھپر پھاڑ کر دیگا۔ سلیم اللہ کے جی تو تھے ہی۔ تینوں کا ورد کر لیا۔ صبح اٹھتے ہی نماز پڑھی تسبیح سے فارغ ہوئے اور وہیں جانماز پر بیٹھے بیٹھے آرائش محفل میں جٹ گئے۔

وظائف سے فراغت پاکر سلیم ایک روز باہر گیا ہوا تھا۔ شاکرہ باورچی خانے میں تھی سائرہ نے دونوں کتابوں کی تصویریں قینچی سے کتر آٹا چپکا اپنی الماری پر لگادیں دن گزر گیا باپ کو خبر ہوئی نہ ماں کی نگاہ پڑی۔ صبح کو جو میاں سلیم جزدان کھولتے ہیں تو اول کا ورق ہی ندارد۔ آگے بڑھے جو صفحہ دیکھا وہ ادھورا۔ بہتیرا اینچا پیٹا، بگڑا اخفا ہوا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ صاحبزادی کی الماری پر نظر پڑی تو نجم النسا جوگن بننے کی تیاری کر رہی ہیں۔ بیٹی سے تو بول ہی کیا سکتا تھا۔ بیوی کی جان کو آگیا۔ وہ پہلے ہی پاجامہ کو رو رہی تھی، کہنے لگی

"میرے بس کی جو بات ہو وہ بتاؤ۔ میں نہ کروں تو گنہگار۔ اس مردار کا میں کیا علاج کروں۔ تمام دنیا مر رہی ہے اس چڑیل کو موت بھی نہیں۔ سنکھیا لادو۔ کھلاکر سلادوں پاپ کٹے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہاں غارت کردوں۔

میاں۔ سینکڑوں جگہ سے باتیں آئیں مگر تمہاری سمجھ میں ایک نہ آئی۔ کوتوال

کے ہاں کیا خرابی تھی۔ وہاں نانی اماں نے اڑنگا لگا دیا۔

بیوی۔ کوتوال ہی کے ہاں کیا لال لگے ہوئے تھے اور بیس لڑکے تھے۔ مگر تقدیر کی جنبر تھوڑی تھی کہ اس بدنصیب کے واسطے لڑکے ہی نا پید ہو جائیں گے۔ کوتوال کے ہاں تو اور جوتیوں میں دال بٹتی اب بھی یہاں پڑی ہوئی ہے۔ جب بھی گھٹنے سے لگی رہتی۔ خدا جانے وہ کونسے لوگ ہیں جو بیٹیوں کی اللہ آمین کرتے ہیں میں تو کہتی ہوں خدا دشمن کو بھی ایسی بیٹی نہ دے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ایسی ناشاد لڑکی پیدا ہو گی اور اس نامراد پیٹ میں یوں آگ لگے گی۔

میاں۔ اس کو دیکھ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُترتا ہے ایسی ناہنجار لڑکی ہماری تو سات پشت میں بھی نہیں ہوئی دیکھئے اس کمبخت کی وجہ سے کیا کیا ہوتا ہے۔ اس کے صدمے نے مجھے کھا لیا۔ خدا کی قسم سائرہ مرجائے تو میری زندگی ہو جائے مگر بُرے کو موت کہاں یہ تو ایک ایک کر کے سب کو کھائے گی۔ تمہارے سبب سے میرا ابھی دم ناک میں ہے۔ ہوں نہیں کر سکتا۔ میں تو ایسی اولاد کو خاک میں ملا دوں مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے۔ دیکھوں کس طرح مردار ٹھیک نہیں ہوتی۔ وہ جانتی ہے کوئی کچھ کہتا نہیں سُنتا نہیں اور شیر ہوتی ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ سارے گھر کو آگ لگا دے۔ بچہ نہیں ناسمجھ نہیں پاگل نہیں سڑن نہیں جان جان کر تکلیف پہنچاتی ہے کہ کسی طرح مُنہ کالا کریں۔

بیوی۔ تم سے جوان بیٹی پر ہاتھ اٹھایا جائے تو بسم اللہ کرو۔ میں منع کر دوں تو جھوٹی، دخل دوں تو گنہگار۔ خواہ مخواہ کی باتیں بنانے کو جو چاہے وہ کہہ لو۔ میری طرف سے تم جان سے مار ڈالو۔ میرے سر کیوں ہوئے۔ کرے کوئی بھگتے کوئی۔ کیا کسی نے بگڑو کسی پر۔

میاں۔ تم بھی تو آخر گھر میں موجود تھیں۔ اللہ نے منہ پر آنکھیں بھی دی تھیں

تم اتنا نہیں دیکھ سکتی تھیں کہ یہ کیوں میری کتابوں کو چھیڑ رہی ہے۔

بیوی۔ بس تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں نے آگے دے کر نقصان کروا دیا۔ میرے سامنے پھاڑیں اور کچھ نہ بولی۔ جان گئی اور چپکی ہو گئی دیکھ لیا اور پھاڑنے دیں۔ جب ایسی ناشدنی اولاد پیٹ میں پڑی تو یہ باتیں سننی پڑیں۔ میں تمھاری، تمہاری ماں کی، گھر کی، گھربار کی، سب کی دشمن ٹھہری۔ پھر مجھ دشمن کا یہاں کیا کام۔ نکال باہر کرو۔ رہے بچے۔ تم جانو تمہارا کام۔ ایک کو صبح مارو ایک کو شام۔

میاں۔ اسی عقل نے تو یہ نوبت پہنچائی۔ اور اسی سمجھ نے یہ دن دکھایا۔ بولنے کی اجازت نہ دم مارنے کی طاقت۔ نقصان ہوا اور ہوں نہ کروں۔ تکلیف پہنچے اور اُف نہ ہو۔ ایسی اولاد کو لیکر کیا آگ لگانی ہے جو ماں باپ کو اذیت پہنچائے۔ اولاد کیا ہوئی دشمن ہوئی۔ تم نے حمایت لے کر اور غارت کیا۔ میں تو اس گھر سے باز آیا۔ تم کو سلام۔ تمھاری اولاد کو سلام۔ میں اپنا منہ کالا کرتا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھی رہو۔

بیوی۔ تم حاکم میں محکوم۔ تم بادشاہ میں رعیت۔ زبردست کمزور کی لڑائی کیا۔ میری کوئی خطا کوئی قصور ہو تو ایک بات بھی ہے۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ کتابیں کب لیں۔ کب پھاڑیں۔ کہاں کتریں۔ کہاں نکالیں۔ خواہ مخواہ میرے اوپر چھیدا رکھ کر گھر سے نکلنے کھڑے ہو گئے۔ یوں تو میں سدا ہی کی خطاوار ہوں۔ مگر بات کہو تو ایسی کہ اپنے اوپر نہ آئے اور کام کرو تو ایسا جو دیکھے وہ ٹھیک بتائے۔ تم کو اختیار ہے میرا کچھ زور نہیں زبردستی نہیں گھر تمھارا اپنا۔ میں کیا میکے سے لیکر آئی تھی۔ تم گھر سے کیوں نکلو بُری تو میں ہوں چلی جاتی ہوں۔ بچے اچھے ہیں تو تمہارے بُرے ہیں تو تمہارے۔ مجھکو ڈولی

لادو میں چلی جاؤں۔

میاں۔ بیٹی وہ کچھ۔ اماں یہ کچھ سمجھانے سے گئیں بجھانے سے گئیں مارنے سے گئیں۔ پیٹنے سے گئیں۔ گھر سے نکلنے کو طیار۔ موم کا گھر ہو گیا کہ ذرا دھوپ پڑی اور پگھلا۔

بیوی۔ میں تو کیوں ہی خدانخواستہ موم کا گھر سمجھنے لگی۔ تم ہی سمجھتے ہو بڈھا ڈرائے مرنے سے جوان ڈرائے بھاگنے سے۔ ذراسی بات ہوئی اور نکلتا ہوں نکلن کیا ہوا تام جھام ہو گیا۔ مجھکو تو مرنا ہے اور بھرنا۔ ساری عمر میں آج منہ سے نکالا ہے۔ وہ بھی تمھارے کہنے پر۔ اللہ بخشے اماں جان پر سدا یہ ہی مصیبت رہی ذرا کوئی بات خلاف مزاج اور تین تین دن غائب جس دن سے وہ مریں مجھپر یہ آفت آئی۔

میاں۔ تم جس کو مصیبت کہتی ہو وہ اس کو راحت سمجھتی تھیں۔ جو تم کو آفت ہے وہ اُن کو امرت تھی۔ اُن کی مصیبت اپنے ہاتھ کی تھی اپنی محبت کی تھی۔ اپنی غرض کی تھی وہ ماں تھیں۔ تم بیوی ہو۔ اُن کی تمھاری کیا برابری۔ انھوں نے جھڑکیاں سنیں اور نثار رہیں۔ تم نازاٹھواؤ اور بیزار رہو۔ اُنھوں نے اس قدر تکلیفوں پر کبھی بھی گھر سے نکلنے کا نام نہیں لیا۔ تم ذراسی بات میں خود جامے سے باہر ہو گئیں اُنکی نفرت اور تمھاری محبت۔ اپنے کام سے کام رکھو اُن کا نام کیوں لو۔ میری زندگی جسکو تم آفت کہتی ہو اُن کو غنیمت تھی۔ جیتے جی تو کوئی رہائی کی صورت نظر نہیں آتی۔ مرنے کے بعد انشاءاللہ فرصت ہو جائے گی۔ دعا کرو۔ التجا کرو۔ ختم پڑھو۔ چلے کھینچو کہ خدا میاں کو موت دے مگر مجھکو تو ہیکلے میں بھی کوئی اتنا نہیں دکھائی دیتا کہ دونو وقت چین سے روٹی کھلا دیگا۔ باوا مر ہی چلے۔ اماں خود بہو کی روٹیوں پر پڑی ہوئی ہیں۔ ملا کی دوڑ مسجد۔ لے دے کے ایک بھائی کا دم سمجھ لو۔ بھاوج سے جیسا میل ملاپ ہے وہ تم آپ جانتی ہو۔ دن بھر ٹہل کرو گی تو شام کو ٹکڑا

نصیب ہوگا۔ زندگی تو آفت ہے۔ مرگئیں تو مٹی ہی پلید ہوگی اور خیر اپنا پیٹ تو کُتا بھی بھر لیتا ہے۔ اس کچر دہان کا کیا کرو گی۔ مفت کی روٹی کھلانی آسان نہیں ہے کسی کی کیا جوتی کو غرض پڑی ہے جو اس وبال کو بھگتے۔ میں بھی تو سنوں۔ مجھکو بھی تو بتاؤ کیا کرو گی کہاں رہوگی۔ کس کے سر پڑو گی۔ باوا نہیں دادا نہیں۔ اماں اس قابل نہیں۔ کس منہ سے بولتی اور کس برتے پر نکلتی ہو۔ چار ہی دن میں آنکھیں کھُل جائیں گی۔ جاتی ہو تو بسم اللہ کرو جو کہا ہے وہ کر دکھاؤ۔ جو مُنہ سے نکلا وہ پورا کرو۔

بیوی ۔ بُرے ہیں یا بھلے۔ ہیں تو بھائی۔ دو وقت نہیں ایک وقت۔ سالن نہ سہی نہیں چٹنی سے گیہوں کی نہیں چنے کی جا کر پڑوں گی تو دو یوں ہی گے۔ بلا سے جو کی ملے مگر چین سے ملے۔ یہ تو نہو گا کہ مُنہ میں روٹی اور سر پر جوتی۔ اور بھائی پر ہی کیا ٹھیکہ ہے میرے اپنے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔ محنت کرونگی اور پیٹ پالونگی۔ مُردوں کو ٹھکانا ہے زندوں کو جگہ نہیں؟ میرے پاؤں میں تو ان بچوں کی بیڑی پڑ گئی۔ مجھکو روٹی کی کیا کمی، جہاں بیٹھ جاؤں وہیں لاکھوں کی لال۔ میں نے جانے سے کب انکار کیا ہے جو تم دھکے دینے بیٹھ گئے۔ تمہارے ہی ہاں اتنی بڑی تھوڑی ہوئی ہوں۔ روٹی کا دینے والا رازق ہے۔ بھلے بُرے امیر فقیر آدمی جانور سب کو دیتا ہے۔ مجھکو بھی دیگا اس گھر سے نکالدو اسکی خدائی سے نہیں نکال سکتے اور اگر میری تقدیر کا دنیا سے رزق ہی اُٹھ گیا تو نہ میں کچھ کر سکتی ہوں نہ تم۔ تقدیر کا ہے تو تم بھی دیتے ہو اور دیتے ہو تو احسان کیا کرتے ہو۔ بھوکا مارنے تھوڑی لائے تھے۔ اٹھو ڈولی لادو دم بھر ٹھہروں تو گنہگار۔ کیسے بھائی اور کس کی اماں۔ اپنا دم سلامت ہے جسکی خدمت کرینگے وہی عظمت کریگا۔ میں کیوں بھائی بھاوج کی روٹیوں پر جا کر پڑنے لگی غیر کے آگے ہاتھ پھیلانا اچھا اور اپنے کی خوشامد بُری۔ صبح سے شام تک دو ٹوپیاں بھی کرلونگی تو چار آنے کی ہوگئیں۔ مجھ کو دو نو وقت بہت۔ اکیلی نہیں اللہ

چاہے دو کو کھلا کر کھاؤں - تم اپنے گھر کو لیئے بیٹھے رہو- میں جب تمھارے در پر بھیک مانگنے آؤں کھڑے کھڑے نکال دینا- میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ اماں جان مریں اور میری مٹی ویران ہوئی وہی آگے آیا اُنکے سامنے تمھاری اتنی مجال نہ تھی کہ آج گھر سے نکال دیتے اُنکو اپنے لائے کی لاج اور کیئے کا نباہ تھا- ہاتھ رکھکر لائیں تھیں ساتھ لیکر جاتیں- آپ چلی گئیں اور مجھکو اس بلا میں چھوڑ گئیں-

میاں - واہ کیا خدا کی شان ہے- قائل ہونا تو درکنا الٹی جان کو آگئیں میں نے تو کبھی شریف زادیوں کو گھر سے نکلتے دیکھنا کیا سُنا بھی نہیں- خیر تم جاتی ہو تمھاری خوشی - میں منع نہیں کرتا -

بیوی - جب شریف زادے ایسی باتیں کریں تو بیویاں بیچاریاں کیا کریں کسی طرح جھگڑا ابھی کٹے یا نہیں پہلے تم نے گھر سے نکلنے کو کہا پھر میرے منہ سے نکلا کہ تم کیوں مصیبت بھگتو میں ہی غارت ہو جاؤں- چار آدمیوں کو بلا کر بات ڈالدو- دیکھو کس کو قائل کرتے ہیں-

میاں - چار کیا اگر ہزار آدمیوں میں بات ڈالو تو بھی میرا قصور کوئی ثابت نہ کریگا-

بیوی - چلو یوں ہی سہی میں تو سدا کی قصوروار ہوں- آج کیا کواری پیٹھ پچھنے لگے ہیں- تم سچے میں جھوٹی- تم بے قصور میں خطاوار-

میاں - میں تو جاتا ہوں- جو تمھاری سمجھ میں آئے وہ کرو-

سلیم یہ کہکر باہر گیا- مگر بیمار ڈرہ کے واسطے یہ واقعہ عمر بھر میں پہلا اتفاق تھا کہ دو شخصوں نے بالاتفاق اس کے واسطے ایسے الفاظ استعمال کیئے میاں بیوی کی گفتگو ختم ہونے سے پہلے ہی وہ ماں اور باپ دونوں پہ فرد قرارداد جرم لگا چکی تھی- باپ کے باہر جاتے ہی اس نے فیصلہ کرلیا کہ جرم کے مرتکب دونو ہوئے

اس واسطے دونو سزا کے مستوجب ہیں۔ بہن بھائیوں نے بھی میری حمایت نہ لی یہ بھی اعانت میں آئے۔ پس ماں اور ماں کے ساتھ باپ اور باپ کے ساتھ بہن بھائی غرض سب مجرم ہو گئے۔

بردباری یا حمیت تو کہی نہیں جا سکتی۔ مجبوری ولاچاری سمجھ لو کہ باپ کے سامنے یا تو ہمت نہیں پڑی یا مناسب نہ سمجھا، مگر باپ کا اٹھ کر جانا تھا کہ وہ سانپ کی طرح پھنپھنا کر اٹھی۔ دائیں بائیں آگے پیچھے جو ملا اور دکھائی دیا اسی پر چوٹ کی غرض بنیمی کے ہاتھ پھینکتی ہوئی ماں کے پاس پہنچی۔

سائرہ۔ ڈوب مروتم ماں کہ بھر منہ مجھکو کوسو۔ اپنے لاڈلوں کو کھاؤ۔ اپنے لڑکوں کو کھاؤ اپنی لڑکیوں کو کھاؤ مجھکو کوسنے والی تم کون۔ آپ ہنگوا کر سنکھیا کھالو مجھکو کیوں دو۔ بڑی نیک ہتھی تمازن۔ میاں سے لگا لگا کر کوسنے دلوائے فضیحتیاں کروائیں اور اب بھی پیٹ نہ بھرا۔ ستوے بہانے بیٹھیں۔ ایسی ماں سے سوکن اور ایسے باپ سے دشمن اچھا۔ مارا کیوں نہیں ایک انگلی تو لگا کر دیکھتے۔ خدا کی قسم یوں ہی کوتوالی چلی جاتی۔ عمر بھر جیل خانہ میں سڑ سڑ کر مرجاتے۔ تمہارے ہی گھر کی حکومت ہو گئی ہے جس کو چاہو مارو جسکو چاہو پیٹو۔ مجھکو موت کیوں آنے لگی۔ میں نے ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے۔ موت آئے تم کو کہ تمہارا دل بھر گیا۔ جو کرنا تھا وہ کر چکیں جو دیکھنا تھا وہ دیکھ چکیں۔ تم ہی ڈائن ہو ساس کو کھایا سسرے کو کھایا۔ خلیا ساسوں کو اجڑوایا۔ چچیا سسروں کو نکلوایا۔ تمہارے ہی کنبہ میں منحوس صورتیں بھری ہوئی ہیں ایک وہ بھیا کہ صبح شکل دیکھ لو تو دن بھر روٹی نفیب نہ ہو۔ دوسرے دو بھیا گنجے جن کے ہاتھ کے چھوئے کوئی بیر نہ کھائے۔ متیا اس قماش کی بھیا اس کینڈے کے۔ آپ تو ماشاءاللہ سبحان ہی اللہ ہیں۔ بڑی بیچاری کو سنے والی۔ کس منہ سے کہا تھا جاتی ہوں۔ اب مرتی کیوں نہیں۔

شاکرہ۔ جو تی لیتی آ۔ بیٹی جنی ہے ہنسی ٹھٹھا تھوڑی ہے۔ میرا کیا کرتی ہے اپنا کچھ کھوتی ہے۔ میں تو اپنی ہی جگہ ہوں۔ تیرا دین بھی گیا دنیا بھی۔ بڑھیا ہونے آئی کوئی فقیر بھی نہیں قبولتا۔ مرگئی تو کیڑے پڑیں گے۔ دنیا یوں گئی۔ دین یوں گیا۔ قصوروار تو میں ہوں مجھکو کوس پیٹ۔ بہن بھائیوں نے کیا لیا۔ جو ناگن ان کو ڈسنے چلی۔

سائرہ۔ مجھے کیوں نہیں قبولتا۔ میرے گاہک تو جیسے آئے تمہارا دل منصف ہے وہاں بھی تم ہی نے بہجریں ماریں۔

کواری لڑکی کے واسطے شادی کا نام لینا غیرتمندوں کے واسطے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ بھلے مانسوں کی بیٹیاں شادی کا ذکر سنکر ٹل جاتی ہیں۔ مگر سائرہ کو تورتی بھر لحاظ نہ تھا نہ ذرہ بھر شرم۔ اس نے شادی کے متعلق اس طرح گفتگو کی جس طرح ایک عالم وعظ کہہ رہا ہو۔ بیٹی کی یہ کیفیت دیکھ کر تو شاکرہ کے حواس باختہ ہو گئے۔ وہ بیٹی کو نالائق بےادب سب کچھ سمجھتی تھی مگر اتنا بےغیرت نہ جانتی تھی اس بات کا اسکو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ سائرہ خاندان کی عزت بزرگوں کی ناک سب بالائے طاق رکھدیگی۔ شروع میں تو کچھ بگڑی کچھ سنوری غصے سے یا نرمی سے سختی سے یا آہستگی سے بیٹی کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ مگر یہ فقرہ سنکر تو شاکرہ کو سکتہ ہو گیا۔ سائرہ کا منہ دیکھ کر چپ کی چپ رہ گئی۔ معلوم ہوتا تھا سانپ سونگھ گیا۔ دو تین منٹ تک تو چپکی بیٹھی رہی۔ اور پھر عاقبت اندیشی کے خیالات آموجود ہوئے۔ گم سم بنی بیٹھی تھی اور بیٹی کے چہرہ پر ٹکٹکی تھی۔

سائرہ کی زبان تو ایک قینچی تھی کہ چلنی شروع ہوئی تو کہیں اٹکاؤ ہی نہ تھا کیا مجال جو لمحہ بھر کو دم لیا ہو۔ آٹھ بجے کی کھڑی ہوئی تھی۔ دس بجے کے بعد جب دیکھا کہ اب کسی طرف سے آواز ہی نہیں آتی تو خاموش ہوئی۔ مگر پھر

تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ نہ کچھ بولتی ہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب سلیم آیا۔ اس کے آنے پر بھی دو تین منٹ تک وہی سلسلہ قائم رہا اور اس کے بعد ہار کر پلنگ پر جا پڑی۔

ماں باپ کا غصہ سائرہ کے واسطے ایک آفت ناگہانی تھا جسکا اسکو کبھی وہم وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ مگر ماں کے واسطے بیٹی کی نافرمانی ایک معمولی بات تھی۔ یہ اتفاق محض تھا کہ سلیم اس روز کچھ غصے میں بھرا ہوا۔ کچھ بیوی سے جلا ہوا، صبح کا بھوکا پیاسا ادھر اُدھر حیران پریشان پھرتا پھراتا اس گرمی میں جلتا بھلتا گھر آیا ڈیوڑھی میں تھا کہ صاحبزادی کے نعرے کان میں آنے لگے۔

امید یہ تھی کہ میری شکل دیکھ کر چپ ہو جائیگی۔ مگر جب امید میں ناکامی ہوئی تو کچھ دیر انتظار کرنا پڑا لیکن جب انتظار کی بھی حد ہو چکی تو سلیم متحمل تھا یا بردبار مگر تھا تو مرد یا تو بیٹھ گیا تھا یا اٹھ کھڑا ہوا۔ سلیم کا کھڑا ہونا تھا کہ بیوی کی جان نکل گئی بڑھ بڑھ کر منہ پر پھونکنے لگی۔ کچھ خدا ہی کو خیر کرنی منظور تھی کہ سلیم کے کھڑے ہوتے ہی سائرہ بیٹھ گئی۔ مگر کیا باپ کے خوف سے؟ ہرگز نہیں۔ تھک کر بیٹھی اور ہار کر بیٹھی۔ سلیم کو غصہ میں لال ہو رہا تھا مگر یہ خوب سمجھتا تھا کہ سائرہ کو ہاتھ لگانا کیسا اگر اس وقت بات بھی کرتا ہوں تو قیامت برپا کر دیگی۔ یوں ہی اس کا مزاج ساتویں آسمان پر ہے۔ اس وقت ڈانٹنا کیسا چمکارتا بھی ہوں تو جان کو آجائے گی۔

محلے کی عورتیں اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ اندر آجائیں مگر سب دیواروں پر سے جھانک رہی تھیں۔ خدا جانے ان کو کیا مزا آرہا تھا کہ گھر کے سب کام کاج چھوڑ صبح سے ٹنگے ٹنگے دوپہر ہوگئی اور وہ نیکبختیں وہاں سے نہ سرکیں۔ سلیم نے بیوی سے اتنا تو کہہ ہی دیا۔ دیکھو کیا نام اُچھل رہا ہے۔ شاکرہ کی شکر گزاری ہی آگے آگئی کہ سائرہ لیٹ گئی اور سلیم بیٹھ گیا۔ اور یہ کہہ کر بیٹھا کہ اب کے یہ مردار بولی تو جان سے مار ڈالونگا

پھانسی ہو گی تو بلا سے۔

یہ خیال کرنا تو محض نادانی ہے کہ سائرہ باپ کے خوف سے خاموش ہو گئی۔ نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ باپ کا کہنا سُنا نہیں۔ دالان اور کمرے میں کچھ ایسا بہت فاصلہ بھی نہ تھا۔ یہ ہی کہہ لو کہ خدا نے شاکرہ غریب پر رحم کیا۔

(۱۲)

سلیم کا غصہ فرو ہوا تو شاکرہ نے دسترخوان لا کر بچھایا۔ منت خوشامد سے کھانا کھلایا۔ سلیم کھانا کھا کر باہر چلا گیا۔ شاکرہ پڑ کر سو گئی۔ تین بجے ہونگے۔ سائرہ کمرے میں آئی ماں پڑی خرّاٹے لے رہی تھی۔ کمر بند میں سے کنجیوں کا گچھا لیا۔ کوٹھری میں جا کر صندوق کھولا۔ صندوقچہ نکالا۔ صندوقچہ کھول کر ایک ڈبیا نکالی۔ ڈبیا میں سے ایک پڑیا نکالی اور لیکر دالان میں آ گئی۔

شامت اعمال ایک دن پہلے ماں نے تولہ بھر افیون منگا کر رکھی تھی۔ مغرب کے بعد سلیم لے کر آیا۔ بیوی سے کہا بال بچوں کا گھر ہے پہلے اسکو رکھدو۔ شاکرہ نے تو اتنی احتیاط کی کہ چھوٹی لڑکی کو روتا چھوڑا منجھلے کو چینختا چھوڑا اور رکھنے چلی گئی کہ خدا بُری گھڑی نہ لائے۔ تقدیر کی خبر نہیں تھی کہ چھوٹے بچوں کی حفاظت کرتی ہوں بڑی بیگم آفت مچا دینگی۔

ماں سوتی کی سوتی رہی۔ سائرہ نے افیون نکالی اپنی صندوقچی میں رکھی۔ کمرے میں آئی۔ ماں کی کمر میں اس زور سے پاؤں کا ٹھونکا دیا کہ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

سائرہ۔ اٹھو۔ گھی کے چراغ جلاؤ۔ میں بُری تھی سب کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی۔ ماں باپ کی دشمن۔ بہن بھائیوں کی قاتل۔ میں نے اپنا پاپ کاٹ لیا۔ دو چار گھڑی کی اور مہمان ہوں۔ لو یہ افیم کی چوتی۔ میں تمہارا احسان بھی نہیں اٹھاتی۔ میں نے اپنا جھگڑا پاک کر لیا۔ اٹھو اب تو خاک میں ملا چکیں۔ یا اب بھی ٹھنڈک نہیں پڑی۔

خاندان تو خاندان محلے بھر میں اور اپنے تو اپنے کسی غیر کا بھی افیون کا واقعہ نہ سنا تھا۔ افیون کا نام سنتے ہی شاکرہ کا خون خشک ہوگیا۔ سٹ پٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی کوٹھری دیکھی تو چوپٹ، صندوق جا کر دیکھا تو کھلا ہوا، قفل دیکھا تو پڑا ہوا کنجیاں دیکھیں تو ندارد۔ اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا سارے صندوق اور صندوقچی کو الٹ پلٹ کیا۔ افیون کی پڑیا ہو تو ملے یقین ہوگیا کہ کھا گئی یقین آنا تھا کہ کلیجہ نکل گیا۔ سب چھوڑ چھاڑ روتی ہوئی بیٹی کے پاس آئی

اری سائرہ یہ کیا غضب کیا۔ خدا کے واسطے قے کر۔ للہ مجھ بدنصیب پر رحم کر مجھکو تو خبر بھی نہیں کس طرح سے کراتے ہیں۔

سائرہ ۔ بس معاف کرو جو کانٹا تھا وہ نکل گیا۔ میری تو جان گئی مگر تم کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دونگی۔ جب کوتوالی میں جاؤ گی اور تڑاتڑ جوتیاں پڑیں گی جب معلوم ہوگا کہ کسی مظلوم کی آہ لی تھی۔ میں تو کہاں ہونگی مگر تم یاد کر لینا کہ سائرہ کا صبر پڑا۔

شاکرہ کو اور تو کچھ بن نہ آئی بڑھیا کو میکے دوڑایا اور آپ لوٹ پانی گرم کرکے سائرہ کے پاس لائی

شاکرہ ۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھ خدا کی ماری پر ترس کھا۔ اگر عمر بھر تجھ سے کچھ کہوں تو اشراف نہیں رذیل ۔ لے یہ پانی پی لے یا حکیم جی کو بلواؤں۔

سائرہ ۔ حکیم کو بلواؤ یا ڈاکٹر کو ۔ قے کرنی ہوتی تو کھاتی ہی کیوں۔ اب سائرہ کی قبر پر جا کر ہاتھ جوڑنا۔

شاکرہ کے بھائی کو اسی دن کسی مقدمے میں ناکامی ہوئی تھی وہاں گھر کا گھر گم سم بنا بیٹھا تھا۔ اوپر سے بڑی بی یہ مژدہ لیکر پہنچیں۔ نانی اور ممانی جس طرح بیٹھی تھیں اسی طرح اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ڈولی بھی اتفاق سے اس وقت ایک ہی ملی۔ دونوں ساس بہوئیں اس میں ٹھس ٹھسا کر یہاں پہنچیں تو پانی پر ماں بیٹیوں کی رد و کد ہو رہی تھی۔ شاکرہ پانچ چھ بچوں کی ماں ضرور تھی مگر سچی مسلمان۔ جب سے سنا تھا آنکھوں میں

دنیا اندھیر تھی۔ بیٹی کی منتیں کر رہی تھی اور آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ جوان
بیٹی کا اندیشۂ موت کسقدر منافی ہوگا جو قبل از وقوع درجۂ یقین کو پہنچ گیا۔ ماں اور
بھاوج کی شکل دیکھتے ہی بے اختیار ہوگئی اور ماں کے گلے لپٹ گئی مگر ماں نانی کی کھاگ
اس راگ میں کیا آتیں۔ تھوڑی دیر تک تو نواسی کو غور سے دیکھتی رہیں اور پھر کہنے لگیں
بیوی افیم تھی یا چیکٹ۔ دوپہر کی کھائی کھائی مغرب کا وقت ہونے آیا اور تیوری پر
بل تک کا نہیں۔ ماشہ دو ماشہ بھی نہیں تولہ بھر تبارہی ہو۔ افیم نہ ہوگی تمباکو ہوگا۔ تولہ
بھر تو بہت ہوتی ہے۔ دو تین ماشہ بھی ہوتی تو گھنٹہ ڈیڑھ ہی گھنٹہ میں کچھ کا کچھ ہو جاتا۔
اب تو سائرہ کے ہوش اُڑ گئے۔ سمجھی کہ بنا بنایا کھیل بگڑا۔ اور پکی پکائی ہنڈیا کا
ناس ہوا۔ ماں بھولی تھی دہولس میں آگئی۔ نانی داؤں میں آنے والی نہیں۔ کہنے لگی تم
بے غیرت کو بلایا کس نے تھا نانی نہ ماں میں تیرا مہمان۔ ذرا سا بہانہ ملا اور آدھمکیں اتنا
سا موقع ملا اور چیٹ موجود۔ تم تو خدا سے چاہتی ہو کہ روز ایسی آفتیں آیا کریں۔ دو
تین دن کے کھانے ہی سے چھوٹی۔ مردہ بہشت میں جائے یا دوزخ میں تمتیں اپنے
حلوے مانڈے سے کام۔ یہاں جان پر بن رہی ہے اور اُن کے نزدیک کچھ ہوا ہی نہیں
ایسی مردیاں نانیاں رہ گئی ہیں اور ایسی بے غیرت یہ مائیں ہماری تو جان جا رہی ہے اور وہ
کھِل کھِل ہنس رہی ہیں۔ مرجاؤ تم آپ جو میرا مرنا چاہو۔ تم بے ایمانیوں کو بلانے
کون گیا تھا۔ کوئی تماشہ ہو رہا تھا کوئی شادی تھی کہ ڈولیاں نین چڑھ آ پھاندیں۔

نانی۔ بیٹی! بے غیرت کھوے لگاؤ کھوا اندھی بناؤ دھندی بناؤ۔ میں ان چکوسلوں
میں آنے والی بندی نہیں۔ مرجاؤ گی تو احسان کس پر کرو گی اپنی جان کھوؤ گی ایسی
نامراد اولاد کا تو مرنا ہی اچھا۔ ہر وقت کی سوختنی سے تو بلا سے ایک دفعہ کا رونا بہتر
آپ ہی صبر آجائیگا۔ ساری دنیا میں ایسی ہی بیٹیاں ہوا کریں تو زندگی وبال ہو جائے
باپ ہے وہ دن رات اسی فکر میں پڑا ہوا ہے کہ کسی طرح اس پتھر کو آگے سے اٹھاؤں۔

ماں ہے اس کو ایک گھڑی چین کی نصیب نہیں ہوتی، شہر بھر میں نام روشن ہو رہا ہی جوان بیٹی کا افیم کھانا شریفوں میں تو مر جانے کی جگہ ہے۔ تھالی گری جھنکار ہوئی کیا خبر بھری تھی یا خالی۔ کسی کو کیا معلوم کھائی یا نہیں کھائی اور کھائی تو کیوں کھائی کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا۔ ناک کٹنی تھی کٹ گئی۔ بلا سے کھا لیتیں تو صبر آجاتا سب کچھ تو ہو چکا ایک یہ رسوائی بچی تھی وہ بھی ہو گئی۔ کلنک کا ٹیکا لگنا تھا لگ چکا عزت پر حرف آنا تھا آگیا۔ بدنامی ہونی تھی ہو گئی۔ مر جاتیں تو پردہ ڈھک جاتا۔

ساعرہ۔ خدا کی مار اس نانی پہ مرتی دفعہ بھی تو اس کے ہاتھوں چین نہیں۔ میں اپنے منہ کو کہاں آگ لگاؤں۔ ہائے میری جان نکلی۔

ساعرہ بنکار رہی تھی کہ سلیم گھر میں گھسا۔ بیٹی کی حرکات کا اندیشہ اس کے دل میں یہاں تک بیٹھ گیا تھا کہ باہر بھی ہوتا تو کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں گھر میں دنگل نہ ہو رہا ہو۔ دروازے میں گھستا تھا تو ٹھہر ٹھہر کر کہ کسی کے چیخنے چلانے کی آواز تو نہیں آرہی۔ چوکھٹ پہ پاؤں تھا کہ میری جان نکلی کی آواز کان میں آئی۔ اندر آیا تو بیوی نے مفصل کیفیت سنائی۔ اب ماں ہے کہ ہر چند سمجھا رہی ہے اور شاکرہ ہے کہ زار و قطار رو رہی ہے۔

شاکرہ کو بیٹی کے افیون کھانے کا یقین اس درجہ ہوا تھا کہ وہ الٹی ماں کے سر ہو گئی۔ ساعرہ کی طرح گستاخ تو نہ تھی مگر پھر بھی ماں کے آگے چار پانچ باتیں ایسی کہہ دیں کہ شاکرہ جیسی بیٹی سے بعید تھیں۔ ماں نے ہنسکر کہا بیٹی ناحق بگڑتی ہو یقین ہی تو بسم اللہ کرو۔ میں منع تھوڑی کرتی ہوں مگر اب سے کیا فائدہ چھ سات گھنٹے تو ہو گئے۔

شاکرہ۔ اماں میں نے تم کو اس لئے تھوڑی بلایا تھا کہ تم اُلٹا اس کے سر ہو جاؤ نہ کیا ہو تو کہدے۔ اولاد بُری ہوتی ہے تو کیا ماں باپ چھوڑ دیتے ہیں۔ گائے کو سینگ دو بھر نہیں ہوتے۔ مر گئی تو جتنی میرے دل کو لگیگی تم کو نہیں لگیگی۔ پانی پڑا جھک مار رہا ہے کوئی اتنا نہیں کہ اسکو پلا دے۔

میاں سلیم اس معاملہ میں بہت ہی بڑھے ہوئے نکلے۔ ساس کی گفتگو سُنی تو بیٹی پر غصہ آنے لگا۔ بیوی کی باتیں سُنیں تو کلیجہ بلبلانے لگا۔ سمجھا کہ بیس پچیس برس کی کمائی ہاتھ سے چلی۔ آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے، پانی کی پتیلی ہاتھ میں لی اور بیٹی کے پاس آیا۔ شاکرہ بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ دن بھر کی تکان، گرمی کا موسم ہوا لگتے ہی نیند آگئی۔ سلیم نے آکر دیکھا تو سائرہ خراٹے لے رہی ہے۔ بیوی کی گفتگو ایسی عین الیقین تھی کہ خراٹوں نے بھی تو متزلزل نہ کیا۔ سرہانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ پکارنے لگا۔ باپ کے آواز دینے سے سائرہ جاگی۔ دیکھا تو ماں کروٹ میں بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے باپ سرہانے بیٹھے پانی کی خوشامد کر رہے ہیں۔ تھوڑی سی مسکراہٹ آئی مگر پھر آنکھیں بند کرلیں۔ نانی نے پکارا اماں! نے جھنجھوڑا کچھ جواب نہ دیا۔ باپ نے ہاتھ رکھ کر سانس دیکھا نبض دیکھی آدمی تو عقلمند تھے ہی۔ پھر ڈاکٹر کے لڑکے طبابت میں بھی دخل رکھتے تھے نبض تو خیر کمزور معلوم بھی ہوئی مگر سانس کا پتہ خاک نہ چلا۔ روتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میاں کو دیکھ کر بیوی بھی رونے لگی۔ نانی نے پاس آکر دیکھا تو نواسی پڑی ہوئی مسکرا رہی ہے۔ کہنے لگیں بیٹی بس اماں باوا نے جیسی حرکت کی ویسی سزا پائی۔ جیسا قصور کیا ویسا بدلا ملا۔ پٹ چکیں پٹوا چکیں رو چکیں رلوا چکیں۔ اب ان بیچاروں پر رحم کرو۔ آخر تو ماں باپ ہیں۔ بس جانے دو غصہ تھوک دو۔

سلیم۔ اماں جان! آپ نے کہاں دھوپ میں سر سفید کیا ہے۔ افیون اپنا اثر کرگئی نبضیں کمزور ہوگئیں۔ سانس بگڑ گیا۔ آپ وہی مرغ کی ایک ٹانگ گا رہی ہیں جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ تقدیر کا لکھا آگے آیا۔

شاکرہ کی ما۔ ہاں میاں سچ ہے مگر اس کی شان تو بہت بڑی ہے۔ مردے میں جان ڈالتا ہے جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔

باتوں ہی باتوں میں آدھی کے قریب رات گزرگئی۔ بارہ بجے کے بعد سائرہ

کسمسائی تو نانی نے اگر چپکے چپکے کچھ کہا مگر اس وقت میں اور اُس وقت میں آسمان زمین کا
فرق تھا اب جو کچھ کہا غصے سے نہیں بگڑ کر نہیں ڈانٹ کر نہیں ڈپٹ کر نہیں عاجزی سے
اور منت سے۔ سائرہ سے تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ آپ بھی تکلیف اٹھاتی اور اپنے ساتھ
ماں باپ کو بھی رات بھر پریشان رکھتی مگر گرمی کا زمانہ تھا۔ بھوک تو خیر تھ گئی لیکن پیاس
نے دیوانہ کر دیا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں بندھ گئیں۔ زبان میں کانٹے پڑ گئے حلق سوکھ گیا
مگر اپنے منہ سے پھر بھی پانی نہ مانگا۔ نانی تو یہ رنگ دیکھ کر جان ہی گئیں مگر جہاں دیدہ آدمی
تھیں سوچا کہ سیدھی انگلیوں گھی نکلے تو ٹیڑھی کیوں کیں۔ سمجھ ضرور گئیں مگر بیٹی داماد
سے مجبور تھیں سائرہ سے کہنے لگیں بیٹی بھلا تولہ بھر افیم اور پھر ڈتے کا ڈلا چور ابھی نہیں
بھلا اس کے گھلنے کو بھی کچھ وقت چاہیئے یا نہیں۔ خالہ چنیا کے پیٹ میں سے چوتھے روز
گولا نکلا تھا۔ اگر ایک کٹورا بھر کر پی لو ممکن ہے کا سموچا ابھی نکل پڑے۔ یہ بھی ضرور نہیں
کہ گرم ہی ہو ٹھنڈا ہی سہی۔ نون تو وہ ظالم چیز ہے افیم کیا اگر پتھر ہو تو گلا کر خاک
کر دے۔ تین قصور خدا معاف کرتا ہے۔ ایک قصور اماں باوا کا تم بھی معاف کر دو۔
لو یہ پانی پیو۔ شاباش شاباش۔

اب تو دل باغ باغ ہو گیا۔ ٹھنک کر بولی اچھا تو نانی اماں میں آپ ہی ڈال لونگی۔
شاکرہ اور سلیم کو تو یہ سنکر عید ہو گئی۔ نانی نے بھر بھر کٹورے پانی دیے۔ نون ڈھیروں
پسا ہوا رکھا تھا۔ برائے نام ذرا سا برک دیا۔ تو دس گھنٹے کی پیاس تین چار کٹورے
غٹا غٹ پی گئی۔ پی چکی تو آکر صندوقچی کھولی کچھ نکالا اور ذرا سے پرے بیٹھی۔ انگلیاں
ڈال کر اوں اوں کرنی شروع کی۔ خالی پیٹ تو تھا ہی انگلیاں جو ڈالیں واقعی استفراغ
ہو گیا مگر رکھا ہی کیا تھا جو نکلتا پانی ہی پانی تھا۔ افیون کی پڑیا خدا جانے بٹوے
میں تھی یا کرتے میں۔ نیفے میں تھی یا مٹھی میں۔ پھینک کر نہایت فخر سے آواز دی۔
لو نانی اماں آؤ دیکھو نکلی یا نہیں۔

سائرہ نے چال کی تو سہی مگر عیب کرنے کو بھی سلیقہ چاہیئے۔ افیون پھینکی لیکن پڑیا سمیت۔ سلیم لالٹین لیکر دوڑے۔ شاکرہ ڈبیا لیکر آئیں۔ نانی اتنا کہنے سے پھر بھی نہ چوکیں بیٹی مجھ بڑھیا کی آنکھوں میں خاک جھونکتی ہو۔ افیم کھائی تو پڑیا کی پڑیا۔

ہم تو میاں سلیم کے قائل ہیں۔ پڑیا اٹھائی بالکل سوکھی۔ افیون دیکھی جوں کی توں۔ فرماتے کیا ہیں اماں جان سچ کہتی تھیں ابھی گھلی نہیں جو کہیں گھل جائے تو فوراً ہی اثر کر جائے۔

سلیم کے ملنسار بے شر سیدھا سادھا درگذر کا آدمی ہونے میں ہم کو کلام نہیں۔ مگر سلیم نے دو ایک کام تو ایسی عقلمندی کے کیے کہ بچوں کو بھی مات کیا۔

افیون کی خبر سے کوئی نہیں تھی تو چھپ جاتی۔ یہاں سے وہاں اور وہاں سے وہاں۔ رات ہی رات میں تمام شہر میں ڈھنڈورا پٹ گیا۔ دو بجتے بجتے اس جھگڑے سے فرصت ہوئی۔ تین بجے کے قریب سب لیٹے۔ ابھی صبح میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا کہ چار ہی بجے رات سے تھانہ دار صاحب تحقیقات کو آ دھمکے۔ سلیم مظلوم کے ذہن میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ دنیا میں مرنے کے بعد پھول بھی ہوتے ہیں۔ نیند بھر کیسی ذرا آنکھ ہی لگی تھی کہ سپاہیوں نے کنڈی کی نوبت بجانی شروع کی۔ یہاں سلیم کے ایک دوست صاحب کلکٹر کی اردلی میں جمعدار تھے کیا متدین اور پرہیزگار آدمی تھا۔ جاڑا گرمی برسات، آندھی مینہ کچھ ہی ہو چار بجے سے اٹھنا اور نماز فجر جامع مسجد میں پڑھنی۔ کنڈی کی بے تحاشا اور مسلسل آواز سے سلیم کو یقین ہو گیا جمعدار پکار رہے ہیں۔ کسمساتا ہوا اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر آیا۔ اور یہ کہتا ہوا باہر نکلا بھائی آئے تو سہی مگر کیا بے موقع اور کیسے بے حلاوت کہ کچھ کہا نہیں جاتا اور آج خلاف عادت لالٹین بھی [illegible] اٹھا کر دیکھتا ہے تو کالے کالے صافے اور لال کنیاں۔ افیون کا اب تک خیال نہ آیا۔ سپاہیوں کی صورت دیکھتے ہی

ششدر رہ گیا۔ سلیم کچھ سوچ رہا تھا کہ تھانے دار نے للکار کر کہا ایک تو واردات اوپر سے اخفا ذرا اس لڑکی کو باہر لے آئیے جس نے افیون کھائی تھی۔ دیکھنے میں تو بڑے سیدھے معلوم ہوتے ہو مگر یار ہو بڑے چلتے ہوئے۔ اتنی بڑی سنگین واردات کو یوں ہی نگل گئے۔ سلیم کچھ کہنے کو تھا کہ ایک سپاہی نے کہا جاؤ جی کیا سوچ رہے ہو۔ لڑکی کو کوتوالی لے چلیے۔

سلیم مظلوم اللہ کے جی اور پولیس کے معاملہ تھر تھر کانپنے لگا۔ سپاہی نے ایک ڈانٹ اور دی۔ سلیم گھر میں جاتے ہی تھے کہ درحقیقت جمعدار آن پہنچے۔ دو چار محلے والے اور جمع ہو گئے۔ قصہ مختصر کسی نہ کسی طرح تھانہ دار کو رضامند کیا مگر اس رضامندی میں شاکرہ کے ہاتھوں کے ٹھوس کڑے گئے گزرے ہوئے۔

(۱۳)

سائرہ کے جان بر ہونے کی تو ماں باپ کو خوشی تھی ہی مگر کڑوں کے جانے کا رنج بھی کچھ کم نہ تھا۔ لیکن کچھ عرصے کی خوشی اور چند روز کا غم رفتہ رفتہ دونوں کا اثر زائل ہو گیا۔ اس کا خیال رہا نہ اُس کا ملال۔ جو کچھ باقی رہا وہ یہ کہ ماں تو ماں اب باپ میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ بیٹی سے کچھ کہہ سکے۔

سلیم کا ذریعہ معاش بزرگوں کی یادگار۔ بسر اوقات کا سلسلہ مال متاع جمع پونجی جو کچھ سمجھو لے دیکر تین دکانیں اور چار مکان جو بیس پچیس روپے کے کرایہ میں سارا مہینہ تیر کرنا پڑتا۔ ابتدا میں تو واقعی زیادہ تکلیف ہوئی مگر زمانہ انسان کو ٹھوک پیٹ کر اپنے مطلب کا کر لیتا ہے۔ وہی میاں سلیم جن کے حلق سے سادی روٹی نہ اُترتی تھی ماش کی دال غنیمت سمجھنے لگے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جاڑوں میں دودھ، چار، گرمیوں میں حلوا پوری ناشتہ کر لیتا۔ جب پلنگ سے اٹھتا۔ ایک یہ وقت تھا کہ کبھی چنے، کبھی پوریاں دمڑی دھیلے کی لے لیں اور سب نے مل کر دو پھنکے لگا لیے۔ وہ بھی کوئی ایسا

کھاگوان دن ہوا تو۔ نہیں اٹھا اور یوں ہی چلدیا۔ گیارہ بجے تخ تخ کرتا ہوا آیا
جو بیوی نے آگے رکھدیا۔ خدا کا شکر کیا اور کھالیا۔ نفرت نہ شکایت۔ رہی شاکرہ
گو میکے کی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ مگر تیرہ برس کی بیاہی آئی۔ روپیہ کی افراط
دل میں ارمان کئی گھروں میں ایک بہو خوب خاطر مدارات ہوئی۔ مگر عورت وہ شکر گزار تھی
کہ میکے میں بھی ہمیشہ خدا کا شکر ہی ادا کرتی رہی۔ سسرال میں تو اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ممکن تھا
کہ شاکرہ کا دماغ یہاں پہنچکر کچھ کا کچھ ہوجاتا۔ مگر اس نیک بی بی نے کبھی اپنی حالت کو مستقل
ہی نہ سمجھا۔ روپیہ دیکھ کر کبھی آپے سے باہر نہ ہوئی جو مفلسی میں زندگی دوبھر ہوجاتی
البتہ حالت میں اتنا فرق ضرور ہوا، کواری تھی تو نماز کی پابند۔ بیاہی گئی تو جی اچاٹ ہوگیا
مفلسی آئی تو پھر خدا سوجھا۔ سلیم اگرچہ پڑھا لکھا واجبی تھا مگر جاہل تھا یا بے وقوف۔
باپ کی زندگی میں بھی اور بعد بھی ماں کے جیتے جی بھی اور اب بھی گو نماز پابندی سے
نہ پڑھتا تھا مگر وعظ کسی جمعہ کا نہ چھوڑتا لیکن سائرہ سلمہا سامنے نہ پیچھے۔ جب نہ اب
کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ اس کا مزاج یہاں تک بگڑ گیا تھا کہ دال پک گئی تو سارے
سارے دن بھوکی رہی مگر دال کو ہاتھ نہ لگایا۔

سلیم کے کوئی دوست ہزار روپے کے قرض میں گرفتار ہوئے۔ سال بھر میں
ادائگی کا اقرار کیا۔ ساہوکار نے ضمانت مانگی۔ سلیم سے درخواست کی گئی مقروض کی
التجا یار دوستوں کی منت برسوں کی ملاقات روز کی نشست برخاست سیدھا آدمی
مزاج میں صلاحیت آنکھ میں مروت، راضی ہوگیا۔ گھر میں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ بڑا مکان
مکفول کردیا۔ ادھر سال پورا ہونے آیا ادھر مقروض روپوش۔ قرضخواہ نے مکان کھڑے
کھڑے نیلام کروا روپیہ وصول کرلیا۔ اس گھر کا کرایہ دس روپے ہاتھی کا پاؤں تھا
اب کل کائنات پندرہ سولہ روپے رہ گئے۔ پچیس میں بھی نہ معلوم کس طرح گذر ہوتی
تھی۔ پندرہ میں کیا خاک ہوتا۔ فاقوں کی نہیں تو قریب قریب فاقوں کی نوبت

آگئی۔ کس قدر صدمے کی بات ہے، جس گھر میں ہزار کی گنتی تھی نہ پالسنو کی۔ اس میں دو تین پشتیں بھی نہیں آٹھ دس ہی برس بعد اللہ آمین کی بھودر زیوں کے کرتے اور کاریگروں کی ٹوپیوں پر آگئی۔

(۱۴)

مصیبت میں انسان کو خدا زیادہ یاد آتا ہے۔ میاں بیوی کی صلاح سے ایک دن محفل مولود شریف قرار پائی۔ سلیم کہیں سے قرض دام لیکر چار روپے کی مٹھائی لائے۔ شاکرہ نے سینیوں میں چن کر خوان پوش ڈھانک مٹھائی کو ٹھری میں رکھی اور کمرے میں جاکر بچھونے کا ٹھیک ٹھاک کرنے لگی۔ سائرہ نے اُٹھ کر خوان پوش کھولا۔ تین چار ڈلیاں آپ کھائیں نیکی کے دم میں تھی ایک ایک ڈلی بھائی بہنوں کو بھی دی۔ محلے کی ایک لڑکی شمشو گوٹے والے کی بیٹی سہیلی بنی ہوئی تھی پانچ چھ ڈلیاں اس کو دیں۔ مفت کا مال کس کو بُرا لگتا ہے سینکڑوں دعائیں ملنے لگیں۔ سائرہ ایک خوشامد پسند لڑکی، ماں کو خبر بھی نہ ہوئی کھڑکی ہی میں بیٹھ کر ایک سینی ختم کردی۔ ادھر لڑکوں نے لیجانی شروع کردی۔ غرض مولود سے پہلے دو سینیاں صاف ہوگئیں۔ ایک میں کوئی آدھ سیر تین پاؤ مٹھائی کوئی پاؤ بھر ایک چورا باقی رہ گیا۔ بی شاکرہ جو آکر دیکھتی ہیں تو دو سینیاں پلنگ کے نیچے اوندھی پڑی ہیں اور ایک میں پندرہ بیس ایک ڈلیاں اور ڈیڑھ دو مٹھی چورا بچا ہوا ہے۔ لڑکے سے بلا کر پوچھا وہ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ سائرہ بگڑ کر بولی بیٹنے ہی کو آئی تھی۔ جب نہ بٹی اب بٹی۔ تم نے نہ بانٹی میں نے بانٹی۔ ایک سینی کی تو میں گنہگار ہوں باقی تم جانو اور تمہارے بچے۔ مارو چاہے پیٹو۔ میں اسی واسطے بھری ہوئی ایک سینی چھوڑ آئی تھی کہ وقت پر رسوائی نہ ہو۔ پوچھو ان بے ایمانوں سے میں نے اگر دیں تو غریبوں کو فقیروں کو محتاجوں کو مسکینوں کو۔ ان مردوں کے کون سے باوا دادا بیٹھے تھے جو ان کو دے آئے۔ میں تو اسی لیے چپکی بیٹھی دیکھتی رہی

کہ پہلے ہی بدنام ہوں میں کیوں بولی۔ مجھ کو اپنے کام سے کام میری طرف سے کچھ ہی
کریں اب تم جانو یہ جانیں۔

شاکرہ کی اتنی مجال نہ تھی کہ پھر بیٹی سے دوسرا سوال کر لیتی۔ معاملہ ایسا تھا کہ نہ کسی
اور سے چھپ سکتا تھا۔ نہ میاں سے چھپ سکتا تھا اور سلیم ہی سنکر کیا کر لیتا اور کیا کر لیا
ماں تو خیر کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی بات میں بہت نہیں تھوڑا اڑ کر یا بگڑ کر کچھ کہہ بھی دیتی تھی
مگر باپ کو تو جس روز سے وہ واردات ہوئی بات کرنی قسم تھی۔ کچھ اس سبب سے
نہیں کہ ناراض تھا بلکہ اس وجہ سے کہ یہ ناخوش نہ ہو جائے۔ مٹھائی کا حال سنکر
خاموشی کے سوا اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ دنوں کا ذکر بھی نہیں ہے کہ چوہے کھا گئے۔ گھنٹوں
کا معاملہ گھڑیوں کی بات۔ سیر آدھ سیر مٹھائی نہیں دو چار آدمیوں کے بس کی نہیں صبر
کرتا ہوا باہر چلا گیا اور ایک روپے کی [illegible] لاکر مٹھی مٹھی تقسیم کر دیں۔

اس واقعہ کا جو کچھ اثر ہوا وہ سلیم اور شاکرہ کا دل ہی جانتا ہوگا۔ بظاہر نہ تو کچھ
نقشہ بگڑا نہ بات پر بات ہی ہوئی۔ کھیلیں کھلیں لوگ رخصت ہوئے بات رفع دفع ہو گئی۔
اب تک جو کچھ شرم یا حیثیت کا لحاظ یا خیال برائے نام باقی تھا اب وہ بھی ختم ہوا۔ افیون سے
پہلے کچھ تھوڑا بہت تو کہیں لحاظ موجود بھی تھا۔ افیون کے بعد تو بالکل ہی آزاد ہو گئی
باپ نے بات کرنی تو چھوڑ دی تھی۔ ماں نے دخل دینا چھوڑا۔ لڑکی تھی کہ بالکل ہی کھل کھیلی
[illegible] لڑتی اس کو مارا [illegible] دن رات یہ ہی کرتی رہتی تھی۔ آخر
[illegible] برداشت [illegible] تحمل۔ گھڑی دو گھڑی کی تکلیف ہو تو بھگت بھی لی جائے
[illegible] سائرہ پسر نوح کی طرح سو ہاتھ [illegible] ہو گئی۔ باپ تنگ
آ گیا۔ ماں [illegible] مگر جیسے بس کی بات نہ تھی نہ اس کے اختیار کا کام۔ ماں ہی انتظام
کرتی تھی نہ باپ ہی بندوبست۔ دونوں میاں بیوی بیٹھے منہ دیکھتے اور اس کا جو جی
چاہتا [illegible] باپ کی اتنی قدرت۔ وہ اسکا منہ دیکھ کر چپ ہو جاتا تھا

یہ اس کی صورت دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھر لیتی۔

ظاہری حالت جو کچھ ہو مگر دلوں کی کیفیت دونوں کی متضاد تھی۔ شاکرہ چاہتی تھی کہ اسکی شادی نہ کروں۔ کریں نہ کریں دونوں یکساں۔ بلکہ اب تو ایک ہی غم ہے۔ جب دو ہو جائیں گے۔ سسرال میں اس کی نبھنی نہیں۔ میاں سے اس کی نبھنی نہیں۔ چالوں کے اندر ہی کوٹھے سے آلگے گی۔ کواری رہیگی تو بلا سے۔ مگر یہ خواری تو نہ ہو گی کہ چاروں طرف سے جوتیاں پڑیں۔ جو روکھی سوکھی دال دلیا میسر ہوگا بٹھاؤنگی اور کھلاؤنگی اپنا پیٹ کاٹونگی اور اس کا پالونگی۔ سلیم چاہتا تھا کہ اگر جھوٹ موٹ بھی کوئی کہے تو کیسی ذات اور کس کی جماعت بیچ بیچ رخصت کر دوں۔ مگر صاحبزادی کا نام تو اس قدر نکل گیا تھا کہ پیغام بھیجنا تو بڑی چیز ہے۔ لوگ ذکر کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

دنیا کے کام یوں ہی چل رہے ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں اللہ کی بندیاں لنگڑیاں لولیاں بھینگیاں۔ کانڑیاں بھی چلی جارہی ہیں۔ حسن ظاہری بڑا جھک مارتا ہے اور تقدیر یا اتفاق فقیرنیوں کو بیگم اور بیگموں کو لونڈی بنا دیتا ہے۔

(۱۵)

شہر کے ایک عالم و فاضل مولوی ہادی علی شاہ چھ سات برس بعد بیت اللہ سے واپس آئے۔ ہجرت کا ارادہ مصمم تھا اور اسی نیت سے گئے بھی تھے کہ اب واپس نہ آؤنگا دو لڑلیاں اپنے گھر کی ہیں ایک ابھی بچہ ہی ہے۔ لڑکے دونو برسر کار تیسرا ابھی نو دس برس کا ہے اگر خدا کو منظور ہوا اور اُن کی عمروں نے وفا کی تو ہیں اُن کے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤنگا۔ چلتی دفعہ تو بیوی کا بھی یہی قصد تھا مگر وہاں پہنچکر اِدھر تو عربوں کی طرز زندگی سے دل اُکھڑ گیا۔ اِدھر بچوں کو دیکھے ہوئے پانچ چھ برس ہو گئے لڑکے کو دیکھا ماشاءاللہ جوان ہوتا چلا آرہا ہے بیٹی کی طرف آنکھ اٹھائی تو لڑکی کی بیل اور گڈی کی بیل۔ اٹھان ایسا کہ دس گیارہ برس کی لڑکی خاصی جوان معلوم ہوتی

تھی۔ غرض بیوی کا ارادہ فسخ ہونا شروع ہوا۔ مولوی صاحب نے کہا سنکر چپ ہو گئے۔ مگر بیوی کے دماغ میں تو خیال کے پیدا ہونے کی دیر تھی۔ دن رات کی تسبیح ہو گئی کھاتے اور پیتے اُٹھتے اور بیٹھتے منت سے اور خوشامد سے رو کر اور بگڑ کر۔ مولوی صاحب چند روز تک تو ٹالتے رہے مگر جب مجبور ہو گئے تو آنا پڑا۔ گھر پر آئے۔ گھنٹہ بھر بھی نہ ہوا ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر سنی انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور سلیم کے پاس آئے۔ سلیم گھر سے نکل رہا تھا۔ مولوی صاحب کی شکل دیکھتے ہی مصافحہ کیا۔ ہاتھ چومے بغلگیر ہوا اور ساتھ لیکر آیا۔ کچھ دیر تک مولوی صاحب ڈاکٹر صاحب کے محامد اخلاق کا ذکر کرتے رہے پھر کچھ عرب کے حالات بیان کرتے رہے اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اثنائے گفتگو میں بی سائرہ کا بھی ذکر خیر ہوا مولوی صاحب کے تعلقات ڈاکٹر مرحوم کے ساتھ بالکل برادرانہ تھے۔ بسم اللہ کہکر لڑکے کا پیغام دیدیا۔ سلیم نے کچھ تامل کیا مگر مولوی صاحب بغیر ہاں کروائے نہ اُٹھے۔ مولوی صاحب اُٹھکر گئے۔ سلیم کسی کام کو بازار چلا گیا۔ پلٹ کر آیا تو شاکرہ غسل خانے میں تھی باہر آئی تو ابھی سلیم کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مزدورنیاں ترکاری کے خوان اور مٹھائی کی سینیاں سر پر رکھے چلی آرہی ہیں۔ شاکرہ ہکا بکا ایک ایک کا منہ دیکھنے لگی اور سلیم کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑنے لگے۔ بڑی دیر بعد سلیم نے منگنی کا حال سنایا۔ پہلے تو کچھ بگڑی مگر پھر خود ہی کچھ خیال آیا۔ کہنے لگی بادشاہ وزیروں کی نہیں بیٹھیں فقیروں کی کہاں سے بیٹھیں گی۔ خیر خدا راست لائے۔

بڑے لڑکے کو بھیجکر میکے خبر کروائی۔ ماں آئیں۔ بھاوج آئیں۔ خالاؤں کو بلوایا ممانیوں کو بلایا۔ غرض پاس پاس کی سب عورتیں جمع ہو گئیں اور مٹھائی تقسیم ہو گئی۔

یہانتک تو خیر کچھ مضائقہ نہ تھا۔ منگنی ہونی تھی وہ ہوئی۔ دقت یہ تھی کہ

سلیم کے پاس روپیہ تو درکنار مٹکے میں آٹا بھی برکت ہی تھا مگر مسبب الاسباب سب سامان کر دیتا ہے۔ سلیم میں ایک یہ صفت لاکھ روپے کی تھی کہ اسکی ساکھ بندی ہوئی تھی۔ تھا بات کا سچا اور وعدے کا پورا۔ ہاتھ پیروں پر جاکر پچاس روپے قرض لے آیا۔ شاکرہ نے جھٹ پٹ گھر کی درستی کی۔ دالانوں میں دریاں بچھوائیں۔ کمرے میں چاندنی۔ چاندنی پر سوزنی۔ سوزنی پر گاؤ تکیہ لگایا۔ لڑکی کے کپڑے بدلوائے۔ زیور پہنایا۔ مغرب کے بعد سمدھنیں آنی شروع ہوئیں۔ مگر زیادہ نہیں دو چار ہی۔ لڑکی کا منہ میٹھا کیا۔ گیارہ روپے ہاتھ پر رکھے۔ انگوٹھی چھلا پہنایا اور چلی گئیں۔

(۱۶)

مولوی ہادی علی شاہ کہیں نوکر نہیں چاکر نہیں زمینداری نہیں تجارت نہیں۔ ذریعہ معاش یا بسر اوقات کی صورت جو کچھ تھی صرف مخلوق کی خدمت۔ ہادی علی شاہ سبحان اللہ کیسے عابد و زاہد اور عالم و فاضل کہ اُن کی صورت دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا خدا معلوم اُن کے وعظ و نصیحت میں کیا اثر تھا۔ کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو دم بھر میں موم ہو جائے جس پر نگاہ پڑی وہی پارس ہوا۔ دلی سے پشاور تک اور کلکتے سے بمبئی تک دور دور سے لوگ آتے اور کامیاب ہو کر جاتے۔ جو آتا خالی نہ جاتا۔ مولوی صاحب کی کشف کرامات تعبیر کرو۔ یا خداوند کریم کی عنایت سمجھو۔ جس مراد سے آیا وہ حاصل۔ جس غرض سے آیا وہ پوری۔ صبح سے شام تک بیسیوں آدمی آتے اور جاتے ہم نے تو کبھی سنا نہیں کہ ایک بھی نامراد گیا ہو۔ رئیس اور فقیر نیک اور بد دیسی اور پردیسی حاکم اور محکوم دو کی گنتی تھی نہ چار کی۔ دس کی نہ ہزار کی۔ ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔ نماز فجر سے تا نفل اشراق تک جب تک حجرے کا دروازہ بند رہتا۔ خلقت کی کثرت سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔ نوافل سے فارغ ہو کر باہر آئے۔ کسی پر دم کیا۔ کسی کو دعا بتائی۔

جمعہ کے بعد وعظ فرماتے تھے شاید ہی کوئی ایسا جمعہ ہوتا ہوگا جو دس بیس آدمی
باہر سے آتے نہ ہوں۔ مولوی صاحب کا عمل تعویذ گنڈوں کا نہ تھا۔ دعا کرتے تھے اور کہتے
تھے بندے کا کام مانگنا ہے۔ دینے نہ دینے والا وہ ہے۔

مولوی صاحب ہی کا فیضان صحبت تھا کہ گھر کی عورتیں تو عورتیں بچہ بچہ وقعت
مذہب پہچانتا اور خدا کی عظمت جانتا۔ دن رات سوا نیکیوں کے کچھ اور کام نہ تھا۔
سات سات آٹھ آٹھ برس کے بچے بھی صبح چار بجے سے اٹھتے نمازیں پڑھتے اور
درگاہ ایزدی میں گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگتے اور کیسی دعائیں الٰہی تو رحیم ہے۔
کریم ہے بندوں پر رحم کر۔ قیدیوں کو رہائی۔ غریب الوطن کو وطن پہنچا۔ بیماروں کو
صحت۔ عزیزوں میں یگانگت بھائیوں میں محبت اولاد کو اطاعت۔ مفلسوں کو قناعت
امیروں کو سخاوت۔ علم میں برکت۔ گمراہ کو ہدایت۔ دشمنوں میں دوستی۔ دوستوں
میں مروت۔ چھوٹوں کو خدمت بڑوں کو محبت۔ بے اولاد کو اولاد۔ نامراد کو مراد۔
بے روزگاروں کو روزگار بے گھروں کو گھربار بے چینوں کو چین عاملوں کو عمل بیٹوں کو
گھر بیٹیوں کو بر۔ اپنے یا بیگانے دنیا میں عزت آخرت میں مغفرت۔

مولوی صاحب کا تیسرا لڑکا عابد جس سے سائرہ کی منگنی ہوئی علمیت کے
اعتبار سے باپ کا تو پاسنگ بھی نہ تھا مگر ایسا سیدھا اور نیک لڑکا آج تک دیکھنے میں
نہیں آیا۔ اوقات نماز کے سوا گھر سے نکلنا قسم تھا۔ نماز کو جاتا تو نیچی گردن کیے جاتا
اور نیچی نگاہ کیے آتا کسی سے بات نہ چیت چپکا گیا اور چپکا چلا آیا۔ ناچ ہو رنگ ہو
کھیل ہو تماشہ ہو۔ کیا مجال جو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے۔ محلے کے بدکردار لڑکے بازار
کے ناہنجار دکاندار بغدو بغدو کہا کرتے تھے مگر وہ تو اس مزاج کا لڑکا تھا کہ زبان
سے کہنا کیا اگر کوئی خواہ مخواہ پکڑ کر دو تھپڑ بھی مار لیتا تو چپکا چلا آتا۔ شوق امنگ
خواہش ارمان اس کے دل میں جو کچھ تھا صرف تلاوت قرآن کا۔ اسے فرصت

ہوتی نہ طبیعت میں کوئی جوش پیدا ہوتا۔ خدا معلوم کس مزاج کا آدمی تھا کہ اور کسی چیز کا شوق ہی نہ تھا۔ اچھا کھانے کو اس کا جی نہ چاہتا۔ اچھا پہننے کی اسکو رغبت نہ ہوتی (جوان آدمی خدا کا دیا سب کچھ موجود۔ روپیہ گز کا کپڑا پہنتا اور اشرفی تولے کا کھانا کھاتا تو کچھ کمی نہ تھی) کچھ ایسی ٹھوس طبیعت واقع ہوئی تھی کہ کبھی کوئی خواہش ہی نہ پیدا ہوئی۔ دور سے صورت پر ملا ناپن برستا تھا۔ منڈا ہوا سر پھنسی ہوئی ٹوپی۔ گھٹنوں سے نیچا کرتہ۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ بھدی یا گول پنجے کی جوتی۔ ناچ رنگ تو خیر شوقین آدمیوں کا کام ہے۔ اس اللہ کے بندے کو کبھی دعوت میں بھی تو نہیں دیکھا۔ جمعہ میں بھی جب دیکھا تسبیح ہاتھ میں۔ لاڈلا بچہ روپیہ پیسہ خاطرخواہ جوانی کی عمر عابد جو کچھ نہ کرتا اور جیسا کچھ نہ اٹھتا سب تھوڑا اور درست تھا مگر وہ تو کچھ ایسا غبی الشوق نکلا کہ اس کے خیال سے ہنسی آتی ہے۔ خیر از رجو تھا سو تھا مگر جوڑا خوب بندھا۔ میاں کو یہ دھن بیوی کے یہ گن خدا انجام بخیر کرے۔ سائرہ خدا کا نام کبھی بھول کر نہ لیں۔ عابد دن رات خدا کی یاد میں مستغرق۔ بیوی نے آج کے دم تک ایک نماز بھی نہ پڑھی میاں نے آج کی گھڑی تک تہجد و اشراق تک قضا نہ کی۔ بیچارہ عابد کہ اگر کوئی یک چشم پاس سے گذر جائے تو سہم کر رہ جائے۔ کہاں بی سائرہ کہ اگر بس چلے تو دوسری بھی پھوڑ دیں۔ وہ رحیم یہ ظالم۔ وہ بھولا یہ مکار۔ وہ خدا دوست یہ خدا فراموش۔ وہ سادہ لوح یہ علامہ۔ وہ فرمانبردار یہ ناہنجار۔ وہ پرہیزگار یہ عیار۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا اور کیا ہوگا۔ خدا ہی اس کشتی کو پار لنگھا دے تو لنگھا دے بظاہر تو یہ ڈوبی اور بیچ منجدھار میں ڈوبی۔

(۱۷)

شاکرہ کی مالی حالت ابتر ہوتے ہوتے اب یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ بعض دفعہ ٹوپی والے کے یہاں سے پیسے آتے تو چولھا سیدھا ہوتا۔ مگر عورت کا سلیقہ بھی عجیب چیز

ہے۔ اور سلیقہ کیا اگر اتنی بھی عاقبت اندیشی نہ ہوئی تو گھر کی بہو بیٹیوں اور بازاری
عورتوں میں فرق ہی کیا رہا۔ آپ کھا لیا پی لیا پہن لیا پھاڑ لیا اولاد کا وقت آیا
تو کنبے کے آگے بھیک مانگنے کھڑے ہو گئے۔ لعنت خدا کی ایسے کھانے پر اور پھٹے سے
مُنہ ایسے پہننے پر۔ شاکرہ اُن عورتوں میں کی عورت نہ تھی جو دوسرے کے آگے ہاتھ
پھیلانے کی ضرورت ہوتی۔ اوّل تو کنبہ ہی کتنا تھا اور جو کچھ تھا بھی وہ کیسا کہ اناج کو
بھی محتاج۔ مل گئی تو کھا لی نہیں یوں ہی پڑے رہے۔ شاکرہ ایک نالائق، بدتمیز
بے ادب لڑکی کی ماں ضرور تھی مگر ایک سلیقہ شعار ماں کی بیٹی اور تمیز دار گھرانے کی
لڑکی۔ گو شاکرہ کے باپ میاں قیوم کا کارخانہ آخر وقت بگڑ گیا وہ بات نہ رہی جو
پہلے تھی۔ پھر بھی دروازے پر نوکر ہمیشہ رہا۔ لڑکا بدنصیب تھا کہ سب پونجی کھو بیٹھا
چلن سے چلتا تو اس کو عمر بھر روٹی کی کمی نہ تھی۔ پل سے آگے بڑھ کر جہاں اب
ریل گودام ہے تمام میاں قیوم کا کٹرہ بس رہا تھا۔ بارہ ہزار روپے پر یہ
کٹرہ ریل کے واسطے دے کر سوداگروں کی گلی آباد کی مگر کچھ ایسی منحوس گھڑی کی یہ
زمین تھی کہ پھر کام بگڑتا ہی گیا۔ آدھے سے زیادہ مکان اُن کے سامنے ہی بک گئے تھے
پانچ ہزار کا قرضہ چھوڑ کر انتقال کیا۔ چار مکان اس میں گئے۔ کل تین مکان اور
چار دکانیں باقی رہ گئیں۔ میاں قیوم رہے نہ وہ کٹرہ رہا۔ گلی البتہ ابتک موجود ہے
شاکرہ کی شادی کے وقت باپ تو موجود ہی نہ تھے مگر ماں نے ایسی اچھی طرح بیٹی کو رخصت
کیا کہ سب واہ واہ کرتے تھے۔ جہیز اور کھانے پینے کا صرف ملا کر دو ڈھائی ہزار روپے
کا بیاہ کر دیا۔ شاکرہ بیاہی گئیں تو خوش قسمتی سے سسرال ملی بھری پُری۔ جہیز کو ہاتھ لگانے
کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔ ایک سے ایک اچھا کپڑا اور زیور میسر ہوا۔ سلیم تو بیوی
کو حکم دے ہی چکے تھے کہ جہیز کے سب جوڑے نکال کر پہن ڈالو۔ شاکرہ اگر میاں
کی عقل پر چلتی تو ساس سسرے بھی اللہ بخشے اس مزاج کے نہ تھے کہ وہ

بہو کو منع کرتے، مگر یہ اس کی عاقبت اندیشی سمجھو یا مصلحت۔ رتی رتی جہیز سینت کر رکھدیا۔ صرف دو جوڑے جو پہلے برس پہن لیئے وہ تو اسکے اپنے تھے۔ پھر تو سائرہ کا پیدا ہونا تھا کہ وہ ہر چیز کو امانت سمجھنے لگی۔

ساس کے سامنے تو سوا دھوپ دینے کے کبھی کپڑوں کے دیکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔ ساس کے پیچھے اب اس مفلسی میں میاں کے سر ہونے سے بعض اوقات خیال آجاتا تھا کہ لاؤ ایک دوپٹہ کا مصالحہ ہی ادھیڑ کر بیچ ڈالوں مگر خست کھویا طبیعت کبھی خیال پورا نہوا۔ تکلیفیں اٹھائیں مصیبتیں جھیلتیں فاقے تو نہیں کیئے۔ رکھی کھائی چٹنی سے کھائی مگر تنکا ادھر سے ادھر نہ کیا۔ جانتی تھی کہ ایک چھوڑ تین بلکہ چار لڑکیوں کا ساتھ ہے۔ میاں نکھٹو بیٹھے ہیں۔ خدا کے سوا کوئی آسرا نہیں۔ آج بیچ لونگی تو کل کیا اور کل کھا لونگی تو پرسوں کیا۔

(۱۸)

واللہ اعلم نسبت تا توں کے معاملہ میں بہکانے سکھانے والوں کو کیا مزہ آتا ہے بیٹا کسی کا بیٹی کسی کی۔ پرائے شگون کے واسطے اپنی ناک کٹانے کو موجود۔ مولوی صاحب کی خدمت میں تو کس کی ہمت تھی جو کچھ بھی کہہ سکتا۔ کہنے کا اثر تو الگ رہا۔ پہلے وہ کہنے والے ہی کی اصلاح شروع کرتے۔ ہاں بیوی کا بھڑکا دینا کوئی بڑا کام نہ تھا۔ عابد کی والدہ ماجدہ معمولی عورتوں جیسی بھی نہ تھیں۔ بڑی نمازی نیک اور پرہیزگار بی بی۔ مگر جس سے سنی شکایت اور جس نے کہا برا۔ یہ بھی تو نہیں کہ خود تحقیق یا دریافت کرتی ہوں۔ بے پوچھے اور بے گچھے اس پر طرہ یہ کہ جان نہ پہچان۔ آنا، برا میاں کرنا اور چلے جانا۔ سنتے سنتے اکتا گئیں۔ بیٹے کی منگنی کیا کی جان کو عذاب لگ گیا ہر وقت اسی پیچ و تاب میں رہتی تھیں کہ کیا کروں۔ جو کہتا ہے برا اور جو بتاتا ہے وہ خراب۔ کہتی ہوں تو مولوی صاحب بگڑینگے۔ نہیں کہتی ہوں تو دل نہیں مانتا۔ ہر طرح

مشکل ہے۔ اُن بیچاری کی جان کو یہ سوچ ایسا لگا کہ پندرہ ہی دن میں بیماروں کی سی صورت ہوگئی۔ عابد کے بیاہ کا یا تو ارمان تھا یا وہ ارمان وبال جان ہوگیا۔ کرنے کی ہمت نہ چھوڑنے کی جرأت۔ کچھ کرتے دہرتے بن نہیں آتی تھی۔ کئی مرتبہ مولوی صاحب نے پوچھا بھی کہ یہ تمہاری کیا کیفیت ہوتی جاتی ہے کوئی علالت ہو تو علاج کرو۔ شکایت ہو تو دوا پیو۔ مگر وہ بیچاری بتائیں کیا اور کہیں کیا۔ سُنا اور چپ ہوگئیں دو تین دفعہ ارادہ کیا کہ کہدوں مگر ایکدفعہ بھی نہ کہہ سکیں۔ بہکانے والوں نے تو بیڑا اٹھایا تھا کہ جب تک منگنی نہ چھٹوالینگے چین سے نہ بیٹھیں گے۔ ایک روز مینھ خوب زور کا برس رہا تھا۔ ایک بڑھیا سی عورت برقعہ اوڑھے ہوئے بھدی جوتی چھپڑ چھپڑ کرتی ہوئی بھیگتی بھاگتی آئی اور آکر بیٹھ گئی۔ بات نہ چیت سلام نہ دعا۔ چھوٹتے ہی کہنے لگی بیوی یہ کیا غضب کر رہی ہو۔ آخر لڑکا تمہارے پیٹ کا ہے۔ سوکن کا جنا تو نہیں جو اسکی مٹی پلید کر رہی ہو۔ اس لڑکی کی زبان الامان۔ محلے والوں سے پوچھو۔ برابر والوں سے پوچھو جاننے والوں سے پوچھو دیکھنے والوں سے پوچھو۔ ایسی بہو خدا دشمن کو نہ دے کون سا عیب ہے جو اس میں نہیں۔ پھوہڑ وہ۔ بدمزاج وہ بے شرم وہ ہاتھ اس کا چھوٹا ہوا۔ زبان اسکی چھوٹی ہوئی۔ ماں کا اس کو ڈر نہیں۔ باپ کا اس کو خوف نہیں بہنوں کی دشمن بھائیوں کی قاتل۔ جس ماں نے جنا پالا پوسا لونڈیوں سے بدتر اسکی اور کر رکھی ہو اٹھتے جوتی بیٹھتے لات۔ بیٹیوں کی کچھ کمی ہے۔ اس وقت اشارہ کر دو تو ایک سے ایک افضل موجود۔ اور پھر جوڑ بھی تو نہیں۔ لڑکا بیچارہ ٹینی اور وہ بنی ہوئی فیل کی فیل۔ بیوی ہمارا کام تو سمجھانا ہے۔ مانو نہ مانو تم کو اختیار ہے۔ حق ہمسایا ماں کا جایا۔ جتانا تھا جتا دیا۔ اب تم جانو تمہارا کام جانے۔

بڑھیا گو فرض ادا کرنے آئی تھی۔ بگڑ بگڑا اسی مینہ میں یہ جا وہ جا ایسی تپا توڑ کر بھاگی کہ سب بلاتے رہے اور اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا شور بہ شور آئی اور چور بچور گئی۔

کپڑوں کا خیال نہ جان کی پروا۔ کڑک کا خوف نہ چمک کا اندیشہ اپنی بات ختم کر اٹھ سیدھی ہولی۔
یوں تو کوئی ایسا ہی بھاگوان دن ہوگا جو ایک آدھ آگر نہ اُکساتا ہو مگر بڑھیا نیکبخت
نے تو سب کے کان کاٹے۔ سچ پوچھو تو عابد کی ماں بیٹے کی منگنی کر کے آفت میں پھنس گئیں
کہاں تک تحمل کیتک برداشت۔ لاکھ سمجھدار تھیں مگر تھیں تو انسان اور انسان بھی عورت
دو دن ہو چار دن ہو ہر وقت کا یہی پیٹنا تھا۔ ایک کہیں دو کہیں جو آتا یہی جھینکتا آخر
اس کے سوا کچھ بن آسکتی تھی نہ بن آئی کہ ادھر تو مولوی صاحب کھانے سے فارغ ہوئے
ادھر بیوی نے سمدھیانے کا دسترخوان بچھایا۔ کہہ سب دیا مگر ڈرتے ڈرتے بیان کل
کر دیا مگر دبی زبان سے۔

بیوی۔ کیا کہوں دلہن کی زبان سنکر تو میری جان نکلی جا رہی ہے اچھی منگنی کی
کہ سارا زمانہ تھڑی تھڑی کر رہا ہے۔ بچے سے لیکر بڈھے تک اپنا اور پرایا آیا اور گیا جو
کہتا ہے وہ برا۔ تم نے ذرا تو تحقیقات کی ہوتی۔ پوچھا نہ گچھا ہاں کر لی۔ بیٹا بیٹی کا بیاہ
اچھی طرح ٹھوک بجا کر ہوتا ہے یا یوں ہوتا ہے۔ سینا پرونا اُسے نہیں آتا۔ پکانا ریندھنا
وہ نہیں جانتی۔ روزے سے اُسے غرض نہیں نماز سے اُسے کام نہیں صبح سے شام ایک کو
مارا ایک کو دھاڑا۔ اس کو گھرک اُسکو ڈانٹ۔ ماں ہے وہ شاکی باپ ہے وہ فریادی۔ خوف
نہیں شرم نہیں حیا نہیں لحاظ نہیں۔ ہاتھ ہیکڑ انہ پاؤں پکیڑا۔ بات بات میں کوسنے
دم دم میں پیٹنا۔ میر دکندے کش کی سالی قسمیں کھاتی ہے کہ ذرا بالی ٹیڑھی ہو گئی تھی
لڑکی نے ہزاروں کوسنے دے ڈالے اور اماں حمایت لیتی رہیں۔ بیٹی کے یہ ڈھنگ اماں کا
یہ رنگ۔ نانی کو تو میں خود جانتی ہوں۔ دم بھر میں چاہے جسکی عزت خاک میں ملا دیں۔
چشم بد دور جو ہے وہ نور علی نور۔ نکاح تو بندھ ہی نہیں گیا کہ ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ منگنی کا
چھوٹنا کوئی بات ہی نہیں ابھی سے جواب دیدو۔ تمہاری یہ راہ ہماری یہ راہ۔ کیوں
اندھا نیوتا اور کیوں دو بلائے۔ تم چاہے کتنا ہی مجبور کرو مجھکو منظور نہیں میں آپ قبر

میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ بچہ نے ایسا کیا قصور کیا ہو کہ اسکی جان پر یہ بلا نازل کر جاؤں نہ میں نے ایسی زبان ستی نہ یہ کلا دیکھا۔ اُن کا انگوٹھی چھلا اُن کے حوالے کرو۔ رہا ہمارا اُن کا خدا دلائے دیں نہ دلائے نہ دیں۔ دس بیس ہی روپیہ پر خیر ہوئی۔

مولوی صاحب۔ ہونا تھا جو ہوگیا اور کرنا تھا جو کر چکیں۔ اب غیبت خدا کا گناہ دنیا کی بدنامی۔ شریفوں کی زبان پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ ان باتوں سے فائدہ کیا۔ اور ان جھگڑوں کا نتیجہ کیا۔ بُری ہے تو دعا کرو بھلی ہو جائیگی۔ ظالم ہے تو خدا سے کہو رحم کرو یگا۔ جس نے تم کو بہکایا بُرا کیا۔ جھک مارا۔ اس کا کیا گیا۔ اپنے اوپر عذاب لیا اور ساتھ ہی تم کو گنہگار کیا۔ لڑکی سے کام ہے وہ ہمارے نام کی ہو چکی۔ اماں سے ہم کو واسطہ کیا اور باوا سے ہم کو غرض کیا۔ عابد کی عمر میں خدا برکت دے تم دیکھنا کیسی تمہاری خدمت کرتی ہے۔ تمہاری لڑکیوں میں کون سے لال لگ رہے ہیں جو تم اوروں میں کیڑے ڈالنے چلیں۔ جیسی آج کل کی بیٹیاں ہوتی ہیں ویسی ہوگی۔

بیوی کو پہلے ہی سے یقین تھا کہ لاکھ سر پٹیوں گی۔ مولوی صاحب کے سامنے خاک نہ چلے گی اور الٹا شرمندہ ہونا پڑیگا اسی سبب سے اندر ہی اندر کھلیں اور میاں کے سامنے نہ کھلیں۔ اتنا کہکر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں نے تو اسی واسطے آج تک تمہارے منہ پر نہیں کہا کہ کتنا ہی کہونگی ہوگا کچھ بھی نہیں۔ بچہ کو تباہ کرنا ہے کرو۔ ایسے بیاہ سے تو کوارا اچھا۔ وہی ڈاکٹر صاحب کا گھرانا ہے کہ چچا باوا سے پانچ برس مقدمہ لڑا اور آخر مکان دینا ہی پڑا۔ اسلام کی مسلمانی میں لڑکی کی نانی نے کیا آفت مچائی ہے کہ سب نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ ذرا کھانے کو دیر ہوگئی تھی ہزاروں فضیحتیاں کر ڈالیں۔ اُن کے ہاں کی زبانیں تو آج شہر بھر میں مشہور ہیں۔ خیر میں تو کچھ نہیں کہتی جو تمہاری سمجھ میں آئے وہ کرو۔"

مولوی صاحب۔ تم کو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکیں مجھ کو جو سننا تھا میں

سن چکا۔ عابد کی تقدیر میں جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ جو ہر شرافت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ ہمارے ہاں آکر انشاء اللہ سب درست ہو جائے گی۔

مولوی صاحب یہ کہکر باہر گئے۔ بیوی بیٹھ کر سوچنے لگیں کہ اب کیا کروں تھوڑی دیر بعد خود ہی کہنے لگیں میں نے کیوں اپنے پیچھے خواہ مخواہ کا غم لگایا جب اُن ہی کو پرواہ نہیں تو میں کیوں فکر کروں میں نے بھی صبر کرلیا۔

(۱۹)

منگنی کا ہونا تھا کہ سائرہ بالکل ہی کھل کھیلی شرم لحاظ تو پہلے ہی جا چکا تھا۔ جو کچھ تھوڑی بہت جھجک سی باقی تھی وہ بھی گئی گذری ہوئی۔ افعال جو پہلے تھے وہی اب بھی رہے مگر فرق اتنا تھا کہ پہلے بظاہر نہیں تو دل میں۔ قائل نہیں تو نادم ہو جاتی تھی۔ افیون کے بعد اتنا بھی نہ رہا۔ اب جو کچھ کرتی وہ علانیہ اور جو کچھ کہتی وہ کھلے خزانے دادی کے سامنے جو رنگ روغن ڈیل ڈول تھا اُن کے بعد آدھی بھی نہ رہی۔ بیچ کے دنوں میں اور بھی زیادہ جھٹک گئی تھی۔ مگر منگنی کے بعد جو تیار ہونی شروع ہوئی تو گھڑیوں اور گھنٹوں بڑھنے لگی۔ ماں کے سر پر ایک اور فکر سوار ہوا کہ بنا بنایا جہیز سب بے کار۔ جہیز کے کپڑوں میں کچھ گنجائش ضرور رکھی جاتی ہے مگر نہ اتنی کہ محرم گلے میں آجائے۔ پاجامے کی ایک موری دو ٹانگوں کو کافی ہو۔ دوپٹے یا ڈھیلے پائچوں کے پاجامے تو خیر ایسی چیز تھے کہ سائرہ اتنی کیا اگر اس سے دگنی اور تگنی موٹی ہو جاتی تو کسی نہ کسی طرح کھپ جاتے مگر تنگ پاجاموں اور چھوٹے کپڑوں کا کیا انتظام جو دیکھتا وہی نام رکھتا۔ جہیز کی چیز کس کو نہ دکھائی جاتی کس کو منع کیا جاتا۔ کس کس کا منہ کیلا جاتا۔ سارا زمانہ ہی دیکھتا اور تمام دنیا ہی ہنسی اُڑاتی۔ شہر میں بدنامی کنبے بھر میں رسوائی۔ بے وقوف بنے۔ پھوہڑ بنے الٹی ٹانگیں گلے میں آجائیں۔ اتنا پاس نہیں کہ از سر نو تمام جہیز

تیار رہو۔ یہ جی نہیں چاہتا کہ شربت کے پیالے پر نکاح پڑھا دوں۔

سائرہ جوں جوں موٹی ہوتی جاتی شاکرہ کی ہڈیاں نکلی چلی آتی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا تدبیر اور خاک عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کیا علاج کرے۔ عقل کی دشمن نے تجویز سوچی تو یہ کہ کھانے میں کمی کر دوں۔ دو دو وقت اور تین تین وقت اوبالا کبھی آدھا کبھی پاؤ نکالا اور دے دیا۔ مگر اس کو تو خوشی ہی اور سمائی ہوئی تھی اس سے ہوتا کیا تھا۔ شاکرہ کی تقدیر میں ایک یہ تکلیف بھی لکھی تھی۔ پندرہ بیس دن تک آپ بھی روٹی کم کھائی بچوں کو بھی کم کھلائی۔ سائرہ پر رتی بھر بھی اثر نہ ہوا۔

سائرہ کے ساتھ سلیم بھی اگرچہ موٹا تو نہ ہو رہا تھا مگر خوش ضرور تھا۔ اور اس خیال سے اس کی خوشی حق بجانب تھی کہ خدا نے اتنے بڑے فکر سے رہائی دی۔ حالانکہ ابھی سوت نہ کپاس کولہو سے لٹھم لٹھا۔ منگنی ہی منگنی تھی مگر سائرہ کی تو منگنی پر بھی سو شادیاں قربان تھیں اس کے بیاہ کی جستجو تو سب کو تھی مگر امید کس کو رہی تھی۔ باپ اس سے نا امید۔ ماں اس سے مایوس۔ رہیں ممانیاں اُن کی بلا پوشش سے۔ ہو تو یکساں۔ ہونے کی خوشی نہ ہونے کا غم۔ ہوئی تو ایک فکر ہی لگا۔ دل سے نہیں دکھانے ہی کو سہی۔ خوشی نہیں مجبوری سے۔ غرض ظاہرداری۔ دنیا داری کچھ ہی سہی۔ جوڑ انہیں چالا تو کرنا ہی پڑے گا۔

نانی نے اپنی عاقبت اندیشی سے ایک چادر جوڑا تانبے کے بیس برتن پاؤں کی تین تین جوڑیاں اور جوشن لگا رکھے تھے۔ چار چیزیں۔ چار لڑکیاں حساب ٹھیک ہو گیا۔ یہ ہی بیٹے سے کہہ چکی تھیں کہ اگر میں خود زندہ رہی تو خیر۔ مر گئی تو ایک ایک چیز ایک ایک لڑکی کو دیدینا۔

برتن تو شاکرہ کے پاس یوں بھی کم نہ تھے۔ سو سوا سو اپنے جہیز کے ساٹھ ستر کے قریب ساس کے جہیز میں تو بڑے چھوٹے سب ہی قسم کے تھے مگر گھر کے برتن گو مستعمل ضرور تھے۔ لیکن ایسے ایسے جنگی کہ ایک ایک کی قیمت میں بھی اور وزن میں بھی معمولی دو دو تین تین آجائیں۔ تقسیم کے وقت صرف تانبا ہی ڈہائی سو روپے کا آنکا گیا تھا۔ سلیم نے تو برتنوں کو فضول ہی کہہ دیا تھا۔ مگر شاکرہ کی آنکھوں پر پردے نہیں تھے کہ بیٹیاں تین چار آگے اور برتن ایک بھی نہ لے۔ بیوی کی زبردستی سے سلیم نے برتن لے لیئے۔ مگر جب ذرا تنگی ہوئی اور بیچنے کا ارادہ کیا کوئی اور چیز ایسی نظر نہ آتی تھی وہی آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ شاکرہ نے بیسیوں لڑائیاں سر کیں۔ سینکڑوں مرتبہ جیتے۔ ہزاروں باتیں سنیں جب برتن بچائے۔

سلیم تو اس مزاج کا آدمی ہی نہ تھا آج کیا اور آج کے دس برس بعد کیا چار کیا اس کے ہاں اگر کوڑی بھر بیٹیاں ہو جاتیں تو اس کی بلا سے۔ آفت تو شاکرہ کی تھی دن رات اسی سوچ میں غرقاب تھی۔ جانتی تھی اور سچ سمجھتی تھی اور ٹھیک کہ میاں تو مرد ہو کر چھوٹ جائیگا کمبختی میری ہے طعنے پڑینگے تو مجھ پر۔ باتیں سنونگی تو میں۔ رچی جلیگا تو میرا۔ خلق کا حلق بند تھوڑی کر دونگی۔ کہیں گے اور بجا کہیں گے۔

شاکرہ کو یہ سہم ایسا چڑھا کہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ کوئی لمحہ ایسا نہ جاتا تھا جو ان تفکرات سے چھٹکارا ہو۔ جاگ رہی ہے تو ان ہی خیالات میں مستغرق۔ سو رہی ہے تو ان ہی خوابوں میں بیہوش۔ اول تو نیند ہی بالکل اڑ گئی تھی۔ پلنگ پر لیٹی اور جھکڑ بندھا۔ دو دو بج جاتے تھے اور نیند نہ آتی تھی۔ تین بجے کے قریب ذرا آنکھ لگی۔ نماز کے وقت اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی آٹا گوندھ روٹی ڈالی۔ منجھلی نے مصالحہ پیسا۔ چھوٹی نے برتن دھوئے۔ آپ روٹی پکا چکی۔ گوشت ہوا تو وہ بگھارا نہیں دال چڑھائی۔ نو دس بجے تک فارغ ہو ہوا تیلیاں کھولیں اور لیکر بیٹھ گئی۔

کچھ کترا کچھ پھاڑا کچھ ادھیڑا کچھ ٹانکا۔ ایک چیز تیار کی اور الگ رکھدی۔
عورتوں کا جھگڑا ہندوستان کی رسمیں۔ شہر کا رواج ایک چیز ہو تو کہی جائے چادر
اور تکیے غلاف اور گردیاں، کسنے اور سوزنیاں سب ہی ہو۔ کچھ خدا ہی کا کرم تھا
ورنہ شاکرہ تو ان ہی فکروں میں ختم ہو جاتی۔ بہرحال جو جو کچھ چاہتی تھی اور جن جن
چیزوں کی ضرورت سمجھتی تھی سب ہی نکل آئیں۔ بڑھانا گھٹانا تو بیشک پڑا مگر ہو
سب گیا۔ اپنے دم پر مصیبت اُٹھائی۔ ہاتھ پاؤں چلائے لیکن اللہ کی بندی نے
کتر بیونت کر کرا سب ٹھیک کر لیا۔ تھوڑی سی کسر رہ گئی مصالحہ کچھ پرانا ہو گیا کچھ
بے آب ہو کر خراب۔ پکوانا چاہا تو اونے پونے روپے کے آٹھ آنے اور دس آنے۔
اب کمی پوری ہو تو کس طرح۔ دو جوڑوں کا ایک جوڑا کیا مگر کیا ایسا کہ دیکھنے سے یہ ہی
معلوم ہوا کبھی تہ بھی نہیں کھلی۔

سلیم کی باتوں پر کچھ غصہ بھی آتا ہے کچھ ہنسی بھی۔ لاکھ مرد تھا مگر تھا تو باپ اولاد
تو دونوں ہی کی تھی مگر وہ اللہ کا بندہ تو اس طرح الگ تھلگ رہا گویا اس سے واسطہ د غرض
ہی نہیں۔ فکر کرنے کی عادت نہیں۔ کیا نہ جانا۔ ہاتھ بٹانے سے معذور۔ روپے پیسے
سے مجبور، جیتی ہوئی شاکرہ بہت بگڑی بگڑائی تو ایک آدھ کام بازار کا کر دیا۔ وہ بھی اس
طرح کہ خریدنے کا ہوا تو پیسہ کا ڈیڑھ پیسہ دے آئے۔ بیچنے کا ہوا تو پیسہ کا دھیلا کر لائے
اب بیوی کتنا ہی چیخے پیٹے میاں میں اتنی ہمت نہ عادت کہ پھیرنے جائیں۔

(۲۰)

کاسنی پھولدار کریب کے دوپٹے پر کارچوبی ٹھپا ٹکا ہوا صندوق ہی میں
رکھا رکھا بالکل بیکار ہو گیا۔ برسات کے دن تھے ٹپکا لگا اور تمام پانی
دراڑوں میں سے صندوق میں۔ ٹھپا تھا اطلس کا پھولسرے نکل آئے۔ ڈہائی
پاٹ کا ریشمین دوپٹہ بالکل ٹاٹ ہو گیا کپڑا ہی کام کا رہا نہ مصالحہ ہی۔ چوتھی کے

کارچوبی جوڑے کو چھوڑ کر شاکرہ کے جوڑوں میں سب سے بھاری دوپٹہ یہ ہی تھا۔ تحصیلدار کے ہاں چھیٹی میں گھنٹہ بھر کے اوڑھنے کی گنہگار تو ضرور تھی وہ بھی ساس کی زبردستی اور سسر کی تاکید سے (خدا جانے شاکرہ دھوپ دینے کے واسطے بھی کس دل سے کپڑے باہر نکالتی تھی)، ڈولی سے اترتے ہی دوپٹہ اس طرح اتار کر رکھا گویا مانگے کا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن سر پر ڈالنا کیسا۔ دھوپ دینے کے سوا ہاتھ لگانا بھی قسم تھا اس مصیبت سے تو سینتا اور اس حفاظت و کفایت شعاری سے رکھا مگر ایک ذرا سی لاپروائی کا نتیجہ ہوا کہ اتنا بھاری دوپٹہ بالکل ناس ہو گیا۔ خیر یہ ہوئی کہ پانی کا اثر اور کپڑوں پر نہ پہنچا (صندوق میں کپڑے ہی کپڑے بھرے تھے۔)

لاہوری چوڑیئے کا ایک ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ کیڑے نے چھلنی کر ڈالا۔ اوپر ایک سحرم کرتی دو تین دفعہ کی پہنی ہوئی نکلی۔ غرض جوڑا پورا ہو گیا۔ ارادہ کیا کہ گھر بیٹھ بکوا لوں۔ اس قسم کے کپڑے گھر میں پہنے نہیں جاتے کہیں آنے جانے میں پہننے کے قابل ہوتے تو شاکرہ ہی کیوں بیچتی۔ دو بوٹے دو سو روپے کی لاگت کا جوڑا چالیس روپے کا آنکا گیا ماں بھی آئی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں شاکرہ اگر مصالحہ ہی اُدھیڑ کر بیچیگی تو پچاس ساٹھ کا بک جائیگا۔ تمہارے بھائی کے ہی ہاتھوں پچاس روپے فقط دوپٹے کے ٹھیکے کے گئے ہیں اور کسی کے ہاتھ کا کام بھی نہیں ہے۔ جو کہوں بیچ میں رکھ لیا (ٹھنڈا سانس بھر کر)، میں نے بیچنے کو تھوڑی دیے تھے۔ ایک جوڑا اپنے لیے رکھ لو۔ آخر اپنی بھی جان ہے۔ یا نہیں ایسا بھی کوئی اپنے تئیں خاک میں نہیں ملاتا۔

شاکرہ ۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میرے سب ارمان پورے ہو گئے۔ خدا اُن دونوں کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ جتنا میں نے اوڑھ پہن لیا۔ اگر اس سے آدھا یا دُ بھی ان کو نصیب ہو جائیگا تو میں جانونگی سب کچھ بھر پایا۔

ماں ۔ خیر اگر بیچنا ہی ہے تو مصالحہ اُدھیڑ کر بیچو۔ رہا کپڑا چھیٹی میں کام آجائیگا۔

تجویز معقول تھی اور صلاح مناسب۔ میاں سلیم کو جوڑا دیا گیا کہ بازار میں جا کر انکوالائیں اگر دام اچھے اٹھیں تو خیر نہیں مصالحہ علیحدہ لیجا کر بیچدینا۔

سلیم ماشاءاللہ ضرورت سے زیادہ فہیم۔ عقل کے پورے محبت کے بھوکے مروت کے بندے جوڑا لے کر چلے۔ گلی کے نکڑ ہی پر تھے کہ ادھر سے جانکی صراف چلم بھر کر لا رہا تھا بغل میں پوٹلی دیکھ کر بنیئے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگے میاں جی کدھر سواری چلی؟

سلیم۔ ذرا اس جوڑے کو دکھانے جاتا ہوں۔ لو تم ہی آنکو۔

جانکی۔ (جوڑا کھولکر) بھلا سرکار ہمارے ہوتے دوسرے کے پاس جانا۔ جوڑا اپنے پاس رکھیئے اور جو ضرور ہو وہ لیجائیے۔ ابھی تو بھگوان کی کرپا سے دو چار روپے کا اثاثہ لگا ہوا ہے۔ بڑے ڈاکٹر صاحب نے لالجی کا کھاتہ دو دو برس پیچھے صاف کیا ہو کیا مقدور جو کدھی چھدام کا بل نکلا ہو۔ دو چار روپوں کی خواہش ہو تو لیجائیے۔ دس بیس چھئیں تو آج کی آج چلکے ہو رہیئے۔ کل ستی کی تمہارے گلام کی سگائی ہے۔ تم جا نو جبرا گریب آدمیوں کا ایسا ہی حساب کتاب ہوتا ہے۔ دکان میں تو اس وخت ایشور کا نام ہے بس یہ روپے چار ایک کا پیسوں کا ڈھیر سمجھ لو۔ کل سانج کو رام چاہے دیدونگا۔

سلیم۔ اچھا تم دام تو لگاؤ۔

جانکی۔ داموں کا کیا ہے جو کہیئے گا وہ دیدونگا۔ یہ تھوڑی ہے کہ آپ کی کوڑی بے ایمانی سے رکھ لوں۔ پیسہ کا مال ہوا وہی پیسہ لے لینا۔

سلیم۔ سو روپے تو اس کے مل رہے ہیں۔

جانکی۔ اجی ڈاکٹر صاحب رام کا نام لو (جوڑے کو الٹ پلٹ کر) سو روپے کا اس میں کیا رکھا ہے جو مال دلوائے وہ لے لو۔

سلیم۔ آخر تم بھی کچھ کہو گے؟

جانکی (کچھ سوچ کر) روپے بیس ایک کا مال تو دھنیا میں سمجھ لو اور کوئی روپے

بارہ ایک کا اس میں۔ دس روپے کی یہ لگا لو۔ بیالیس ہوئے اور روپیہ دھیلی بڑھتی لے لو تینتالیس سے بڑھتی کی جمع نہیں ہے جہاں مزاج چاہے دکھا لو۔ کہنے کو سو کیا پان کہہ لو مال تو اتنے ہی کا ہے۔

سلیم۔ لالہ ہوکس ہوا ہیں۔ سو روپے تو لگ چکے اور نہیں دیا۔

جانکی۔ اجی کیوں ہنسی بازی کرتے ہو۔ دوسری جگہ یہ بھی نہیں ملنے کا۔ تیرہ آنے تو یہ مال آ رہا ہے۔ گیارہ آنے کا بھاؤ چاندی کا ہی۔ پونے گیارہ کے میں نے دام لگا دیئے تھوڑے ہیں اور کیا سرکار کسی کو لوٹو گے۔ بارہ آنے تو کھری چاندی آ رہی ہے ڈلے کی۔ آجکل اس جھنجھٹ میں پڑتا کون ہے تینتالیس کے آگے کوئی سوا تینتالیس لگا دے تو پنچیں کا دیندار میں رہا۔ سو روپے کا تو نیا مصالحہ بھی اس میں نہیں ہے۔ بہت ہوگا تو ساٹھ کا ہوگا۔ روپے کے تیرہ آنے دے رہا ہوں۔ آج تک سنے بھی ہیں۔ دکھا کر تو دیکھو پینتس کا بھی کوئی گاہک نہیں ہوگا۔ تینتالیس کا بھی میں ہوں۔ گھڑی بھر بعد جو بزاز دے گا وہ میں دونگا۔

سلیم۔ اچھا پورے پچاس دو تو لے لو اور نہیں تو میرے حوالہ کرو۔

جانکی۔ پنچیں کیا میں تو کہتا ہوں سو لے جاؤ روپے ہی سینکڑہ کا بیاج دینا چیز بھی نہ لاؤ یوں ہی لیجاؤ۔ اسکے تو تینتالیس سے ادھی اوپر تینتالیس بھی نہیں ہوتے مال کا مول نہیں تمہارا مول ہی۔ تم دکانداری کر رہے ہو اور میں گھر کی سی بات سمجھ رہا ہوں۔ دس برس کے لڑکے کے ہاتھ بھی کوئی چیز بھیجدو گے تو پیسہ کا فرق نہیں نکلے گا۔ اگر ایسے روپے دو روپے پہ نیت ڈانواڈول کریں تو ساہوکار کیا ہوئے چمار ہوئے۔

قصہ مختصر جانکی مل کی عنایت نجیب وضعداری یا میاں سلیم کی خاطرداری غرض سو روپے کا مال پینتالیس روپے نذر کیے۔ سلیم دنیا بھر کے سیدھے جانکی

سارے جہان کا سُر تا سلیم روپے ہی گن رہے تھے کہ اس نے دیا جامے میں نون باندھنے کی بھی جگہ نہ تھی) مصالحہ نوچ - دیا سلائی دکھلائی -

سلیم روپے لیکر چلے - دس ہی قدم گئے ہوں گے کہ میاں عیار دکھائی دیے عیار شہر بھر کا چُھٹا ہوا بد معاش، شراب وہ پیتا جوا وہ کھیلتا - لوگوں کو آسامی وہ بناتا - فقیر وہ بنتا - ولی وہ بنتا - غیب کی باتیں وہ بتاتا - غرض کوئی عیب ایسا نہ تھا جسکی کسر ہو - سلیم کے ہاتھ میں روپوں کا رومال دیکھ کر عیار کے کان کھڑے ہوئے - سلیم کمبخت ایک خوش عقیدت آدمی - نہ معلوم عیار کو کیا سمجھے ہوئے تھا - شکل دیکھتے ہی اس طرح مصافحہ کو لپکا کہ رومال بھی ہاتھ سے گر پڑا - مگر اس نے جب تک ہاتھ نہ چوم لیے رومال نہ اٹھایا -

روپے بندھے ہوئے تھے تو عیار کو کچھ شبہ بھی تھا - رومال کا گرنا تھا کہ چھنا کے کی آواز کان میں پہنچی - آواز کا آنا تھا کہ طبیعت خوش ہوگئی - گو رومال ابھی تک سلیم ہی کے ہاتھ میں تھا مگر عیار آواز سُنتے ہی دل میں کہہ چکا تھا کہ روپے میرے اور میرے باپ دادا کے - سلیم کے پاس امانت ہے اور تھوڑی دیر رکھکر جی خوش کر لے - آج کس بھاگوان کی صورت دیکھی تھی کہ ایسا گانٹھ کا پورا، آنکھوں کا اندھا ہتّے چڑھا - تین چار دن سے پریشان پھر رہا ہوں - تیری شان بھی عجیب ہے - کہاں روزی پہنچائی ہے -

عیار - بچہ اچھا ہے - تو تو بہت ہی دبلا ہوگیا - باپ کے مرتے ہی سارے کنبہ کا بوجھ تجھپر آ پڑا کیا حال ہے ؟

سلیم - شاہ صاحب ! کوڑی کوڑی سے تنگ ہوں - روٹی بھی مشکل سے پیٹ بھر کر نصیب ہوتی ہے کچھ بتائیے -

عیار - تیرے باپ نے ہماری بہت خدمت کی ہے - جیسی اس نے اطاعت کی

پروردگار نے اسکو برکت دی - وہ بہت اچھا رہا - یہاں بھی اچھی گذار گیا وہاں بھی خوش ہے تو اس کے بعد کبھی ہم سے ملا تک نہیں آپ تکلیف اٹھائی ہمارا کیا لیا

سلیم - حضور میرے قصور کو معاف کیجئے اور مجھپر رحم کیجئے - بیٹی کا بیاہ سر پر چلا آرہا ہے - کوڑی پاس نہیں دن رات اسی فکر میں گھلا جاتا ہوں - ذرا اشارہ کردیجئے تو بیڑا پار ہوجائے

عیار - بچہ کیمیا سے تو ہم نے توبہ کرلی - تیرے باپ کی ایسی ہی خاطر تھی - اس کو ڈیڑہ پاؤ سونا بنا دیا تھا - تو نے اپنی ماں کے ہاتھ میں ٹھوس کڑے دیکھے ہوں گے - اب ہم نے عہد کرلیا کہ یہ کام نہ کرینگے -

سلیم - تو کوئی تعویذ ہی ایسا دیجئے کہ اللہ چھپر پھاڑ کر دے اس وقت تو میں بغیر کچھ لیئے نہ چھوڑوں گا -

عیار (مسکرا کر) اچھا ایک بات تو ہم بتانے ہیں مگر دیکھ خبردار! جو کسی سے ذکر کیا ہوگا تو جانے گا - جا سٹے میں چلا جا - بیس بیس روپے کے دو داؤں لگا - نمبر ہم تجھکو بتا دینگے دو دو ہزار روپے مل جائینگے - سو روپے اللہ کے نام کے دیدیجیو - تو ہمارے دوست کا بچہ ہے وہ ہمارا منہ بولا بھائی تھا - ہم تجھ سے کچھ نہیں لینگے - مگر سن پہلے پکا ہولے سو روپے اللہ کے نام کے دینے پڑینگے روپیہ ہاتھ میں آکر بہت مشکل سے نکلتا ہے جا ۸۲ ۱۱ - اور ۱۲۰ پر لگادے سیدھا چلا جا - تیرے پاس روپے کم ہوں تو ہم سے لے لے -

سلیم - چالیس روپے تو میرے پاس ہیں -

عیار - اچھا تو تیچھے پیچھے چلا آ -

لہ سٹا ایک قسم کا جوا ہے جو کلکتہ اور بمبئی اور دلی میں کثرت سے کھیلا جاتا ہے - بمبئی اور کلکتہ کا حال تو معلوم نہیں مگر دلی میں اس موذی کھیل نے یہانتک ترقی کی ہے کہ متفوک الحال اور مبتذل عورتوں نے دن بھر مزدوری کی شام کو لگا آئیں اور رات کو بھوکی پڑ رہیں -

عیار کے منہ سے چار ہزار روپے کا سننا تھا کہ سلیم کی باچھیں کھل گئیں۔ عیار ادھر اُدھر کے چکر دے دلا کر ایک کٹہرے میں لیگیا۔ چالیس روپے منگوا لیئے۔ ہنڈی کے دو پرزے حوالے کیئے اور کہدیا پہلی تاریخ کو روپے آکر لے جانا۔

پہلی کا نام سنکر تو میاں سلیم کچھ سٹ پٹائے مگر عیار وہ افعی تھا کہ اس کا کاٹا پانی نہ مانگے۔ بدمعاش نے غریب کو وہ سبز باغ دکھایا کہ سکین نے خوش خوش گھر کا راستہ لیا۔

عیار کی سانٹھ گانٹھ سٹے والوں ہی سے کیا تمام شہر کے بدکرداروں سے تھی۔ چور اس کو مال پہنچاتے۔ جواری اس کو نال پہنچاتے۔ کہیں چوری ہو کہیں جوا۔ عیار کا حصہ پہلے۔ اس بات کا پتہ چلانہ چلانے کی ضرورت ہوئی کہ عیار کے پلّے کیا پڑا۔ بہرحال شاکرہ کا مال جانا تھا گیا۔ جوڑے کو آگ لگنی تھی لگی۔ سلیم اچھلتے کودتے وہ دو نو پرزے چک کھو ہنڈی کھو نوٹ کھولیکر گھر پہنچے۔ بیوی نے سنکر سر پیٹ لیا۔ ساس چپ کی چپ رہ گئیں۔ اس کے سوا اور ہو کیا سکتا تھا کہ رو دھو کر صبر کر لیا۔

بیٹی ہو تو سائرہ جیسی کہ ماں اور باپ بہن اور بھائی نانی اور ممانی سب پریشان ہو گئے اور باپ ہو تو سلیم جیسا لانے سے گیا کمانے سے گیا۔ اپنے پاس سے بنانے سے گیا۔ بیوی نے اپنی ناک کو جو کچھ کیا اُسے بھی خاک میں ملا دیا۔ یہ مشکل ہے کہ سلیم کی نیت میں فتور نہ تھا تو وہ قصور وار ہی نہ سمجھا جائے۔ آٹھ دس روز بعد پہلی بھی ہو گئی۔ یوں میاں سلیم کو ایک ایک دن ایک ایک سال گزر رہا تھا مگر اس دن تو تمام رات جاگ کر کاٹی۔ بیچین تھا کہ کب صبح ہو اور کب روپے لاؤں روپوں کے واسطے بیوی سے شام ہی کو ایک روپیہ نکلوا لیا تھا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو سٹے پہنچے وہاں کیا دھرا تھا۔ آڑتی نے کہدیا منبر دوسرے

نکلے ہیں۔اب کیا کرتے بولتے تو پٹتے۔مال جا ہی چکا تھا۔شاہ صاحب کی بدولت عزت بھی رخصت ہوتی۔جلا ہوا شاہ صاحب کے پاس آیا۔شکایت کی تو گھرکیاں کھائیں۔عرض حال کیا تو گستاخ بنا۔شاہ صاحب فرمانے لگے۔

"بچہ ہم کیا کریں۔تیری تقدیر جا اب خیر اسی میں ہے، چلا جا بددعا نہ لے"

شاکرہ زن ناقص العقل سمجھی جا سکتی تھی مگر میاں کی طرح لاعقل نہ تھی کہ عیار کا فرمان توبہ توبہ حدیث و قرآن سمجھ لیتی۔سلیم کی رام کہانی سنتے ہی اس نے کہدیا تھا میں دیوانی ہوں جو ان ڈھکوسلوں میں آجاؤں۔ایسی ایسی کراماتیں بہت سی دیکھی ہیں۔اس کی قسمت کا تھا جوتیاں ماریں اور لیا۔شاکرہ کی رائے نہایت سلیم تھی مگر پھر بھی تو عورت ہی۔کچھ روپیہ کا لالچ کچھ میاں کی ترغیب و تحریص یقین تو نہ اول آیا نہ آخر مگر اتنا خیال ضرور پیدا ہو گیا کہ شاید اسی بہانے خدا کو کچھ بہتری کرنی منظور ہو۔اماں جان کے ہاتھوں میں کڑے تھے تو سہی یوں تو اُن کے پاس اور بھی بہت سا گہنا تھا مگر جیسا دمکتا ہوا سونا کڑوں کا تھا ایک چیز کا بھی نہ تھا اور کڑے تھے بھی تو کب کے جب ابا جان کو پینتالیس ہی روپے ملتے تھے۔گھر ہی کا خرچ مشکل سے چلتا کڑے تو کہاں سے بنتے۔فقیروں سے بھی اُن کو سدا شوق ہی رہا۔کوئی اٹھواڑہ ہی ایسا جاتا ہوگا جو دو ایک فقیر نہ آتے رہتے ہوں۔کیا تعجب ہے جو کڑوں کا سونا ان ہی شاہ جی کا دیا ہوا ہو۔یہ بھی تو ایسے بیوقوف نہیں کہ بھر مٹھی روپے پھینک آتے۔کچھ تو سمجھ کر دیے ہی ہونگے۔خیر پہلی ہی میں کتنے دن ہیں آج چوبیس تو ہو ہی گئی پانچ چھ دن اور سہی پہلی سے ایک دن پہلے سلیم کو تو پہلی کا ہونا قیامت ہی تھا۔شاکرہ کی کیفیت یہ تو نہ تھی مگر دل کو اسکے بھی لگ رہی تھی کہ کب پہلی ہو اور نتیجہ نکلے۔

صبح ہی میاں سلیم تو بیقرار ہو کر سٹے میں گئے اور شاکرہ بے چین ہو کر میاں کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

سلیم نے سٹے کے جواب اور شاہ صاحب کے عتاب دونوں سے کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں فرصت پائی، گھر آیا تو کچھ ندامت کچھ لحاظ کچھ خوف کچھ افسوس اندر آنے کی ہمت نہ پڑی۔ دروازے میں ٹھٹکا۔ پھر دل کڑا کیا اور آگے بڑھا۔ بیوی کی آنکھیں دروازے کو لگ ہی رہی تھیں جو میاں خالی ہاتھ ہلاتے وارد ہوئے۔ دوپٹہ کندھے پر پڑا تھا بیوی اتنی دیر میں چار ہزار روپے کا حساب کتاب پورا بھی کر چکیں تھیں کہ میاں نے آکر ناکامی کا مژدہ سنایا۔ یہ میاں سلیم کی دوسری عقلمندی تھی کہ مایوس ہوئی ہوائی بیوی کو پھر امید دلا کر ایک جھگڑا مول لیا ورنہ شاکرہ اسی روز نا امید ہو چکی تھی۔ کر چکی جو کچھ کرنا تھا اور کہہ چکی جو کچھ کہنا تھا۔ وہ بیٹھی چیختی رہی اور سلیم لیٹے سنتے رہے۔ شاکرہ نے اس وقت جتنا کچھ بھی کہا اور جس طرح بھی کہا ضرورت سے زیادہ کہا اور حیثیت سے بڑھ کر۔ لیکن جو بات کہی وہ پتہ کی اور جو فقرہ کہا وہ درست۔ آخر یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔ خیر خدا کا شکر ہے اسی میں کچھ بہتری تھی۔

پندرہ بیس روز تک تو دونو میاں بیوی ذرا رُکے رُکے رہے مگر تا بکے رفتہ رفتہ دونوں ٹھیک ہو گئے۔ اسی کا نام دنیا ہے۔ خوشی ہو یا غم دونوں کا اثر کم ہوتے ہوتے زائل ہو جاتا ہے۔ ابتدا ہی میں خوشگوار و ناگوار سمجھ لو پھر جہاں طبیعت عادی ہوئی اور مساوات ہو گئی۔

(۲۱)

سائرہ کی منگنی کو پانچواں یا چھٹا مہینہ ہوگا کہ مولوی ہادی علی صاحب کی بڑی لڑکی جو شہر سے بیس اکیس کوس باہر بیاہی ہوئی تھی میکے آئی۔ جس دن سے ماں باپ کے آنے کی خبر سنی تھی۔ ملنے کے واسطے دل پھڑک رہا تھا مگر کچی سڑکیں برسات کا موسم بیچ میں پڑتا تھا دریا بیس بائیس کوس کی مسافت بڑھی ہوئی ندیاں چڑھے ہوئے نالے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ گھر سے نکلنے کا نام لیتا ایک ندی تو گھر

سے تین چار ہی میل پر تھی اور ایسی قیامت خیز کہ کوئی ایسی ہی مبارک برسات ہوگی جو آس پاس کے دو چار گاؤں غرقی میں نہ آجاتے ہوں۔ خون خشک ہو رہے تھے کہ کہیں خیر سے یہ دن گزریں۔ بارش کی یہ کیفیت تھی کہ اسی اسی برس کے بڈھے کہتے تھے ہم نے آج تک ایسا پانی نہیں دیکھا۔ دو دن چار دن دس دن بیس دن کی جھڑی تو دیکھی ہے۔ یہ کہیں نہیں سُنا کہ پھر ساون بھادوں دھوپ ہی کی شکل کو ترس گئے۔ اساڑھ سے لیکر کنوار تک شاید ہی کوئی دس دن ایسے نکلیں گے کہ مینہ نہ برسا ہو وہ تو کچھ گاؤں کے کچے مکانوں ہی کو خدا نے یہ طاقت دیدی کہ ہائیں دہائیں مینہ برس رہا ہے مینہ بھی ہے ہوا بھی اور کھڑے ہیں۔ شہر کی نازک مزاج محلسرائیں تو کبھی کی بیٹھ چکی ہوتیں۔ رَو آئی اور جس قدر اندیشہ تھا اتنی ہی آئی۔ جان کا نقصان تو نہیں ہوا مگر زراعت تمام غارت ہوگئی۔ دریاباد تو بالکل ہی تباہ ہوگیا۔ مگر صرف دہقانوں کی نادانی۔ شام تک نالے کا پانی سوا نہ تک آگیا۔ پھر بھی چارپائیاں بچھا بچھا لمبی تان سو رہے۔ بارہ بجے کے قریب جب آنکھ کھلی ہے تو پانی گھروں کے اندر تھا دیہاتی ہوں یا شہری گھر کے جھگڑوں کی بیسیوں چیزیں ہوتی ہیں اس بے اوسانی میں کیا کیا سنبھالتے۔ پھر بھی جو جس کے ہاتھ آیا نکل کھڑا ہوا۔ یہ بھی خدا کا شکر تھا کہ موضع کا ایک حصہ اونچا تھا۔ ٹیلوں پر سے چڑھ چڑھ کہ دوسرے گاؤں میں پہنچ گئے۔ خدا وہ دن دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ کیا نفسی نفسی کا عالم تھا الٰہی توبہ۔ رات کا سناٹا۔ ہوا کا فراٹا۔ مینہ پڑ رہا۔ بجلی چمک رہی بادل کڑک رہا۔ چاروں طرف اندھیرا گھپ۔ جا بجا ٹیلے۔ مردوں کی لاپروائی نے عورتوں کو یہ دن دکھایا۔ گود میں بچے بغل میں پوٹلیاں۔ ٹخنوں ٹخنوں پانی گرتی پڑتی چلی جارہی تھیں صبح تک تو تمام دریاباد میں پانی ہی پانی تھا۔

بارش کی اس سال یہ کثرت ہوئی کہ اگست ستمبر تو خیر مہینے ہی برسات کے تھے نومبر میں جو موسم سرما کا شباب تھا۔ گاڑی کے پہیے اور دہرے بیلوں کے کولھے

زور ٹانگیں اکثر جگہ پانی میں تھیں بلکہ ایک جگہ تو گاڑی ڈوبتے ڈوبتے بچ گئی۔ گاڑی جا رہی تھی آگے تھا گڑھا۔ گاڑی بان تھا افیونی۔ پینک کے زور میں گاڑی سمیت گڑھے میں جا پڑا۔ مولوی صاحب کے سمدھی کہنے کو تو گاؤں کے رہنے والے تھے مگر نہایت دور اندیش اور منتظم۔ بہو کے اس قدر اصرار سے اُنھوں نے آنے کی بھی اجازت دی ورنہ اُن کا ارادہ ابھی اور مہینے ڈیرہ مہینے بعد بھیجنے کا تھا کہ ندی نالے اچھی طرح خشک ہو جائیں۔ بہو کو بھیجا تو اس قدر انتظام سے کہ چھوٹا لڑکا دو چوکیدار اور ایک نوکر چار آدمی ساتھ کر دیے۔ گاڑی تھی تو گھر کی مگر نہ معلوم کن قرنوں کی۔ ایسی بوسیدہ اور کمزور کہ گرتے ہی چور چور۔ خیریت یہ ہوئی کہ پانی زیادہ نہیں تھا خیر گاڑی تو چاروں پانچوں آدمیوں نے ملکر جس طرح ہوا نکال ہی لی۔ مگر سواریوں کی سخت دقت تھی۔ برابر کے گاؤں سے مدد مانگی۔ نمبردار تھا آدمی معقول۔ اپنی رتھ بیلوں سمیت بھیجدی۔

بیٹی کے آنے کا انتظار تو مولوی صاحب کو بھی تھا مگر ماں کو تو دن رات تسبیح تھی۔ خدا خدا کر کے ان آفتوں اور مصیبتوں سے بیٹی پہنچی۔ ماں اور باپ دونوں نہال ہو گئے۔ بڑے لڑکے کو نانا نانی پیٹ میں چھوڑ کر گئے تھے۔ اب ماشاء اللہ پانچویں برس میں تھا اور ایسے غضب کی باتیں بناتا تھا کہ سننے والوں کے ہوش اڑتے تھے۔ چار پانچ گھنٹے تک تو بچہ خاصی اچھی طرح کھیلتا مالتا پھرا۔ پھر ماں سے کہنے لگا اماں ہمیں سردی لگ رہی ہے۔ ماں اپنے ملنے ملانے میں لگی ہوئی تھی۔ چھ برس بعد آئی۔ ایک آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ پرواہ نہ کی۔ لڑکا کانپنے لگا۔ دانت سے دانت بجنے لگے۔ نانی نے اُٹھ کر جلدی سے گود میں لیا۔ رضائی اُڑھائی۔ بچے کو تو اس غضب کا بخار چڑھا کہ توبہ۔ ڈاک شروع ہو گئی۔ خالہ نے محبت کے جوش میں آکر ایک شامی کباب کھلا دیا تھا۔ بھانجے کی یہ کیفیت دیکھ کر ہوش اُڑ گئے۔ قسمیں

کھانے لگی۔ میں نے تو الگ کونے میں بٹھا کر اتنا سا ٹکڑا کھلایا ہے۔

خدا جانے اس اتنے سے کباب میں کیا زہر تھا کہ دو تین ہی گھنٹے بعد بچے کی حالت بالکل خراب ہو گئی۔ سب پریشان ہو گئے۔ ماں بالکل گم سم بنی بیٹھی تھی آنکھ سے آنسو نہ نکلتا تھا۔ نہ منہ سے بات۔ ٹکٹکی باندھے بچے کو دیکھ رہی تھی ماتا کا جوش میاں کی خفگی۔ ساس سسروں کا عتاب۔ بیچاری کو کچھ دین و دنیا کا ہوش نہ تھا۔ بچے کے اس حال نے تو جان پر بنا ہی رکھی تھی۔ یہ خیال اور بھی مارے ڈالتا تھا کہ سسرال میں کیا منہ دکھاوں گی۔ میاں تو خیر اگر خدانخواستہ کچھ ایسی ویسی ہوئی تو رو پیٹ کر صبر کرے گا۔ مگر ساس سسروں سے کیا کہونگی ساس بھی اس قماش کی کہ وہ اپنے جھگڑے کے آگے اچھے دہنتر کی نہ سنیں۔ ایک کیا لاکھ قسمیں کھاؤں گی۔ قرآن کا جامہ پہن لوں گی تو وہ یقین نہ کریں گی۔ اب سے دور مرزاپور میں ذرا بخار ہو گیا تھا تو اُنہوں نے میرے مُنہ پر رکھدیا تھا۔ آم کا اچار کھلا دیا۔ میرے مُنہ میں خاک دہول اگر بچہ اچھا نہ ہوا تو ساری سسرال مجھکو کچا کھا جائے گی۔

کہیں رات کے دو بجے جا کر ذرا لڑکے کا بخار ہلکا ہوا۔ ڈاک بھی تھمی تو سب کی جان میں جان آئی۔ صبح تک بخار اُتر گیا۔ بخار کا اُترنا تھا کہ لڑکا اُٹھ بیٹھا۔ بچوں کی بیماریاں بھی عجیب قسم کی ہوتی ہیں۔ شام کو تو یہ کیفیت تھی۔ صبح کو لڑکا خاصی اچھی طرح کھیل رہا تھا۔ بیٹے کا اٹھنا تھا کہ ماں پڑ گئی۔ بیمار تو آئی ہی تھی دوڈہائی مہینے سے تمام جسم میں درد تھا۔ رنگ زرد پڑا ہوا۔ کچھ رستے کی تکان کچھ کھانے پینے کی بدعنوانی۔ آب و ہوا کی تبدیلی۔ بچے کی بیماری کا دہاکہ۔ مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ادہر نیت باندھی ادھر طبیعت بگڑنی شروع ہوئی۔ سلام پھیرنے سے پہلے ہاتھ پاؤں ٹوٹنے لگے۔ سنتیں بھی نہ پڑھ سکی۔ جانماز ہی پر لیٹ گئی۔ ماں نے اُٹھ کر پلنگ پر لٹایا

رضائی اوڑھائی لحاف اُڑھایا مگر بخار کیا ایک آفت تھی کہ ساعت بہ ساعت اور لحمہ بہ لحمہ بڑھتی جاتی تھی۔ حکیم کو بلوایا نسخہ لکھوایا منگوایا بنوایا پلوایا۔ دوا کا حلق سے اُترنا تھا کہ زبان بند ہوگئی۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ مولوی صاحب معمولی آدمی تو تھے ہی نہیں۔ آدھے سے زیادہ شہر اُن کا معتقد اور قریب قریب سارا شہر اُن کی خدمت اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ مولوی صاحب کے ہردلعزیز ہونے کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ آدھی رات کا وقت۔ جاڑے کے دن اور بیسیوں آدمی موجود تھے۔ ڈاکٹر اور حکیم سب ہی آئے اور گئے۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ کوششیں بھی کیں علاج بھی کیے۔ دوا بھی کی دعا بھی کی مگر کچھ ایسی گھڑی کا بخار چڑھا کہ جان لیکر ہی اُترا جو تجویز کی وہ الٹی اور جو علاج کیا وہ بے سود۔ رات تک تو کچھ امید بھی تھی۔ صبح وہ بھی نہ رہی۔ موت کے تمام آثار پیدا ہو گئے۔ خدا کی رحمت سے تو مایوس ہونا کفر ہے۔ مگر بظاہر زندگی کی امید موہوم تھی۔

مولوی صاحب ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر رات ہی کو مایوس ہو گئے تھے مگر عورتوں کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ رونا پیٹنا تو نہ تھا مگر علی قدر تعلق ہر ایک پریشان و بدحواس۔ خصوصاً ماں تو مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں اٹھیں پاس آئیں منہ دیکھا دل بھر آیا اور پھر جا پڑیں۔ دن بھر تو لے دے میں گزرا۔ مگر رات فی الحقیقت ایک قیامت تھی۔ رات کا وقت سکرات کی حالت جوان بیٹی کا دم آنکھوں کے سامنے نکل رہا تھا اور سب کھڑے دیکھ رہے تھے۔ جب تکلیف نزع زیادہ ہونے لگی تو مولوی صاحب نے سرہانے بیٹھ کر یٰسین پڑھنی شروع کی۔ دوسری مبین پر تھے۔ ادھر تین بجے اُدھر مرحومہ رخصت ہوئی۔

بیٹی کسی کی مرے گھر کسی کا بگڑے۔ بدنامی سائرہ کی ہو۔ شہر تو شہر کوئی محلہ کوئی گلی اور کوئی کوچہ، بچہ اور جوان مرد اور عورت کوئی ایسا نہ تھا جس کی زبان پہ یہ

نہ نکلتا ہوا ایسی ڈائن ہوآئی کہ آنے سے پہلے ہی نند کو کھایا۔ ابھی تو فقط منگنی ہی ہوئی ہے۔ نکاح کے بعد تو وہ سارے گھر کو صاف کریگی۔ بہتیرا سمجھایا ہر چند کہا مگر خاک نہ مانی اور ایک نہ سُنی اب اس کا نتیجہ بھگتا۔ یہ تو سسرال میں قدم رکھتے ہی اینٹ سے اینٹ نہ بجادے تو سہی۔ دادا دادی کو تو ش جان کیا اماں باوا کو ویران کیا۔ میکے کو تباہ کر چکی۔ اب سسرال کی باری ہے۔ ادھر سلیم شاکرہ ادھر مولوی صاحب ان تینوں کو چھوڑ کر کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو اس خیال کی تائید نہ کرتا ہو۔ مگر واہ ری دنیا کیا کیا لوگ ہوتے ہیں یہاں تو یہ سمجھائی اور وہاں جاکر یہ پٹی پڑھائی اچھے گھر میں بیٹی دی۔ ابھی لڑکی گئی نہیں گوائی نہیں۔ نکاح نہیں ہوا، رخصت نہیں ہوئی۔ رسوائی تو شروع ہوگئی۔ میاں کی شکل نہیں دیکھی۔ ساس نندوں کا منہ نہیں دیکھا سسرال میں قدم نہیں رکھا۔ منحوس تو ٹھہر گئی۔ نہ جانے پر تو یہ کچھ ہوا چلی جائیگی تو خدا جانے کیا کیا بن جائیگی۔ تمھاری سمدھن بیوی دیکھنے میں تو بہت سیدھی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر بڑی گھنی عورت۔ شہر میں ڈھنڈورہ پیٹ دیا کہ میری لڑکی کو بہو نے کھایا۔ اس سے تو ٹکے کا مزدور اچھا۔ لڑکی تو چین سے رہیگی۔ ایسی دولت کو آگ لگاؤ۔ اسکی قسمت میں عیش ہے تو فقیر بھی امیر ہوجائیگا۔ لڑکوں کا توڑا تھوڑی ہے۔ لڑکی میں خدانخواستہ کوئی عیب نہیں کہ بری نصیب ہو۔ بیوی لگیگی تمھارے دل کو ہنسی اُڑانے کو سب ہوجائینگے۔ چلے پرائی دھی اور ہنسیں ٹباؤ لوگ۔

قاعدہ کی بات تھی کہ شاکرہ اسکے جواب میں دو چار سخت سست باتیں کہتی۔ چنانچہ کہیں۔ پیغامبروں کا تو مطلب ہی یہ تھا۔ یہاں سے سنکر وہاں جا لگائی۔

پھولوں کے دن گھر میں سینکڑوں عورتیں بھری تھیں۔ مولوی صاحب کی بیوی نواسے کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ بچے کو دیکھ دیکھ کر دل اندر سے امڈا چلا آرہا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ ایک بیوی عورتوں کے سروں

پر سے پھلانگ چیرتی پھاڑتی ایک چھلانگ مار پاس پہنچیں۔ ماتم پرسی یا سلام دعا تو دوسری چیز ہے کہنے لگیں۔

بیوی میں تمہاری سمدھن کے پاس سے آئی ہوں۔ اُنھوں نے کہا ہی تمہاری بیٹی کی قضا آئی مرگئی۔ ہم نے کیا بگاڑا جو ہمیں بدنام کرو۔ لڑو نہ لڑو خدا سے جس نے مارا اوروں کے سر کیوں ہو۔ بیٹی کا بدلا بہو سے لیتی ہو۔ بہو بیچاری آس نہ پاس۔ لپیٹ میں آگئی۔ ایسی ساس کو سلام۔ کوارے ناتے تو یہ غضب ڈھایا بیاہ کر کے تو شاید جان ہی سے مار ڈالوگی۔ بھاڑ میں جائیں ایسی ساسیں اور چولھے میں جائیں ایسی نند جو بہوؤں کو اُلم نشرح کریں۔ بیوی بیٹی لینے کو بڑا منہ چاہیئے۔ ایک آئی وہ جھینک رہی ہے دوسری آئی وہ پیٹ رہی ہے۔ تیسرے کا کرنے اٹھیں اس میں یہ پتھر ڈھائے۔ مجھ کو لڑکی دوبھر نہیں ہے۔ تم اپنے لڑکے کا اور فکر کرلو۔ رہا تمہارا انگوٹھی چھلا۔ جب چاہے منگوالو۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔

ماں کا یوں ہی کلیجہ نکل رہا تھا اس سنگدل کا منہ دیکھ کر چپ کی چپ رہ گئیں۔ مگر اور بیویوں کو بہت ہی ناگوار معلوم ہوا۔ کہنے لگیں عورت تو آدمی ہے یا جانور۔ اور وہ سمدھن ہیں یا سرن۔ تف ہے اُن بھیجنے والی پر اور لعنت تجھ آنے والی پر خیر وہ تو یہاں موجود نہیں مگر نیکبخت تو بھی تو عقل رکھتی ہے۔ ننھی نہیں اندھی نہیں موقع محل کچھ تو دیکھتے ہیں یا آنکھیں بند کرلیں اور مُنہ کھول دیا۔ دو چار دن تو صبر کیا ہوتا تو بھی صاحب اولاد ہے۔ یوں آنکھوں پر ٹھیکری رکھکر بات کرتے ہیں چل دور ہو یہاں سے خبردار جواب آئی۔

عورت۔ میں نے کیا کیا جو میرے سر ہوئیں۔ میرا کوئی قصور کوئی خطا۔ مجھ سے جو کہا وہ میں نے آکر کہدیا۔ ایلچی کو جواب کیا۔ بُرا کیا تو اُنھوں نے بھلا کیا

تو اُنھوں نے، تم جانو وہ جانیں - اندھی کہو، بیوقوف کہو، سڑن کہو، دشمن کہو۔ کہو نہ کہو اُن کو کہو۔ مجکو اندھی دھندی بنانے سے واسطہ کیا۔ میں نے بہتیرا کہا۔ ہاتھ تک جوڑے کہ بیوی مجھکو نہ بھیجو۔ اب میں کسی کے دل میں ڈالنے سے تو رہی۔ میں تو نہیں آئی تھی بلا کی طرح چمٹ گئیں۔ جو کچھ اُنھوں نے کہا میں نے تو آدھا بھی نہیں کہا - میری اتنی عمر آئی - امیرا میر کی جگہ - غریب غریب کی جگہ - دو سمدھیانے میں نے بھی برتے ایک بہو میں بھی لائی - مگر بی ایسا سمدھیانہ تو خدا دشمن کو بھی نہ دے - یہ تو خوشی کا سودا ہے زبردستی تھوڑی ہے - مرضی پٹی کیا نہ مرضی پٹی نہ کیا - تم کو لڑکیاں بہت ہم کو لڑکے بہتیرے -

مولوی صاحب کی بیوی کو اور تو کچھ بن نہ آئی - اٹھیں اس عورت کا ہاتھ پکڑا اور روتی ہوئی میاں کے پاس لے گئیں - تمام قصہ سنوایا - مولوی صاحب ایک سلیم الطبع آدمی سُنکر کہنے لگے - اچھا تم جاؤ ہم اس کا جواب بھیجدینگے -

(۲۲)

ادھر کی تو یہ کیفیت تھی اب اُدھر کی سُنیے - شاکرہ نے جب سے سُنا تھا عجیب شش و پنج میں پھنسی ہوئی تھی کہ ماتم پرسی کے واسطے جاؤں یا نہ جاؤں اور جاؤں تو کیونکر جاؤں - کوارا ناتا بیٹی کا معاملہ - پہلا سمدھیانہ ، کوئی مشیر نہ صلاح کار - میاں بیوی سے زیادہ ناواقف - بیوی میاں سے زیادہ انجان - ماں بھی اتفاق سے پندرہ روز کے واسطے باہر گئی ہوئی تھیں - آخر یہی سمجھ میں آئی کہ جانا ضرور ہے پانچ روپے حاضری کے سمدھن کے ہاتھ میں دے گھنٹہ بھر بیٹھ چلی آؤں -

جس طرح ماں کے مرنے سے اولاد ویران خاوند کے مرنے سے بیوی کی تباہی بیوی کے مرنے سے میاں کا گھر برباد - اسی طرح سر پر بڑا بوڑھا نہ ہونے سے لڑکی بالیوں کی مٹی پلید - شاکرہ سمجھدار ضرور تھی - مگر تجربہ کار کہاں سے ہو جاتی

بیٹا نہیں بیاہا بیٹی نہیں بیاہی۔ ماتم پرسی میں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا
سلیم جیسے آدمی صلاح کار۔ بیوی تیار ہونے لگی تو اتنا اور کہدیا ذرا کپڑے لتے گہنے
پاتے سے درست ہو کر جانا عقل کی دشمن لال دوشالہ پاپ لین کا پاجامہ پہن
پھولوں میں جا پہنچی۔ شاکرہ کا ڈولی سے اُترنا تھا کہ سب بیویوں نے منہ جوڑنا شروع
کیا بلکہ جو دو چار جان پہچان تھیں انہوں نے منہ پر بھی رکھدیا۔ اب تو شاکرہ کا
دم بھر بیٹھنا وبال ہوگیا۔ جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی تھی امیر غریب جوان بڑھیا
فلالین کے پاجامے ہلکی ہلکی دولائیاں۔ اپنے کپڑوں کو دیکھ دیکھ کر زمین میں
گڑی جاتی تھی۔ مزید براں یہ ایک اور واقعہ پیش آیا کہ چھوٹا بچہ اور بچوں کی دیکھا
دیکھی برف والے سے دو قفلیاں لے آیا اور صحن میں کھڑے کھڑے دونوں چیٹ
کیں۔ ماں عقلمند فقط پانچ روپے لیکر چلی تھیں وہ حاضری میں دیدیے۔ کہاروں
کو آتے جاتے کا کرایہ گھر ہی پر دیدیا تھا۔ تین پیسوں کے واسطے دو تین عورتوں کے
آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔ جب کہیں پیسے نصیب ہوئے۔ گھنٹہ بھر کو گئی تھی۔ آدھ ہی
گھنٹہ بیٹھی۔ گھڑی سواری گئی اور چلی آئی۔

مولوی صاحب کی بیوی آج تو خیر رنج ہی میں تھیں اگر نہ بھی ہوتیں تو ایسی
چھچھوری بھی نہ تھیں کہ گھر پر آئی سمدھن سے لڑنے کھڑی ہو جاتیں۔ دل میں چاہے
کچھ ہو ظاہر میں تو خاصی اچھی طرح ملیں۔

مرنے والی مرگئی۔ دسواں بیسواں چالیسواں سب کچھ ہو گیا۔ مرنے کے ساتھ
کوئی نہیں مرتا۔ سب رو پیٹ کر چپکے ہو گئے۔ ساس نندیں دیورانیاں۔ جٹھانیاں۔
میاں۔ سسرے۔ دیور۔ جیٹھ سب آئے اور دو دو چار چار روز ٹھہر ٹھہرا کر چلدیے
لڑکے پر تھوڑی سی ردو کد ہوئی۔ دادی کہتی تھی میں لیجاؤں۔ نانی کہتی تھی میں
رکھوں۔ مگر مولوی صاحب بیچارے ان جھگڑوں سے کوسوں دور بھاگتے

والے آدمی بیوی کو سمجھا کر لوا سے کو داماد کے ساتھ کر دیا اور کہدیا میاں تمہاری اولاد ہے۔ اللہ عمر میں برکت دے۔ ہم بھی جب دیکھ لیں گے خوش ہو جائینگے۔ جب زور تھا وہی نہ رہی یہ تو پرایا مال ہے۔

(۲۳)

دوپہر کے وقت ایک دن کاچھن گھر میں آئی۔ بچوں نے پیسے پیسے دھیلے دھیلے کا سودا لیا۔ کچھ اس وقت جی ہی چاہ گیا۔ پیسہ کے امرود شاکرہ نے بھی لیے۔ ایک موٹی سی مولی سائرہ نے اٹھالی۔ کاچھن بولی بیگم پون پیسے سے کمتی نہیں دونگی۔ سائرہ کے ہاتھ میں کوڑیاں پانچ گنڈے وہ بھی چھپیے میں اس طرح پھینکیں کہ چار ہی رہ گئے۔ کاچھن نے کہا لو چھوٹی لے لو وہ تو کم کی نہیں ہو گی۔ سائرہ نے وہیں کھڑے کھڑے مولی توڑ ٹکڑے کر کھانی شروع کر دی۔

کاچھن۔ ایسی لٹس پر کمر باندھی ہے تو سارے چھپیے کا چھپیا ہی چھین لو۔

کاچھن کا اتنا کہنا تھا کہ سائرہ نے مولی کا ٹکڑا رکھکر جو کاچھن کے منہ پر مارا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی

ساٹھ بلکہ دو چار برس بڑھتی کی بڑھیا کھوسٹ کاچھن صبح سے شام تک پیٹ کے کارن تین چار دھڑی بوجھ سر پر اُٹھائے پھرتی۔ جب شام کو دو ڈھائی آنے کی صورت دکھائی دیتی۔ ترکاری تو خیر معمولی ہی ہوتی تھی مگر لگے ہوئے ٹھکانے تھے اس سرے سے اس سرے تک کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں نہ جاتی ہو۔ خدا بخشے سائرہ کی دادی کی تو یہ کیفیت تھی کہ گھنٹوں بیٹھی اس سے باتیں کرتی۔ ضرورت سے نہیں بلا ضرورت لیتیں لیتیں نہ لیتیں مگر کاچھن کو کبھی خالی ہاتھ نہ جانے دیتیں۔ دیتیں اور بلا ناغہ دیتیں سلیم کا بیاہ ہوا پانچ روپے نقد دیئے ایک تھان دیا ایک لہنگا بنوا دیا۔

زبردست کمزور کی لڑائی کیا۔ سائرہ اور کاچھن کا جھگڑا کیا۔ زبردست کے

لیوے ہیں۔ سندر کا چھن نے قصور کیا سزا پائی۔ بلکہ ایک حساب سے اسکو سائرہ کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ مولی کے ٹکڑے ہی پر خیر گزری۔ چاہے چوٹ مولی ہی کی زیادہ لگی ہو مگر بدنامی کھیڑ کی زیادہ ہوتی۔۔ یا یہ کہ ممکن بھی تھا یا نہیں سو سائرہ کے مزاج سے سب ناممکن ممکن۔ اور سب غلط درست تھا۔ جرم کی تفصیل نہ تھی کہ سزا کی حد ہوتی۔ قصور کی تشریح نہ تھی کہ فیصلہ کا اپیل ہوتا۔ کا چھن تو کا چھن کسی اور میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکتا۔ ماں بھی بیٹھی تھی باپ بھی دیکھ رہا تھا نہ اس کی اتنی طاقت کہ بول کر سکے نہ اس کی اتنی مجال کہ دم مار سکے۔ سُندر رو دھو چپکی اٹھ چھیبا سر پر رکھ کے سیدھی ہولی۔

سائرہ کی تقدیر سے مولوی صاحب کے ہاں بھی وہی آتی جاتی تھی۔ پھیری کی پھرتی دودھائی بجے وہاں پہنچتی۔ ترکاری باقی ہو نہ ہو سودا کام کا ہو نہ ہو سندر کو آندھی جائے مینہ جائے ایک پھیرا کرنا۔ مولوی صاحب کی بیوی کو بھی کچھ سندر کی طلب سی ہوگئی تھی۔ ذرا دیر ہو جاتی تو وہ کئی دفعہ یاد کر لیتیں۔ بیوی تو بیوی خود مولوی صاحب کی کیفیت تھی کہ سُندر سے ایک آدھ بات ہنسی مذاق کی کر لیتے۔

آج جو بی سندر سائرہ کے ہاتھوں پٹک نکلیں بڑھاپے کی چوٹ جاڑے کا موسم سر پر بوجھ تھوڑی ہی دور چلی ہوگی کہ کلہ سوجھ کر کپا ہوگیا سب بکری وکری اینڈ ہوئی کہیں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ بھرا ہوا چھیبا لے گھر کو لوٹی۔ رستے میں مولوی صاحب کا گھر پڑتا تھا۔ تکلیف ہو رہی تھی زیادہ۔ سوچا یہ کہ نہیں جاتی تو بیوی کا دھیان لگا رہیگا۔ لگے ہاتھ کہتی بھی چلوں کہ آج جی اچھا نہیں ہے اور ذرا اٹھنک کر دم بھی لیلوں ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے۔

سندر رذیل ضرور تھی مگر وہ ایسی رذیل تھی کہ آج شریف ایسے نہیں ہوتے۔ اگلے وقتوں کی عورت سب رنگ برتے ہوئے زمانہ دیکھے ہوئے۔ بڑوں کی ملنے والی۔ بیٹا بیٹی والی

جو کچھ کہہ سکتی تھی سائرہ ہی کو کہہ لیا۔ یہ نہیں کر سکتی تھی کہ سسرال میں جا کر لگاتی۔ مگر لوگوں کا انتظام تو کا چھن کا کام نہ تھا جو ہر وقت منتظر تھے کہ ذرا سی بات ہاتھ آئے اور کچھ کی کچھ کر کے پہنچائی۔ سندر پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک اللہ کی بندی نے تمام قصہ جا کر جڑ دیا۔ اتفاق سے اس وقت مولوی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی سُنا کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ سندر آئی۔

مولوی صاحب نے ہر چند پوچھا۔ بیوی نے لاکھ اُلٹ پھیر کی باتیں کیں مگر داہ رے سندر یہی کہے چلی گئی۔ بیگم۔ بھلا میری گودیوں کی کھیلی۔ میرے سامنے چھوٹی سے بڑی ہوئی مجھ پر ہاتھ اٹھا سکتی ہے۔ تم سے جس نے کہا جھک مارا۔

سندر کو کوئی کاٹ ڈالتا تو نبو لنے والی نہ تھی۔ مگر کیا پابند وضع عورت تھی مرتے مر گئی لیکن پھر اس در پر نہ گئی۔ دو تین دفعہ سلیم رستے میں ملا اور کہا۔ مگر یہی جواب دیا میاں اللہ تم کو خوش رکھے۔ میری بلا نیوالی قبر میں جا سوئیں اب کسکے پاس آؤں۔

(۲۴)

سائرہ کی منگنی کو اب سال بھر کے قریب ہو گیا۔ شعبان میں مولوی صاحب نے حج بیت اللہ کا قصد کر لیا۔ ساتھ ہی یہ خیال آیا سینکڑوں ہزاروں کوس کا سفر ہے۔ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ عابد کا نکاح اپنے سامنے کرتا جاؤں۔ بیوی سے صلاح لی۔ انھوں نے بھی یہی سوچا آخر کرنی تو ہے ہی پھر کیوں لیت و لعل کی۔ ظہر کے بعد مولوی صاحب نے ذکر کیا۔ عصر کے بعد بیوی نے سمدھیانے پیغام بھیجدیا۔ شاکرہ نے کہلا بھیجا تمہارا مال ہے۔ جب چاہے آکر لیجاؤ۔ تجویز یہ ہوئی عید کے دوسرے روز ساچق تیسرے دن برات چوتھے دن وداع۔

شاکرہ کو جو کچھ کرنا تھا سب کر چکی تھی۔ کھانے کا انتظام باقی تھا وہ میاں سلیم کا کام تھا۔ سب سے بڑا انصرام مبلغ علیہ السلام کا تھا۔ سلیم کی ناتجربہ کاری نے اس معاملہ میں بھی بیوی بیچاری کے چھکے چھڑا دیئے کسی مہاجن نے وعدہ کر لیا تھا اُسکے اوپر ایسے

بھولے کہ جب بیوی نے تقاضا کیا یہ ہی کہدیا وقت تو آنے دو۔ جب ضرورت ہوگی لادونگا۔

تاریخ مقرر ہوگئی تو سلیم نے جاکر ذکر کیا۔ قرضہ تو تھا ہی نہیں جو مہاجن کو فکر ہوتا۔ پندرہ بیس روز جھلاتا رہا عین عید کے دن تنت کے تنت انکار کر دیا۔ مہاجن کا جواب دینا تھا کہ سلیم کے ہوش اڑ گئے۔ بہتیرا سر پٹکا منتیں کیں خوشامدیں کیں مگر وہ یہی کہے گیا میاں جی جرار وکڑ کا ایسا ہی معاملہ ہے، چار دن اور ٹھہر جاؤ۔ ادھر تو میرے کنے کوڑی نہیں لاچار اٹھ کھڑا ہوا بنیئے بقال صراف مہاجن دوست آشنا جان پہچان سب ہی جگہ ٹکریں کھاتا پھرا۔ مگر کون کسی کے کام آتا ہے۔ روپیہ کا نام سُنکر سب نے منہ پھیر لیا۔ حیران پریشان گھر آیا تو کمہار کھڑا مٹکوں کے دام مانگ رہا تھا۔ کہار پیسوں کو چیخ رہے تھے۔ پہلے اُن ہی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اندر پہنچے تو بیوی میاں کا انتظار کر رہی تھی۔ میاں نے آکر سوکھا جواب دیدیا۔ منہ دیکھ کر رہ گئی۔ وقت اتنا تنگ۔ مجبوری اتنی زیادہ۔ کچھ کرتے دہرتے بن نہ آئی۔ ہوتا نہ ہوتا یہی ہوتا کہ ایک آدھ چیز گروی رکھی جاتی پھر مہاجنوں کا دینا۔ تین سو روپے کا مال دیکھ لیں تو مشکل سے دو پونے دو سو روپے حوالے کریں۔ یہاں ایسی کون سی چیز تھی۔ سارا ہاتھ گلا جاتا تو شاید پورے ہوتے۔ دنیا جہان تو دنوں اور مہینوں سے شادی بیاہوں میں جانے کی تیاریاں کرے ادہر اُدہر سے مانگ مونگ پہن اوڑھ کر آئے یہاں جو گرہ کا وہ بھی غارت ہو۔ خیر اتنا تو نبھ بھی جاتا بیٹی کی ماں تھی بیٹے کی ماں تو تھی ہی نہیں۔ زیور زیادہ نہ ہوتا معمولی مگر یہ تو نہ تھا کہ دلہن کی ماں (کپڑے چلکٹ ہیں تو خیر) ننگے کان خالی گلا سونٹا سے ہاتھ پھر رہی ہے۔

یکیسی وقت تھی کہ دو چار روز کی بھی تو مہلت نہیں۔ کل ایک دن ساچق میں باقی رہا منگل کی عید ہوئی بدھ کی ساچق۔

سلیم جب تک حصول مقاصد میں ناکام ہوا شاکر اتنی دیر میں اپنا تمام کام

انجام دے چکی تھی۔ گھر کی درستی فرش بچھونا چراغ بتی جھاڑو بہاڑو سب ٹھیک ٹھاک کرلیا۔ ایک بجا ہوگا جو سلیم ناکامی کا مژدہ لے کر آئے کھڑے کھڑے آئے اور اُلٹے پاؤں چلے گئے۔ گویا مہاجن کا پیغام تھا کہ پہنچ کر سبکدوش ہوئے۔ کیا بےفکر آدمی تھا بیوی کو اطلاع دے بیٹے سے کیا ب ننگا عید کی کچوریاں کھانے بیٹھ گیا۔

سلیم کا مزاج بچپن ہی سے اس قسم کا واقع ہوا تھا کہ وہ اپنی نفسانی ضرورتوں کو ہر چیز پر مقدم سمجھتا تھا۔ کسی کو تکلیف پہنچے نقصان ہو کوئی برا کہے بدنامی ہو کچھ بھی ہو اپنی ضرورت نہ اٹکی رہے۔ جب اپنا کام نکل گیا پھر بلا سے کچھ ہی ہوا کرے۔

سچ پوچھو تو یہ ضرورتیں بھی سلیم کی تھیں مگر اس نے نہ کبھی پہلے ان کو اپنا خیال کیا نہ آج۔ بیوی کے مارے باندھے اتنا بھی کیا ورنہ اس کی طرف سے جہیز میں آگ لگجاتی تو اور زیور چوری ہو جاتا تو اس کی بیزار سے۔ اسکو تو صرف وہ ضرورتیں محسوس ہوتی تھیں جو اس کی ذاتی راحت و تکلیف سے متعلق ہوں۔ اس معاملہ میں سلیم سائرہ سے کچھ کم نہ تھا کسی چیز کی ضرورت شرط ہے۔ بچے سے چھین لینے میں اسکو عذر نہ تھا۔ غیر سے مانگ لینے میں اسکو عار نہ تھی۔ بچے صبح سے بھوکے بیٹھے ہوں اپنے پاس چھ سات پیسے ہوں تندور کے پراٹھے پکوا لیے بالائی لے آیا اور بیٹھ کر کھالی۔ بہت مہر پدری نے جوش کیا تو ٹکڑا ٹکڑا بچوں کو دے دیا۔ کھاپی موچھوں پر تاؤ دے بیوی سے کہدیا حقہ بھر لاؤ۔

سلیم کو ضرورت کیا تھی کہ وہ اس موقع پر اپنے فرائض کو سمجھتا اور خلاف عادت اور مزاج اپنے پیچھے غم لگاتا۔ لگاتی نہ لگاتی شاکرہ۔ چنانچہ لگایا اور ایسا لگایا کہ برسا ہی برس میں آدھی بھی نہ رہی۔

اگر کہیں شاکرہ کی طبیعت بھی اثر صحبت سے جو بہت ممکن و قرین قیاس تھا سلیم ہی کے رنگ پر آجاتی تو تمام شہر میں نام روشن ہو جاتا کہ ڈاکٹر صاحب کی پوتی

کے بیاہ میں حقہ پان تو درکنار براتیوں کو پانی تک نصیب ہوا۔ مگر عورتوں کا سلیقہ اس
موقع پر کام نہ آیا تو گھر والیوں اور بازار والیوں میں استیانہ ہی گیا رہا۔ شاکرہ بطرز
امیرانہ یا غریبانہ پندرہ بیس برس سے گھر کر رہی تھی مانا کہ اب مفلسی تھی۔ لیکن ایک
وہ بھی زمانہ تھا کہ ان ہی ہاتھوں سینکڑوں روپے آئے اور گئے۔ سلیم نے جو کچھ کیا
اس کو سب بن آئی مگر شاکرہ کو کچھ بن نہ آسکتی تھی۔ یہ شاکرہ کی شرافت کہو سعادت
کہو عنایت کہو۔ کوئی بیہودہ نالائق ناہنجار ہوتی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتی رسوائی
ہوتی تو سلیم کی۔ بدنامی ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کی۔ شاکرہ کا کیا بگڑتا۔ سلیم جیسے میاں
کا جواب تو یہی تھا مگر شاکرہ کو جیسی بیوی پندرہ بیس برس کی بیاہی۔ ہزار برس کی نیو گھر تین برس
ہر طرح اسی کی خرابی تھی۔ میاں تو روٹی کھا کہاروں کو چھپتا کمہار کو مانگتا چھوڑ چھاڑ چلتے ہوئے
شاکرہ کی عاقبت اندیشی نے اس وقت گھر کی عزت رکھ لی۔ ورنہ سلیم تو اپنی دانشمندی
پر باپ دادا کی عزت قربان ہی کر چکے تھے۔ شاکرہ کا بیان تو یہی ہے کہ قرض لائی۔
مگر زمانہ ایسا نہیں دکھائی دیتا کہ تین سو روپے کا اعتبار صرف شاکرہ کی زبان
کا بوجھ تھا۔ کوئی ذریعہ قرض سمجھ میں آتا ہے۔ نہ کوئی دینے والا دکھائی دیتا
ہے۔ بہرحال اس سے بحث نہیں۔ قرض لائی یا پاس سے نکال لے۔ وقت پر ناک
رکھ لی۔ بالفرض قرض ہی لائی تو بھی بیوی کی ساکھ میاں سے زیادہ رہی کہ میاں
تمام شہر میں خاک چھانتے پھرے اور ادھی نصیب ہوئی۔ بیوی اپنے آدھے سخن پر
پھر جھولی تین سو روپے لے آئی۔

سلیم نے بیوی کے حال پر ایک اور عنایت کی۔ بیٹی کے بیاہ کو بھی جانے دو
برس کل بس سات دن پھر نہ گیا گیا شام ہو گئی اور ملنے کا نام نہ لیا۔ روٹی کھا دو پان
منگوا ایک منہ میں رکھ اور ایک ہاتھ میں لے باہر نکلا۔ گلی سے باہر خلیفہ سلامت
کی بیٹھک میں چوپڑ ہو رہی تھی وہاں ڈٹ گیا۔ گھر کا تمام کام کاج پٹا ہو رہا تھا

باہر میاں کوڑیاں چت کر رہے تھے۔ بیوی یوں کی گوٹ کی طرح اُدھر میں پھنسی ہوئی تھیں۔ شام تک راہ دیکھ دیکھ بھائی کے سپرد پان زردے کا انتظام کیا۔ خالو سے برتن منگوائے۔ بھتیجے سے پھولوں کا گہنا منگوایا۔

خدا مسبب الاسباب ہے کسی کی ضرورت اٹکی نہیں رہتی۔ اللہ کے بندے سب ہی قسم کے ہیں ایک کا کام ایک سے نکلتا ہی ہے شاکرہ کیا تو اللہ رکھے سہاگن تھیں۔ رانڈیں بے وارثیاں جن کا کوئی والی نہ سر دھرا اُن کے بھی سب کام ہو ہی جاتے ہیں۔ اُن دماغ چوٹوں کا تو ذکر نہیں ہے کہ برابر میں موت ہو جائے ماتم پرسی کریں میت کے ساتھ دو قدم بھی نہ جائیں باقی دنیا کے کام یوں ہی چلتے ہیں۔ وہ اس کے وقت پر یہ اس کے وقت پر۔ مزاج میں انسانیت ہونی چاہیئے۔ زبان وہ چیز ہے کہ اس سے غیر اپنے ہو جاتے ہیں۔ شاکرہ تو سبحان اللہ! خاندان اور کنبہ تو الگ رہا۔ محلّے تک میں کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو اس کی تعریف نہ کرتا ہو۔ شاکرہ کے ذرا زبان ہلانے کی دیر تھی ہمسائے اور پڑوسی تو آنکھیں بچھانے کو تیار تھے۔ سب نے مل کر ہاتھوں ہاتھ کام اٹھا لیا۔ مٹی کے پیالے سے لے کر چاولوں کی بوریاں تک آموجود ہوئیں۔

عید والے دن تو سا جھی کیا اگر برات بھی ہوتی تو کس کو غرض پڑی تھی کہ برس کے برس دن اپنا گھر سنسان اور تہوار ویران کرتا۔ شاکرہ کے میکے کی پانچ چار عورتیں آگئی تھیں وہی اپنا گود پیٹ۔ ماں۔ دو تو بھاوجیں۔ بھانج بہو۔ زیادہ بکھیڑا نہ کرنا پڑا۔ روٹی سالن پک گیا سلیم پلٹا تو رات کے دس بجے۔ چبوترے سے آگے لکڑیوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ ایک ٹھوکر جو لگی اوندھے منہ گرا۔ کتنا سمجھدار آدمی تھا۔ چوٹ لگی اپنی بیوقوفی سے بیوی پر خفا ہونے لگا۔

جب ہوتی ہو بیچ میں فضول فضول چیزیں ڈال دیتی ہو اتنا خیال نہیں کہ آنے کا

وقت ہے رستہ تو صاف کر رکھوں کہ کہیں چوٹ نہ لگ جائے۔

بیوی - واہ اُس وقت کے گئے گئے اب گھستا نصیب ہوا اور وہ بھی بگڑتے ہوئے۔ ابھی لمپ جل رہا ہے۔ لکڑیاں پڑی ہوئی ہیں آنا نہ دکھائی دیا۔

میاں - چلو کھانا لاؤ۔

کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹے۔ منجھلی لڑکی نے حقہ بھر کر دیا۔ بیوی پان بنا کر لائی۔ دو تین گھونٹ حقہ کے پیئے ہونگے پان منہ کا منہ ہی میں رہا اور خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ امیر غریب بڈھا جوان کوئی ہو جب تک رشتۂ حیات موجود ہے اور تعلقات دنیوی باقی ہیں خواہش وارمان حسرت نام ونمود پیچھا نہیں چھوڑتے۔ مولوی صاحب کے یہاں سے دلہن کی عیدی اس دھوم دھام سے آئی کہ تمام شہر میں نام ہو گیا۔ مگر بیٹے والوں کا صرف تو ایک قسم کی تجارت ہے کہ منفعت کے سوا خسارے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ سوا ٹھائے سوا سو آئے۔

شاکرہ کو اس سے زیادہ ٹیپ ٹاپ کرنی پڑی۔ جو کچھ کیا آپ ہی کیا۔ سلیم کو تو شاید خبر بھی نہیں ہوئی۔

باسی عید کو ساچق کا دن تھا۔ شام کے وقت پاس پاس کی عورتیں آنی شروع ہوئیں۔ مغرب کے بعد ساچق آئی۔ مولوی صاحب نے ہرچند چاہا کہ صرف فضول سے احتراز کیا جائے۔ مگر طوطی کی آواز نقارخانے میں کون سنتا ہے ایک چلی ساچق بھی آئی تو ایسی آئی کہ سب دیکھ کر دنگ ہو گئے۔ پانچ من بری چار خوان میوے کے پانچ شیشے گلاب کے سات شیشیاں عطر کی۔ پانچ کنگھیاں۔ پوڑوں میں مہندی۔ سہاگ پوڑے میں خوشبوئیں بابا فرید کے پوڑوں میں کھانڈ چنگیر۔ پاندان میں پھولوں کا گہنا۔ گہنے میں بدھی، گجرے، کرن پھول، ٹیکا، چمپا کلی۔ ڈبیا میں مصری کی ڈلیاں، نتھ، سینیوں میں میوہ، کلاوے کشتیوں میں جوڑے، سفید چینی ہوئی ٹھلیاں سلیقے کہیں آئیں ستا گیارہ چودہ پیالیاں آئے کہیں

گیارہ بجے کے قریب سمدھنیں آئیں۔ شاکرہ کے ہاں برات میں بھی اتنے مہمان نہ تھے جتنے وہاں سے ساچق میں آئے۔ خیریت یہ ہوئی کہ کھانے کی تخ نہ تھی ورنہ وہ رسوائی ہوتی کہ بیٹی کے بیاہ میں چھٹی کا کھایا یاد آجاتا۔ صرف شربت کا معاملہ تھا زیادہ وقت نہ ہوئی دس سیر اولے تو موجود ہی تھے بتنجن کا قند رکھا ہوا تھا وہ لے لیا۔ شاکرہ کی تو اس روز شکل بھی نہ دکھائی دی۔ دلہن کی ممانی شربت پلانے کھڑی ہوئیں اور خالہ رومال ہاتھ میں لیکر منہ پونچھنے۔

سائرہ کی صورت دیکھ کر تعجب اور حیرت ہوتی تھی۔ وہی سائرہ جو تمام دن سارے گھر کو سر پر اٹھائے رہتی تھی۔ سمٹ سمٹا کر ایسی دبکی سکڑی بیٹھی تھی کہ منہ میں زبان ہی نہیں۔ دُلہن کو لاکر باہر بٹھایا تو سب سے پہلے ساس اُٹھ کر پاس آئیں۔ منہ کھولا پہلے پھولوں کا گہنا پہنایا۔ کانوں میں پتے بالیاں میکے کی تھیں ساس نے جھلنیاں چڑھائیں۔ جھومر لگایا۔ گلے کے واسطے ٹھسی لیکر آئی تھیں مگر چار انگل چوڑا گلوبند دیکھ کر ہمت نہ پڑی مالا پہنا دی۔ بازو پر نونگے میکے کے تھے جوشن اُنھوں نے باندھے۔ پاؤں میں لچھے ہاتھوں میں اینڈوی کے کنگن۔ ناک کو نتھ۔ ساس اُٹھیں تو کسی نے انگوٹھی کسی نے چھلا۔ غرض ہزار روپے سے زیادہ کا زیور سسرال سے چڑھا۔ پیروں میں سونا پہننے کی یا تو اُن کے ہاں کی آن ہوگی یا مولوی صاحب نے اجازت نہ دی ہوگی اور جو دونو باتیں نہ تھیں تو بیشک غلطی کی۔ اس جوڑے چڑھاوے میں دو ایک چیزیں کم کرکے ایک گہنا پاؤں کا خاصی اچھی طرح ہوجاتا۔ ایک اشرفی اکیس روپے ہاتھ پر رکھے پاس والیوں نے دُلہن سے سلام کردایا۔ پھر سب نے باری باری مصری کی ڈلیاں اور لقمے کھلانے شروع کیئے۔

سلیم کی دانشمندی نے بیوی کے ساتھ ایک اور لاجواب سلوک کیا۔ بہوڑے کا کھانا تین من کی تجویز ہوئی۔ شاکرہ نے حساب کرا کر چار دبوں کی بوریاں گھی کے کنستر

کھانڈ میوہ سب باہر بھیجدیا۔ پوسیری کے حساب سے گھی بھیجا۔ برابر کا گوشت دیا۔
دنیا میں سب ہی قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ پھر میاں سلیم کے ملنے والے تو ایک سے ایک بدتر تھے۔ اس سے بہتر موقع اور کون سا ملتا۔ محمد وتارکش نے باڑ پر رکھ لیا۔ میاں عقل جاتی رہی۔ یہ سب محلے والے تم کو پاگل بنا رہے ہیں۔ بورچی (باورچی) سے ملکر مال کھائے جاتے ہیں۔ ایک وہ تمہاری بیوی الو بھلا کہیں سیر کو پوسیری گھی آجتک سنا بھی ہے۔ بریانی میں گھی چھٹانک نہیں ڈیڑھ چھٹانک رکھ لو۔ اور پی تو ہم نے بڑے بڑے امیروں میں بھی نہیں سُنا۔ ڈپٹی صاحب تک کے ہاں کہ ایک نوالے میں ہاتھ چپک بہ چپک ہوتا تھا۔ میرے ہی ہاتھوں چھٹنکی کے حساب سے گھی دیا گیا ہے۔ چاولوں میں چکنائی اصل میں گوشت کی ہوتی ہے۔ ممن سے زیادہ کاریگر عیدو نہیں ہے۔ شہر میں کیا دور دور اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ بلا کر پوچھ لو کدھی چھٹنکی سے زیادہ گھی دیا ہے جب تم جیسے بیوقوف پلے پڑجائیں۔ نہ کہ کنستر کے کنستر غارت [illegible] رہے ہیں اور تم کو خبر نہیں۔ پانچوں کنستر اٹھالو یہاں لاکر بند کردو حساب سے گھی دیدو۔ ہم تو تمہارے بھلے میں ہیں۔ بچیگا تو تمہارے ہی کام آئیگا۔ ہم تو کھا نہیں جائینگے۔
یہ تو ایک مدلل بحث تھی۔ میاں سلیم کو تو اشارہ کافی تھا چھٹنکی کے حساب سے گھی باورچی کے حوالے کیا اور باقی کنستر اُن کرم گستر کے سپرد کیے۔ باورچی ہرچند چیخا پیٹا۔ سلیم کس کی سننے والے تھے۔ یہ ہی کہے چلے گئے تم کو پکانے سے کام ہے مال بگڑیگا ہمارا۔ نقصان ہوگا ہمارا۔ بدنامی ہوگی ہماری۔ تم کہنے والے کون۔ جتنا دیا ڈالدو۔ میاں انتظام کے سپرد کھانے کا انتظام تھا۔ تھوڑی دیر تک تو سلیم کو سمجھاتے رہے مگر جب دیکھا کہ یہ کسی طرح رستے ہی پر نہیں آتا تو سب چھوڑ چھاڑ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازے پر آئے کہ گھروالی کو اطلاع دیدیں۔ بہت غل مچایا مگر شادی کے گھر میں کون سنتا ہے۔ جل کر چلدیے۔

باورچی کا کیا بگڑتا تھا۔ اس نے چٹکی کی آدھی چٹکی بھرائی۔ ساڑھے تین سیر توکل گھی ہی ملا۔ دو سیر اس نے ہضم کیا۔ ڈیڑھ من بریانی میں سما کر پونے دو سیر گھی ہوگا۔ بریانی کیا خشکہ تھا وہ بھی اُبالا کہ ایک نوالہ نہ کھایا جائے۔

شاکرہ کا بھانجہ اتفاق سے کھانے پر ضد کرنے لگا۔ ماں سُنکر چپ ہوگئی بچہ تھا کہ کھڑا اور پڑا اٹھنیاں کھانے لگا۔ خالہ بولی بوا ایسی بھی غیریت کس کام کی۔ بریانی دم ہوگئی ممانی سے کہو بھائی انتظام نوالہ نکلوا لائیں گے۔ ماں نے ایک مٹی کی رکابی بچے کو دیدی کہ جا کر خالو سے نکلوا لا۔ خالو (سلیم) کو کیا عذر تھا۔ رکابی بھر لڑکے کے حوالے کی۔ گرم گرم بھلستی ہوئی بریانی۔ بھری ہوئی رکابی۔ پانچ برس کا بچہ، چوکھٹ پر چڑھتا تھا دھڑام سے گر پڑا۔ دوسری دفعہ میاں سلیم نے بھانجے کے ساتھ اتنی عنایت کی کہ دروازہ تک پہنچا گئے۔ ماں وہیں کھڑی تھی رکابی اور لڑکے کو لیکر دالان میں آئی۔ بریانی کو جو دیکھتی ہے تو ماشاءاللہ چاول اس خوبصورتی سے گلتھی ہوئے ہیں کہ سبحان اللہ نوالہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ بھکراند اس غضب کی آرہی ہے کہ ناک نہ دی جائے۔ گھی کا نام نہیں۔ زعفران کا پتہ نہیں۔ چاول ہیں کہ سفید بگلے کا پر پڑے ہوئے ہیں۔ لڑکے سے کہنے لگی میاں یہ کیا اٹھا لایا۔ جا دیغ (دیگ) میں سے نکلوا کر لا۔ بچہ تھا ضدی لگا ہائے بھوک کرنے۔ بھانجہ کی آواز سنکر شاکرہ کہتی ہوئی آئی۔ بوا! تم تو بالکل ہی دوئی برتتی ہو اپنایت کی یونہیں میں اکیلی کہاں کہاں پھروں کیا کیا کروں۔ کدھر کدھر دیکھوں۔ تم اتنی نہیں ہو کہ ذرا سا نوالہ نکلوا کر بچے کو منگا دو۔

بہن۔ منگوایا تو تھا خبر نہیں دولہا بھائی نے یہ کیا دیدیا۔ میرا تو دیکھ کر بھی جی متلانے لگا۔ سونگھو تو سہی کیسی گوشت کی لیساند آرہی ہے۔

شاکرہ نے رکابی اٹھا کر دیکھی تو ہوش اُڑ گئے۔ گھبرائی ہوئی دروازے پر

آئی۔ پردہ کرا کر چھوٹے مکان میں دیگوں پاس پہنچی۔ کونڈا اٹھا کر دیکھتی ہی تو بریانی چشم بددور۔ بیاروں کے منہ لائق۔

روپیہ کا روپیہ گیا۔ بدنامی کی بدنامی ہوئی۔ اتنا روپیہ نہ اتنا وقت۔ بیٹی کے شادی کرے تو کیا۔ باورچی نے مفصل کیفیت سُنائی۔ میاں انتظام کو خبر ہوئی وہ آئے سنکر چپ ہو گئے۔ کیا کرتی اور کس سے کہتی۔ صبر شکر کرتی ہوئی چلی آئی اور گم سم بیٹھ گئی۔

سلیم یہاں سے اُٹھ کر اُن صلاح کار پاس پہنچے۔ اس نے دور سے دیکھتے ہی کہدیا واہ ڈاکٹر صاحب اچھا گھی رکھا۔ تمھارے کنستروں کے ساتھ میری پانچ تولے کی سچی بیٹری بھی غارت ہو گئی۔

صبح چار بجے برات آئی شاکرہ سے جس قدر امید تھی اس سے زیادہ کر دکھایا عورت زات ہو کر اتنا معقول انتظام کیا کہ اتنی بڑی برات میں رتی بھر موقع کسی کو شکایت کا نہ ملا۔ مردانے میں تو جانے سے رہی۔ البتہ زنانے میں تین برس کے بچے سے لیکر ساٹھ برس کی بڑھیا تک سب کی خاطر مدارات ناشتے کا انتظام پان چھالیہ غرض کوئی کام ایسا نہ تھا جو قابل اعتراض ہو۔ نو بجے کے قریب نکاح ہوا۔ نکاح ہو چکا تو تھالی جوڑ میں دولہا کے واسطے شربت گیا۔ آدھا دولہا کو پلایا۔ آدھا دلہن کے واسطے آیا۔ گیارہ بجے کے قریب دولہا کو گھر میں بلایا۔ بہنیں آنچل ڈالکر لائیں۔

کیا مبارک وقت تھا عابد دولہا بنے ہوئے تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے کپڑے مہک رہے تھے۔ عطر کی لپٹیں آرہی تھیں۔ بیسیوں کارچوبی اور مصالحہ کے دوپٹے سر پہ پڑے ہوئے تھے۔ ماں کا دل دیکھ دیکھ کر باغ باغ تھا۔ عزیز اقارب سب خوش ہو رہے تھے۔ آنچلوں کی چھاؤں میں بہنوں کے ساتھ ساتھ عابد کمرے میں آکر بیٹھے چاروں طرف سے عورتیں گھیرے ہوئے تھیں۔ مولوی صاحب کی اجازت نہ تھی مگر آرسی مصحف ہوا۔ اس کے بعد میراسنوں نے سنڈھا گانا شروع کیا بیٹی کا رخصت ہونا۔

یوں ہی دردانگیز سماں ہے۔منڈھے سے طبیعتیں اور بھی بے اختیار ہوگئیں۔

عابد کی ماں غمزدہ تو تھیں ہی۔ منڈھے کا شروع ہونا تھا کہ بیٹی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ آنسا رؤیں کہ ہچکی بندھ گئی۔

اب جہیز نکلنا شروع ہوا۔کسی کو بھی یہ امید نہ تھی کہ شاکرہ اس شان و شوکت سے بیٹی کو رخصت کرینگی۔اکیس جوڑے مصالحہ سے پٹے ہوئے۔دولہا کے جوڑے کے ڈیڑھ سو روپے نقد۔اکیاون روپے سلامی کے۔تانبے اور شیشے کے برتن ملا کر دو سوسے کم نہ ہوں گے۔بلکہ دو چار زیادہ ہی سمجھنے چاہئیں۔ایک بلوری قاب کا جوڑا جو تمام شیشے کے برتنوں کا مول تھا۔رستے ہی میں شہید ہوا۔کیچڑ ہو رہی تھی۔چماری کا پیر پھسل گیا کھانچی سمیت نیچے آرہی۔شیشہ کی بساط ہی کیا ٹکڑے اڑ گئے۔

بڑے بڑے جنگی دو چوبی صندوق، کشتیاں، خوان، گھڑونچیاں، لسٹکن، نہانے کی چوکی۔طشت کی چوکی، جانماز کی چوکی (تھیں بھی تو بڑی نمازن) غرض پوری تیس چیزیں تھیں۔

اس جہیز کو دیکھ کر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شاکرہ کی تعریف نہ کرتا ہو۔قصہ مختصر سائرہ تانبے کے پلنگ چھپرکھٹ سے اس دھوم دھام کا جہیز لے کر دو بجے کے قریب میکے سے رخصت ہوئیں۔ دو بڑی بوڑھیاں ساتھ گئیں کہ سسرال میں شرم کی وجہ سے دقت۔ میکے کی جدائی کا زیادہ اثر اور ضرورتوں کے اظہار میں تکلف کی تکلیف نہ ہو۔

منازل السّائرہ حصہ دوم

منازل کے معنی منزلیں اور سائرہ کے معنی سب، گویا منازل السائرہ کا مطلب ہے سب منزلیں۔ مستورات کی زندگی کی سب منزلیں۔ پھر اس کتاب کی ہیروئن کا نام بھی سائرہ ہے اور اس میں اس کا بچپن، جوانی، بڑھاپا اور جو کچھ ایک عورت کو اپنی پوری عمر میں پیش آتا ہی دکھایا گیا ہے۔ یہ سارا قصہ دلچسپ و مؤثر ہونے کے علاوہ ہندوستانی خواتین کے لیئے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ صبح زندگی و شام زندگی میں اور منازل السائرہ میں صرف اتنا فرق ہے کہ صبح زندگی اور شام زندگی میں ایک بڑی معقول بچی بیوی اور ماں کی حالت ملتی ہے اور اس میں ایک نہایت نامعقول بچی بیوی اور ماں کی۔

صبح زندگی و شام زندگی کو پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ بس عورتیں ہوں تو ایسی ہوں اور منازل السائرہ کو پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے کہ خدا ایسی عورتوں سے پالا نہ ڈالے۔ اس وقت منازل السائرہ حصۂ اوّل آپ کے سامنے ہے۔

منازل السائرہ حصہ دوم جس میں سائرہ کی شادی کی بعد کی کیفیت ہے عنقریب شائع کرونگا۔

حصہ دوم حصۂ اول سے کہیں بڑھی چڑھی چیز ہے اور اس کی قیمت بھی ایک روپیہ ہے۔

واحدی

شام زندگی کیا ہے؟

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب لکھتے ہیں

کہ شام زندگی باعتبار ادب اردو زبان کا بہترین تحفہ ہے اور بلحاظ ضروریات خانہ داری کی کوئی بات اس میں چھوڑی نہیں گئی۔ اسکی عبارت کا زور اور اثر ہر شخص تسلیم کریگا۔ مولینا راشد الخیری کی تحریر مستورات کے بارے میں ہمیشہ دل کے پار ہوجایا کرتی ہے۔ ایسی مفید اور از سرتا پا مرصع کتاب کسی کی نظر سے نہ گزرے تو یہ اسکی بدنصیبی ہے۔

مولوی ظفر علی خاں بی اے (علیگ) تحریر فرماتے ہیں

کہ ہم میں سے کسی شخص کے اٹھ جانے سے جو جگہ خالی ہوجاتی ہے وہ اکثر خالی ہی رہتی ہے لیکن یہ کلیہ کم از کم مصنف مراۃ العروس کی جانشینی کے متعلق مولینا راشد الخیری کے گلریز قلم نے متعدد لطیف و پاکیزہ تصانیف کے سلسلہ سے باطل کردیا۔ شام زندگی مولینا کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ عورت کو بچپن سے لیکر بڑھاپے تک میکے اور سسرال میں بیٹی بہن بی بی اور ماں ہونیکی حیثیت سے جتنی عمرانی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں سب کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویریں ناظرین کے سامنے آجاتی ہیں زبان ایسی صاف اور شستہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے ابھی کوثر میں دھلکر آئی ہے۔

اخبار تہذیب النسواں کی رائے ہے

کہ مولینا راشد الخیری کا طرز بیان حد درجہ دلآویز ہے۔ دہلی کا خالص روزمرہ اور بیگمات کی پرلطف زبان لکھنا اور معاشرت کا فوٹو اتارنا ان کا طغرائے امتیاز ہے۔ شام زندگی میں اُنہوں نے ایک خاتون کی شادی سے لیکر موت تک کا نقشہ کھینچا ہے اور دکھلایا ہے کہ ہماری بہنیں اور بیٹیاں۔ ساس سسروں، نند دیوروں اور خود شوہر کو کس طرح خوش رکھ سکتی ہیں اور شوہر کے گھر کو کیونکر بہشت بنا سکتی ہیں۔ ایک روپیہ چار آنے ان انمول موتیوں کے مقابلہ میں جو ۲۴۴ صفحات پر بکھیرے گئے ہیں کچھ شے نہیں۔

اخبار شریف بی بی کی رائے ہے

کہ شام زندگی میں جو کچھ لکھا ہے اسکے موافق بیویاں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کریں تو اُنکی وہ تمام بُرائیاں چند روز میں دور ہوجائیں جنکا رونا رویا جایا کرتا ہے سچ یہ ہے کہ شام زندگی سے بہتر اس وقت تک فرقہ اُناث کے لیئے کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ دلچسپ اور مؤثر اتنی ہے کہ اسکا ایک صفحہ پڑھنے کے بعد ناممکن ہے کہ اسے ہاتھ سے چھوڑا جاسکے۔ جو لوگ اپنی عورتوں کو بہترین عورت بنانا چاہتے ہیں وہ شام زندگی ضرور پڑھیں۔

اخبار مشرق کی رائے ہے

کہ شام زندگی بظاہر درد و غم کی داستان ہے لیکن صنف نازک کی تعلیم و تربیت کے لیئے ایک بڑی قابل معلمہ کا کام دیتی ہے۔

اخبار الفضل کی رائے ہے

کہ شام زندگی میں قابل مصنف نے نہایت عمدگی سے آداب معاشرت، اطاعت شوہر، انتظام خانہ داری، تربیت اطفال، ازالۂ توہمات کو بیان کیا ہے۔ آگرہ اخبار کی رائے ہے کہ مولانا راشد نے اپنی تمام عمر کے تجربوں کو جو بہو بیٹیوں کے تعلقات دیکھتے دیکھتے انھیں ہوچکے ہیں شام زندگی میں جمع کردیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی رائے ہے کہ شام زندگی اس لائق ہے کہ کل شریف گھرانوں میں خواتین کے مطالعہ سے گزرے اور بچوں کو بطور درسی کتاب کے پڑھائی جائے۔ قیمت سوا روپیہ

صبح زندگی

یہ شام زندگی کا پہلا حصہ ہے، شام زندگی میں نسیمہ بیگم کی شادی سے موت تک کے حالات پڑھنے سے پہلے ذرا ان کا کوارپنہ بھی دیکھ لو۔ اس سے تمہیں پتہ چلیگا کہ ایک لڑکی کی پیدائش سے شادی تک کیونکر تعلیم و تربیت کرنی چاہیئے۔ علامہ راشد الخیری اس قسم کے مضامین کو دلچسپ اور مؤثر بنا دینے میں جو ملکہ رکھتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ تمھاری بیٹیوں کی آتالیق ہے۔ تمہاری بیویوں کی مشیر ہے اور خود تمھاری ذات کے لیے لٹریچر کا بیش بہا خزانہ ہے۔ انمول قصہ ہے۔ اس سے کام لو نصیحت پکڑو اور لطف اٹھاؤ۔ صبح زندگی میں درد بیان۔ کیف زبان اور زندگی کا سامان سب کچھ موجود ہے۔ قیمت عہ

صبح زندگی اور شام زندگی

کا تیسرا حصّہ

شب زندگی

صبح زندگی میں نسیمہ کے بچپن اور جوانی کو دکھایا گیا ہے اور شام زندگی میں اسے آخری منزل تک پہنچایا ہے۔ شب زندگی میں موت کے بعد کی سرگزشت پڑھو اور اپنے بیوی بچوں کے سامنے نسیمہ کا نمونہ پیش کر کے اُنہیں اس جیسا بناؤ تاکہ وہ یہاں بھی اچھے بیج بوئیں اور وہاں بھی اچھے پھل کھائیں۔

صبح زندگی اور شام زندگی مفید ہونے کے ساتھ جیسی مؤثر اور درد انگیز کتابیں ہیں۔ آپ کو اُن کا علم ہے۔ پھر شب زندگی جو ستم نہ ڈھائے کم ہے۔

علامہ راشد الخیری کی ہر سطر جادو کا کام کرتی ہے اور شب زندگی اُن کا ماسٹر پیس ہے۔

قیمت حصۂ اول عہ ۔ حصۂ دوم عہ

ملنے کا پتہ

مینیجر نظام المشائخ پوسٹ بکس ۱۵ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منازل السائرہ

حصہ دوم

تصنیف

مصور غم علامہ راشد الخیری مدظلہ

مصنف صبح زندگی. شام زندگی. بنت الوقت. سراب مغرب وغیرہ وغیرہ

سے

ملا محمد واحدی دہلوی

نے

بماہ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ ہجری النبوی مطابق اکتوبر ۱۹۲۹ء عیسوی

تیسری مرتبہ

میرزا محبوب بیگ صاحب کے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

(قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول)

منازل السائرہ
کا
نام اور مضمون

پریس ایکٹ کے علاوہ انڈین کاپی رائٹ ایکٹ اور مجموعہ تعزیرات ہند کی دفعات ۴۷۸ و ۴۷۹ کے ماتحت بھی رجسٹری کرالیا گیا ہے لہذا کوئی صاحب لالچ میں آکر اس کے نام اور مضمون سے فائدہ اٹھانے کا کبھی قصد نہ کریں ورنہ دیوانی ہی نہیں فوجداری جرم بھی ہوگا۔ جسکا نہیں برا خمیازہ بھگتنا پڑیگا

پبلشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منازل السائرہ

حصّہ دوم

(۳۵)

شادی بیاہ کی وہ رسوم جو شرک و گناہ سے تعبیر کی جاتی ہیں سب دلہن ہی کے گھر پر ختم ہو گئیں۔ دولہا کے یہاں جا کر غل و شور کے علاوہ کوئی قابل الذکر معاملہ، انوکھی رسم، نئی بات پیش نہیں آئی۔

دوسرے دن دوپہر کو شاکرہ نے سمدھن کو چوتھی کی اطلاع اور پچاس آدمیوں کی دعوت کہلا بھیجی۔ مگر مولوی صاحب نے چوتھی کی اجازت نہ دی۔ شاکرہ کو ناگوار بھی ہوا مگر کرتی کیا۔ دلہن صبح کی آئی ہوئی تھی شام کو دولہا والے پچاس آدمی لے کر آ گئے چوتھی نہ ہوئی، چالا ہوا، کھانا کھا پی دولھن کو لے کر چلے گئے۔ تیسرے روز صبح کو مولوی صاحب اشراق سے فراغت اور مریدوں سے فرصت پا کر گھر میں تشریف لائے بہو جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ چپکے چپکے کچھ دعا پڑھتے رہے۔ پڑھ چکے تو بہو کا مُنھ کھولا۔ دم کیا، اور خدا حافظ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب مل جل کر باہر آ گئے۔

سیکڑوں آدمیوں کا مجمع تھا۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اسباب لد چکا تھا۔ گھر بار کو سپرد خدا کیا اور حج کو روانہ ہو گئے۔

سائرہ کنواری ہی کی حالت دیکھ کر اندیشہ تھا کہ یہ بیاہی جا کر کیا کر گی۔ میکے میں باوجودیکہ کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ ڈیڑھ ہاتھ کی زبان تھی سسرال گئی تو خاطر مدارات شروع ہوئی۔ مزاج تھا کہ ساتویں آسمان پر پہنچا۔ مہینہ بیس دن تو شرما شرمی گذر گئے۔ چالوں کا ختم ہونا تھا کہ لڑکی کو سیدھے منہ بات کرنا شم ہو گئی۔ کھاتا ہے کہ صبح سے شام تک بڑا جھک مار رہا ہے۔ میاں ہیں وہ گھنٹوں بیٹھے خوشامد کر رہے ہیں۔ ساس ہیں وہ منتیں کر رہی ہیں بچوں کا بھابی دولہن بھابی دولہن کہتے منہ خشک ہو رہا ہے۔ وہ کمبخت ہے کہ کان پر جوں نہیں چلتی۔ سسرے موجود ہی نہ تھے۔ بڑی بوڑھی کہو۔ سر کا سرتاج کہو، اچھا کہو برا کہو۔ لے دے کر ایک ساس کا دم تھا۔ ڈیڑھ دو مہینہ تک تو خیر اُن کا رعب، شرم حیا لحاظ کچھ نہ کچھ باقی بھی رہا۔ پاؤں بھاری ہونا تھا کہ ساس بیچاری پاؤں کی جوتی ہو گئیں۔ آتے اور جاتے اُٹھتے اور بیٹھتے سامنے اور پیچھے لعنت اور ملامت کوسنے اور فضیحتیاں، دھتکار اور پھٹکار۔ سائرہ جیسی بیوی اور عابد جیسا میاں۔ جو ناچ نچاتی ناچتا، کان پکڑ کر اٹھاتی اور کان پکڑ کر بٹھاتی۔ نوکر کو عذر ماما کو عذر اور اس غریب کو عذر نہیں، عابد جیسا آدمی جس نے آج تک کسی غیر کی بھی دلشکنی نہ کی۔ جس نے کہا اور جو کچھ کہا، فائدہ ہو نقصان ہو وہ تعمیل کو آمادہ۔ سائرہ تو بیوی تھی پہلے ہی دن سوچ چکی تھی کہ بالکل گاؤدی معلوم ہوتا ہے اس کا مرید کر لینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ البتہ ایک ساس کا جھگڑا ہے اس کی بھی انشاء اللہ کوئی تدبیر نکالوں ہی گی۔

ساس آج سے کیا منگنی ہی سے بہو کی تعریفیں سُن رہی تھیں۔ بہو کا گھر میں پاؤں رکھنا تھا پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگیں۔ مگر اُن کا رشتہ ہی ایسا تھا

کہ لاکھ محبت کرتیں سب خاک تھی۔ کتنا ہی لحاظ کرتیں کتنی درگزر کرتیں ساس گیری کا نام کہاں سے مٹ جاتا۔ اُن جیسی بردبار اور بے شر عورت کہ کبھی کسی معاملہ میں دخل ہی نہ دیں۔ مگر بہو کیا ایک عذاب تھا کہ زندگی دوبھر کردی۔ گھر میں رہنا اجیرن ہو گیا بھاری بھر کم آدمی زمانہ دیکھے ہوئے۔ دو بہوئیں برتے ہوئے۔ خوب سمجھتی تھیں کہ اگر ذرا مُنہ لگتی ہوں تو سات پشتوں کو نپکر رکھدے گی۔ لیکن اس مکار کے سر پر کچھ ایسا جن سوار رہوا کہ ہر وقت اسی تاک میں تھی کہ کوئی موقع ملے تو دل کی بھڑاس نکالوں ہر بات میں اڑ نگا لگاتی۔ واسطہ نہ غرض، آس نہ پاس، کام کسی کا بات کسی کی۔ اپنے سے مطلب ہو نہ ہو بولنا ضرور۔

ساس کیا اتنا بھی نہ جانتی تھیں۔ طرح دیتی تھیں۔ دیکھتیں اور مُنہ پھیر لیتیں سُنتیں اور ٹالدیتیں۔ لیکن کہاں تک اور کب تک۔ ایک گھر کا رہنا سہنا۔ ایک جگہ کا اُٹھنا بیٹھنا۔ پھر ساس بہوؤں کا رشتہ آخر ایک دن مڈ بھیڑ ہو ہی گئی۔

عشرے کا دن تھا عورتوں کے عقائد علی العموم مردوں سے مختلف ہوتے ہیں اور پھر مولوی صاحب کا گھر تو ماشاء اللہ مذہب کی کان تھا۔ چھوٹے اور بڑے بوڑھے اور جوان غرض بچہ بچہ مذہب پر جان دیتا تھا۔ گھر والے تو گھر والے نوکر اور ماماؤں کی اتنی مجال نہ تھی کہ ایک وقت کی نماز قضا کرلیں۔ ماماؤں کے تغیّر و تبدل میں اگر کوئی بے نمازن پلے پڑ گئی تو اس کے پکائے ہوئے کھانے کے پاس جانا گناہ اور ہاتھ لگانا حرام۔ سائرہ کے علاوہ اس دن گھر بھر روزے سے تھا۔ یہ ساس کی محبت، شرارت، انسانیت، عداوت جو چاہے کہہ لو۔ صبح کی نماز پڑھ کر سب سے پہلا کام گوشت ترکاری کے دام ماما کے حوالے کیئے۔ ایک آدمی کا پکنا ہی کیا۔ جب تک ماما واپس آئی۔ ساس نے آٹا گوندھ۔ توا رکھ روٹی ڈال لی۔ مصالحہ بھون رہی تھیں کہ گوشت آگیا۔ جلدی سے بگھار، ترکاری ڈال سالن تیار کر

پتیلی کی پتیلی اور دسترخوان کا دسترخوان یوں کا یوں ہی بہو کے کمرے میں رکھوادیا
بہو بیگم چھپر کھٹ میں پڑی آرام کر رہی تھیں۔ نو بجے کے قریب سوکر اٹھیں۔ اتفاق
سے نظر پتیلی پر جا پڑی۔ کھولکر دیکھا تو سالن جما ہوا، دسترخوان دیکھا تو روٹیاں ٹھنڈی
ماما سے کہا بیگار تھوڑی ہے جو باسی کوسی کھانا میرے منہ پر پٹک گئیں۔ ساس نے اٹھکر
سالن گرم کیا۔ آپ لے کر گئیں۔ خدا خدا کرکے بہو کا مزاج درست ہوا تو ساس
کی محنت ٹھکانے لگی۔

کھانے سے فرصت ہوئی تو نہانے کا حکم چڑھا۔ ماما نے آنو لے پیسے۔ ساس نے
پانی گرم کیا۔ میاں جاکر منہیاری کو لائے۔ سائرہ نہائی، نہاکر کپڑے بدلے، چوڑیاں
پہنیں۔ ساس ظہر کی نماز پڑھ کر بہو کے پاس سے نکلیں۔ چوڑیوں کا آداب تو درکنار
چھوٹی روزہ دار نند سے پانی منگوایا، اور وہیں کھڑے کھڑے پی لیا۔ ساس بیچاری کی جو
شامت آئی منہ سے اتنا نکل گیا بیٹی نہا دھوکر تو دو فرض پڑھ لیا کرو۔ خدا کو سجدہ کرنا
گناہ تھوڑی ہے۔ اللہ رکھے دن سر پر چلے آرہے ہیں کچھ تو خدا کا خوف کیا کرو۔

بہو۔ میں مرجاؤنگی تم خوش ہوجانا میں بری ہوں اب کے اچھی لے آنا۔ نماز
خدا کی ہے یا ساس نندوں کی، پھر تم کہنے والی کون۔ گناہ ہوگا تو مجھے، پکڑی جاؤنگی تو
میں، تم تو میری قبر میں نہیں سوؤگی۔ مجھے ایسے ڈھکوسلے نہیں آتے، دن بھر لوگوں کی
بدیاں کریں رات بھر غیبتیں کریں۔ دکھانے کو گز بھر کی تسبیح لے بیٹھیں۔ بڑی بیٹی کو بھجایا
کہ رمضان تک کے روزے رکھنے نصیب نہ ہوتے تھے، کوئی بات نہ ہوئی اسی پر رکھ کر
دبالیا۔ میں بہو ہوں لونڈی تو ہوں نہیں۔ ہر وقت دبی پلی ہی بنی رہونگی۔ یہ بھی اس
دن کا برا ہوگیا کہ خواہ مخواہ کا جھگڑا لے بیٹھیں۔ میں ایسے ادب و لحاظ کو چولھے میں
جھونکتی ہوں، اب تک سنیں اب نہیں سنی جاتیں۔

ساس۔ بیٹی! خدا سے ڈر کے بات کرو۔ میں تو آپ تم کو ہوا سمجھتی ہوں کس دن

تمہاری شان میں گستاخی کی ہے۔ آج اتنا کہنے کی گنہگار ضرور ہوں، اسکی سزا بھگت لی اب بھی پیٹ نہیں بھرا۔ جوتی لیکر آجاؤ۔ میری مری ہوئی بیٹی کا کیوں نام لو۔ اس جیسی نمازن تو تمہارے کینبے میں نہو گی۔ تمہارے ہاں کبھی کسی نے نماز پڑھی ہو تو جانو۔ آج تک اماں کو نصیب ہوئی نہ باوا کو۔ دادی کو نہ دادا کو۔ اس گھر میں رہو گی تو نماز پڑھنی ہی پڑے گی۔

بہو۔ تمہارے ہاں تو سب پیغمبر ہی پیدا ہوئے ہیں۔ میرے دادا اور دادی تمہارے آگے ہاتھ جوڑنے آئینگے تو تم اُن کو نہ بخشوانا۔ میرے اماں باوا نماز نہیں پڑھتے تو کیوں بڑوں کی بری کو ہاتھ جوڑ کر لائیں۔ آگ لگے اس گھر کو ہر وقت کا جھینکنا ہے۔ کوئی گھڑی بھی چین کی نہیں۔ ایک پل چاہو کل سے گزر جائے نصیب نہیں۔ ساسوں کو ایسا چرچا کرتے ہم نے آجتک نہیں سُنا۔ نماز کیوں نہیں پڑھی۔ روزہ کیوں نہیں رکھا۔ روٹیاں کے کھائیں۔ سوئیں کس وقت۔ اُٹھیں کب۔ نہائیں کیوں۔ سر کیوں گوندھا۔ پان کیوں کھایا۔ مسّی کیوں لگائی۔ کہاں تک صبر کروں۔ کب تک انگیزوں۔ چار مہینے اسی پیٹنے میں گزر گئے۔ کلیجہ پک گیا۔

ساس۔ بیوی ذرا دیکھ کر کہو اور سمجھ کر بولو۔ میں تمہاری ساس ہوں برابر کی سہیلی نہیں ہوں۔ میں نے ایسی بہوئیں دیکھیں نہ سُنیں۔ میں اس زبان کی لاگو، نہ اس مزاج کی گاہک۔ جوتیاں کھائیگا تو میاں کھائیگا جسکا نکاح بندھا ہے میری جوتی کو بھی غرض نہیں کہ تمہارے مُنہ لگوں۔

بہو۔ میری زبان تو ہے ہی۔ ذرا اپنا مزاج تو دیکھو تم نے تو ایسی بہوئیں دیکھی ہی نہیں میں ایسی ساس کو ساس نہیں سمجھتی۔ سب ایسی ہی ہوا کریں تو بہوؤں کا گذر ہی نہ ہو۔

ساس۔ مجھ جیسی ساس چراغ لیکر ڈھونڈھو تو نہ ملے۔ تم ہی آج نرالی بہو تھوڑی آئی ہو۔ دو اور بھی بیٹھی ہیں۔ تمہاری زبان کا تو سارے شہر میں ڈنکا بج رہا ہے۔ جس سے

چاہے پوچھ لو۔ ہمیں تو بات کا پاس ہے اور لاے کی لاج۔ ہر طرح بھرنا پڑیگا۔ خدا دو سینگ دیدے تو بھگتنے ہی پڑیں گے۔

ساس کے مُنہ سے اتنا نکلنا تھا بہو تو آپے سے باہر ہو گئی۔ ایک بات ہو تو کہی جائے، ایک گستاخی ہو تو دُہرائی جائے جو جو مُنہ میں آیا سب ہی کہہ ڈالا۔ یہ بھی نہیں کہ دو چار منٹ بلکہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ۔ دریا بہہ رہا تھا کہ کہیں رُکا وُہی نہ تھا۔ ساس بیچاری خود تو کیا ایسی لڑی ہونگی کبھی عمر بھر ایسی لڑائی دیکھی بھی نہ ہو گی۔ تسبیح پڑھنی مشکل ہو گئی اور تو کچھ بن نہ آئی، جانماز اُٹھا کمرے میں روتی ہوئی چلی گئیں۔

عصر کے بعد بلند اقبال اوپر سے آئے روزے نے پتلا حال کر رکھا تھا ہونٹ خشک پھپیڑیاں بندھی ہوئی، چہرہ اُترا ہوا، اوسان بگڑے ہوئے۔ آتے ہی پلنگ پر لیٹ گیا۔ بہن سے پوچھا اماں کہاں ہیں؟ وہ کمبخت منہ ہی منہ میں کچھ کہکر چپکی ہو گئی بھائی نے تین دفعہ پوچھا اور بہن نے ہر دفعہ جواب دیا مگر ایسا ناک میں کہ خاک سمجھ میں نہ آیا۔ چوتھی دفعہ چیخ کر پوچھا ذرا سمجھا کر کہو۔ تین دفعہ کہا اور میری سمجھ میں ایک دفعہ نہ آیا۔

سائرہ اپنے کمرے میں بیٹھی مہندی لگا رہی تھی (یہ تو خدا ہی جانے کہ پہلے سے ارادہ تھا یا اب پیدا ہوا) مہندی چھوڑ پیالہ پھینک ننگے سر ننگے پاؤں باہر آ کھڑی ہوئی۔ بہن کچھ جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ بھاوج کی شکل دیکھ کر خون خشک ہو گیا۔ بھائی نے پھر پوچھا مگر چپکی بیٹھی رہی۔ سائرہ بولی۔

ہیں کہاں اندر ہیں اور کہاں ہونگی، ان کے تو سر پر جن سوار ہے۔ اتنا کہا سُنا اور پھر بھی کلیجہ میں ٹھنڈک نہ پڑی۔

میاں ۔کس بات پر ناراض ہو گئیں؟

بیوی۔ وہ سدا کی ناراض ہیں آج کوری بیٹھ پیچھے کھوڑی لگے ہیں وہ ایک

دفعہ ناراض ہیں۔ ہیں دس دفعہ ہوں۔ میں ایسی ناراضگیوں کی پروا نہیں کیا کرتی۔ ناراض ہوں تو بلا سے۔ خفا ہوں تو صدقے سے۔

میاں۔ ہائیں ہائیں ذرا زبان کو روکو۔

بیوی۔ بس مجھ کو معاف کرو۔ اماں کی زبان نہیں رکوائی جاتی۔ مجھ کو منع کرتے ہو۔ تالی دونو ہاتھ سے بجتی ہے۔ میرا اکیلی کا قصور ہو تو کوئی قائل کرے۔

میاں۔ اچھا تم اپنے کمرے میں جاکر بیٹھو۔

بیوی۔ کمرے میں کیوں بٹھاتے ہو۔ گھر ہی سے نکالدو کہ گھی کے چراغ جل جائیں۔ اُنکی تو یہ مراد ہی ہے۔ دن رات سر ہونگی تو آدمی کب تک بولیگا ایک بہانہ چاہیئے یہ کرو وہ کرو۔ کبھی آجتک کسی بیمار کو روزہ رکھتے سُنا بھی ہے۔ مگر وہ تو میری جان کے پیچھے پڑی ہیں کہ کسی طرح کل کی مرتی آج ہی مرجائے۔

میاں۔ بس بس جاؤ اپنا کام کرو۔

بیوی۔ اے واہ واہ۔ یہاں ان دھمکیوں میں کوئی نہیں آتا۔ اُن ہی پر جاکر حکومت جتاؤ۔ میری پاپوش بھی یہ اغماض نہیں اُٹھاتی۔ میں کسی کی نوکر نہیں، ماما نہیں، لونڈی نہیں، باندی نہیں، مزاج اٹھائیں نہ اٹھائیں اماں بہنیں۔

میاں کیوں باتیں بنارہی ہو اگر میرے مُنہ سے کچھ نکل گیا تو روزہ کا نام ہوگا تم کو رہنا ہے تو سیدھی طرح رہو۔ نہیں چلی جاؤ۔ میں ہی چلا جاتا ہوں۔

روزے کی خوشی میں افطار کی تیاری بچوں نے دوپہر ہی سے شروع کردی تھی۔ پھلکیوں کا بیسن۔ سہالوں کا آٹا، پتے، ہری مرچیں، گڑ، تیل، گھی سب سامان ہوگیا تھا عصر کے بعد کڑھائی کی تجویز تھی۔ بہو بیگم کی عنایت سے سب مٹی ہوگیا۔ کھانا بھی صرف اس وجہ سے تیار ہوگیا کہ ماماؤں نے جو کچھ سمجھ میں آیا کرکرالیا ساس بیچاری پر تو کچھ ایسی ندامت سوار ہوئی کہ اسوقت کی گئی گئی کوٹھری کی کنڈی جو اندر سے

لگا کر بیٹھیں تو مغرب کی اذان سُنکر باہر آئیں۔ پانی کا ایک گھونٹ پی روزہ کھول پھر اندر جالیٹیں۔ کھانے کے واسطے سب ہی نے منتیں کیں۔ سائرہ کے سوا سارے گھر ہی نے ہاتھ جوڑے مگر کچھ ایسا غصہ چڑھا کہ نہ کھانے کو ہاتھ لگایا نہ باہر آئیں۔

اُن کے کھانا نہ کھانے سے تمام گھر کو کھانا حرام ہوگیا۔ بچے تک بھوکے سوگئے منجھلی بہو نے دولھا دولھن کا کھانا نکال کر کمرے میں بھیجدیا۔ عابد بے شر تھا پاگل نہیں تھا کہ آٹھ آٹھ برس کے بچے کل شام کا کھانا کھائے ہوئے بھوکے پڑ رہیں اور وہ بیوی کے ساتھ بیٹھ کر ٹھونس لے۔

سائرہ دسترخوان بچھا کھانے بیٹھیں، ایک ہی نوالہ کھایا تھا کہ کچھ خیال آیا۔ میاں سے کہنے لگیں کھاتے ہو تو کھاؤ نہیں تو میں تمھارے کھانے کی بھوکی نہیں ہوں میاں نے کچھ جواب نہ دیا، بیوی نے روٹیاں لپیٹ دسترخوان اٹھا چھینکے پر رکھدیا۔ ماما سے تین پیسہ کا دودھ منگوا پی سو رہی۔

عابد کی ماں پہلے ہی آئے دن کی بیمار تھیں۔ بیٹی کی موت نے اور بھی رہا سہا کھو دیا تھا۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ بہو کی زبان درازی نے بالکل ہی بٹھا دیا اُدھر روزے کی نقاہت اُدھر بیٹھا بٹھایا دہا کا۔ اُٹھ کر دانہ منہ میں گیا نہیں۔ رات کو اس غضب کا بخار چڑھا کہ سرسام تک نوبت پہنچ گئی۔ سب پریشان ہوگئے۔ مگر واہ بی سائرہ۔ رات بھر ڈاکٹر اور حکیم آئے گئے لیکن اسکو خبر بھی نہیں ہوئی۔ کچھ زندگی تھی جو بچ گئیں ورنہ مایوس تو سب ہی ہو چکے تھے۔ بخار تو جاتا رہا مگر کمزوری اتنی زیادہ ہوگئی کہ ذرا کھڑی ہوئیں اور چکر آئے۔

خانہ داری کے جھگڑے اور گھروں کے دھندے جس کام کو ہاتھ نہ لگے وہی چوپٹ۔ جو چیز ماماؤں پر چھوڑ دی اُسی کا ناس۔ دو بہوئیں اور بھی تھیں اور سعادتمند منتظم سلیقہ شعار سگھڑ، فرمانبردار، مگر جسکا کام ہو وہی خوب انجام دے سکتا ہے۔ سب سے بڑی دقت دیو رانی

جٹھانیوں کی رد و کد تھی۔ وہ کہے یوں وہ کہے یوں۔ ایک آگ ایک ہوا۔ وہ اس سے سوا، وہ اس سے سوا۔ غرض دس پندرہ روز تک ایسی خاک اڑی رہی کہ گھر بازار ایک معلوم ہوتا تھا۔ باورچی خانہ کو جا کر دیکھو تو بالکل بھٹیار خانہ۔ پتیلیاں ایک طرف پڑی جھک مار رہی ہیں، لوٹے دوسری طرف پڑے لڑھک رہے ہیں۔ سینیوں پر مکھیاں بھنک رہی ہیں، صافیاں چکٹ، دستر خوان چوہا۔ جو چیز ہے وہ بے ڈھنگی اور جو کام ہے وہ بے قرینے۔

ذرا چلنے پھرنے کی طاقت آئی تو سب چیزوں کا ٹھیک ٹھاک کیا۔ اس جھمیلے سے فرصت ہوئی تو بہو کا زچہ خانہ سر پر چلا آ رہا تھا۔ سائرہ کی خوش قسمتی سے پہلوٹھی کا بچہ اور پہلا زچہ خانہ تھا۔ ہر قسم کے افکار سے آزاد تھی، مگر نہ بھی ہوتا تو سائرہ کچھ کرنے والی بندی نہ تھی۔ سارا فکر ساس ہی بیچاری کے سر پر تھا۔ وقت یہ تھی کہ نگاہ کمزور۔ کئی دفعہ نہالچے پوتڑے لیکر بیٹھیں مگر ٹانکا ہی نہ دکھائی دیا۔ کہیں بڑی بہو کی خوشامد کی، کہیں منجھلی سے کہا۔ تھیلیوں کا موٹا کام تھا ڈورے آپ ڈالے، غرض وقت سے یا مصیبت سے کرنا سب پڑا۔

(۲۶)

چھالیہ گھر کے خرچ کی اکٹھی آجایا کرتی تھی۔ بہوؤں کی پٹاریاں الگ تھیں۔ علیحدہ علیحدہ مل جاتی تھی۔ اب کے چھالیہ پندرہ سیر، زچہ خانہ کی پانچ سیر، گھر کی اکٹھی بیس سیر آئی۔ بوری کی بوری۔ یوں کی یوں ہی سلی ہوئی رکھی تھی۔ منجھلی کے پاس چھالیہ ہو چکی۔ ساس سے کہا اماں جان مجھکو چھالیہ دیدیجئے۔ سائرہ سامنے بیٹھی ہوئی تھی، ساس نے کہا چھوٹی دلہن بیٹی ذرا اتنا کام کر دو۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سیر دونوں جٹھانیوں کو دیدو سیر بھر میرے ہاں رکھوا دو۔ باقی تول کر تھوڑی تھوڑی کترنے دیدو۔

سائرہ نے اس وقت ساس کے حال پر بڑی عنایت کی کہ تعمیل کو فوراً کھڑی ہو گئی۔

اس کے مزاج سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ ساس کو ٹکڑا توڑ کر جواب دیدیتی ماماؤں سے پکڑوا کر بوری اپنے کمرے میں لے گئی۔ ترازو بٹ منگوا چھالیہ تولنے لگی۔ سوا سوا سیر اُن دونوں کی تولی تین پاؤ ساس کی تول ماما کے ہاتھ بھجوادی، بڑی تو سیدھی تھی لیکر رکھ لی مگر منجھلی ایک چلتا پرزہ ماما سے بولی یہ تو قیامت تک بھی ڈیڑھ سیر نہیں ہے۔ ہاتھ نیپڑے ہیں، شرط سہی، جو یہ چھالیہ ڈیڑھ سیر ہو۔ چھوٹی دُلہن بوا یہ چھالیہ کتنی بھیجی ہے؟

سائرہ۔ ڈیڑھ سیر بھیجی ہے اور کتنی بھیجتی۔ اعتبار نہ تھا تو تلوائی کیوں تھی، بوری پڑی ہے منگوالو۔ لال تھوڑی لگے ہیں جو میں نے توڑ لئے۔

برابر کا رشتہ برابر کا دعویٰ جیسی بہو وہ ویسی بہو وہ۔ منجھلی وہ چھوٹی وہ۔ ایک سے ایک بڑھی ایک سے ایک چڑھی۔ دیتیں نہ دیتیں ساس دیتیں منجھلی کو دینے کی وجہ کیا اور ضرورت کیا۔ ماما سے کہا ترازو اُٹھالا، ماما کا ترازو مانگنا تھا کہ سائرہ جامے سے باہر ہوگئی۔ ماما ترازو ادھر لائی اُدھر اس نے بکارنا شروع کیا مگر یہ خدا کا شکر تھا کہ کمرے ہی میں بیٹھے بیٹھے۔ باہر نہیں آئی، نہیں تو پوری ہی جنگ ہو جاتی۔ ساس بیٹھی تھلی میں عناب بھر رہی تھیں کچھ دیر تو چپکی بیٹھی رہیں مگر جب دیکھا کہ اب ان دونوں کی بڑھی تو اُٹھیں۔ چھالیہ دیکھتے ہی کہا نپ گئیں کہ کم ہے مگر اُن کا مسشرب نا تھا نہ کہ بڑھا اُن کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر کہیں ان دونوں کی ہو پڑی تو مزاج دونوں کا گندا ہے۔ نہ وہ اُس کا لحاظ کرے گی نہ یہ اس کا، پھر لڑائی میں پھول پان تھوڑی بٹتے ہیں۔ جو اس کے منہ میں آئیگا وہ کہیگی جو اس کی زبان پر آئیگا وہ سنائیگی، مفت کے پیسٹے میں میں آؤنگی جدھر بولوں بری۔ منجھلی کو سچا بناتی ہوں تو چھوٹی کچا کھا جائے گی۔ چھوٹی کی حمایت لیتی ہوں تو منجھلی پیچھے۔ پہلے منجھلا اور پھر منجھلی دونوں جان کو آجائیں گی۔ اماں منجھلی کیا اور منجھلا کیا، چھوٹی کیا اور چھوٹا کیا جو سُنے گا وہ کہے گا۔ یہ بڑی بوڑھی سر پر بیٹھی کیا کر رہی تھیں جو آگے دیکر مینڈھے لڑوائے۔ لڑائی کی تیاری تو دیورانی جٹھانیوں

کی ہوئی اور ساس بیچاری کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھوٹی سے تو بات ہی کرتے ہوئے ڈرتی تھیں منجھلی سے کہنے لگیں:۔

منجھلی بہو بیٹی تو کیا دو چار ڈلیوں کے واسطے جھگڑا کیا۔ میرے ہاں سے لے لو۔ ہوئی چھالیہ ہے۔ جان آدم تھوڑی ہے۔

منجھلی۔ اماں جان چھالیہ کا خیال نہیں ہے وہ اور پاؤ سیر لیں۔ یہ تو باتوں کی بات ہے۔ ایک تو کم دیں اوپر سے جھوٹ بولیں۔ دیکھئے سوا سیر بھی تو نہیں ہے۔ یہ سیر ہے اور یہ پو سیر اب بھی اُڑ رہی ہے۔ یہ سیر اڑھکنا چھٹانک بھر کا ہے اتنی اور کم ہے دیکھ لیجئے کیا کیا کہہ رہی ہیں میرے باوا دادا کیوں چور ہونے لگے جن کے ہاں چور ہوتے ہیں وہ قدر جانتے ہیں۔

ساس منجھلی دُلہن خدا کے لئے تم ہی چپکی رہو۔ وہ کہتی ہے کہنے دو۔ تم بڑی ہو درگذر کرو۔

منجھلی۔ بھلا جناب آپ مجھ ہی کو دباتی ہیں۔ میں نے ایک بات بھی بیجا کہی ہو تو بتا دیجے وہ چھوٹی ہو کر دیکھئے کیا کیا کہہ رہی ہیں۔

سائرہ۔ ہاں ہاں میں کیا کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ تمھارے ہاں سب چور بھرے پڑے ہیں جیسی تم آپ ہو ویسا ہی اوروں کو سمجھتی ہو، بھائی نصیر کے ہاں چھٹی میں اُستانی جی کی پہونچیاں تمھاری ممانی کے پاس سے نکلیں نہیں نکلیں۔

منجھلی۔ اوئی اور سنو۔ میری ممانی کجا اور بھائی نصیر کجا۔ وہ تو بیچاری جس دن سے رانڈ ہوئیں قسم لے لو جو گھر سے باہر قدم بھی نکالا ہو۔

سائرہ۔ جانے میری جوتی لیں یا نہیں لیں۔ یہ ہی تمھاری رحیما کہتی ہے۔

رحیما۔ اے ہے بچّی ڈر خدا سے میں نے کس وقت کہا ہے۔

سائرہ۔ اب مُکرنے کی تو کوئی دوا ہی نہیں ہے۔

ساس۔ منجھلی خدا کے واسطے مجھ پر رحم کر۔

سائرہ کی زبان تو انسان کیا فرشتوں کے بھی بس کی نہ تھی۔ منجھلی بہو کو سمجھا بجھا کر ساس دوسرے دالان میں لے گئیں۔ سائرہ کے منہ میں جو جو کچھ آیا کہتی رہی۔

(۲۷)

دوپہر کو یہ واقعہ ہوا، چار بجے سائرہ کو درد لگے۔ ساس نے اسی وقت شاکرہ کو ڈولی بھیجی۔ گھر کی درستی کی ضروری چیزوں کا انتظام کیا۔ بھائی کو بھیجکر دائی کو بلوایا۔ اس معاملے میں سائرہ نصیبے کی بڑی سکندر رہی، دوسرے ہی حملہ میں بیڑا پار ہوگیا۔ عابد کمرے میں لیٹا تھا کہ بڑی بھاوج نے آکر کہا۔ دولہا میاں بیٹا مبارک۔ گھر بھر میں مبارک سلامت ہونے لگی۔ دادی کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ نانی جامے میں پھولی نہ سماتی تھیں۔ چچیوں کے دل میں چاہے جو کچھ ہو ظاہر میں تو وہ تو ہنستی پھرتی تھیں۔ جمعہ لڑکا ہوا بدھ کی چھٹی ہوئی اور خوب دھوم سے ہوئی۔ دادی نے جو کچھ کیا اپنی غرض کو کیا اپنے نام کو کیا۔ تین لڑکوں میں ایک پوتا جو کچھ نہ کرتیں وہ تھوڑا تھا۔ ہمت کی جوت ہے روپیہ بھی تھا ارمان بھی۔ ناچ رنگ کے علاوہ سب ہی کچھ ہوا۔ شاکرہ کے زیادہ اصرار سے میراثنیں بھی آئیں۔ مگر دو چار زچہ گیریاں گا کر چلی گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ سائرہ کی ساس نے دل کھولکر خرچ کیا۔ پیسہ کی جگہ چار اُٹھائے جو بہو کے منہ سے نکلا وہی کیا۔ سچ پوچھو تو روپیہ ٹھیکری کردیا کہ کسی طرح اس کا دل میلا نہ ہو مولوی صاحب کا گھر جیسے ناچ گانا کیسا فقیر تک کی اتنی مجال نہ تھی کہ راگ میں بھیک مانگ لیتا۔ بہو ہی کی خاطر تھی کہ ڈومنیوں تک کی اجازت دیدی۔ رات بھر نہ سہی آدھ ہی گھنٹہ۔ بہت نہ سہی ایک ہی گیت سہی مگر بہو کا دل تو رکھ لیا۔ یہ بھی نہیں کہ دو چار آنے دیکر رخصت کردیا ہو۔ پورے پانچ روپے دیئے کہ سمدھیانے کی ڈومنی پہلے پہل آئی ہے ایسا نہو بہو کی بات ہیٹی ہو جائے۔ مگر تقدیر کی بدنامی کہاں جاتی۔ بہو نے سب کیا کرایا دم بھر میں مٹی کردیا۔ ساس نے کھانے بھون کر پتیلی نیچے رکھی۔ آپ دوسرے کام میں لگ گئیں۔ ممانی عقلمند

سالن کی رکابی میں کھانے نکال لائیں۔ کھانوں میں سالن لگ گیا اوپر اوپر سے اوروں کو دئے۔ نیچے کے زچہ کے آگے رکھے۔

سائرہ کا ایک کھانا منہ میں ڈالنا تھا کہ ہائے مار ڈالا کے نعرے شروع ہو گئے۔ ساس اور جیٹھانیاں سب گھبرا کر آ کھڑے ہوئے۔ سائرہ نے دہائیں مچائیں کہ الٰہی توبہ۔ کہنے لگی۔

سائرہ۔ سوچا یہ تھا کہ زچہ خانہ ہی میں مر جائے گی وہ تو مراد پوری ہوئی نہیں اب یہ ترکیب سوچی کہ کھانوں میں مرچیں ملا دوں۔

ساس۔ بیٹی میں تو بگھارنے کی گنہگار ہوں۔ تمھاری ممانی سالن کی رکابی میں نکال لائیں۔ رکابی دیکھ لو سالن میں لتھڑی ہوئی ہے یا نہیں۔

سائرہ۔ میں ایسی باتیں خوب سمجھتی ہوں کسی اور کو بہکانا۔ جان کر مرچیں دی ہیں کہ کھٹکا نہ کھائے۔

ساس۔ خیر اگر میں نے جان کر دی ہونگی تو اللہ میرے آگے لائیگا۔ میری قبر میں آئیگا۔ میرے حشر میں آئیگا۔ تم کو تو کیا کہوں۔

بہو۔ بس یقین آگیا۔ منہ سے کہنے کو لاؤ ہم جو کچھ کہہ لیں ہوتا کیا ہے۔

ساس۔ اچھا بیوی جو تیرے منہ میں آئے کہے جا۔ خدا کی شان ہے کرے کوئی بھرے کوئی۔ کام کسی کا نام کسی کا۔

سائرہ کے حالات میں یہ واردات ایک معمولی بات تھی۔ ساس بے چاری یوں ہی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھیں کہ ایسا نہ ہو کوئی بات بہو کے خلاف ہو جائے۔ مگر جو اندیشہ تھا وہی آگے آیا۔ غصہ تو بہت آیا تھا مگر سمجھدار آدمی تھیں۔ سوچا کہ اگر بولتی ہوں تو تمام دنیا جنم میں تھوکیگی کہ گھر پر بلا کر ذلیل کیا۔ مجبور بات کو پی خاموش ہو گئیں۔

شاکرہ بیٹی کے ہاں آئی تو سہی نواسے کو دیکھ کر دل بھی خوش ہوا مگر سمدھن سے کچھ الگ الگ رہی۔ آئی تو رکی رکی، رہی تو اُکھڑی اُکھڑی اور گئی تو چپکی چپکی۔

سائرہ کا مزاج تو آج کیا اور آج سے چھ مہینے پہلے کیا اور چھ برس پہلے کیا ہمیشہ ہی سے نورٌ علیٰ نور تھا۔ بیٹا کیا جنا کہ تمام دنیا پر احسان کر ڈالا۔ پیٹ سے تھی تو اتنا غنیمت تھا کہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی بات میں من بھر قصور ہوتا تو رتی بھر سمجھ لیتی۔ اب وہ بھی نہ رہا۔ ساس کا خوف میاں کا لحاظ جٹھانیوں کی شرم سب کو بالائے طاق رکھا۔ ابتدا میں تو جٹھانیوں نے تھوڑا بہت مقابلہ کیا بھی مگر بچھڑا اصل میں کھونٹے کے بل کودتا ہے۔ مقابلہ کیا تو ساس کے بھروسے پر۔ جب یہ دیکھا کہ خود ساس ہی نے اطاعت قبول کر لی تو وہ دونوں بھی زیر ہو گئیں۔ غرض گھر بھر میں سائرہ ہی سائرہ تھی، جو کہتی سب سنتے اور جو کرتی سب دیکھتے۔

بیاہی آئی تو کمرہ ملا۔ جب تک دُلہن رہی کمرے میں رہی۔ پیٹ رہا تو دالانوں تک آنے لگی۔ بچہ ہوا تو باورچی خانہ تک نوبت پہنچی۔ غرض برس کے اندر ہی اندر تمام گھر پر چھا گئی۔

خدا کی دین ہے نقطۂ عمر کا امتیاز تو ضرور تھا ورنہ بہو ساس معلوم ہوتی تھیں اور ساس بہو بھی نہیں ماما۔ رہیں جٹھانیاں گو الگ الگ گھر کی بیٹیاں تھیں مگر دونوں کی خصلتیں کچھ ایسی یکساں واقع ہوئی تھیں کہ سگی بہنوں کو بھی مات کیا تھا۔ مزاج کی بُری تو نہ تھیں۔ مگر خشک۔ کم سخن ضرور تھیں۔ لیکن فرمانبردار۔ جو ساس نے ہاتھ اٹھا کر دیدیا وہ سر جھکا کر لے لیا۔ اچھی چیز کی فرمائش کی نہ بُری چیز پر نام رکھا، جو آ گیا وہ لے لیا، جو پک گیا وہ کھا لیا۔

سائرہ اگر کہیں اپنی اطاعت و خدمت سے ساس کے دل میں گھر کر لیتی تو اس میں کلام نہیں۔ لالوں کی لال گھربار کی مختار، اچھے بُرے کی مالک سیاہ کرتی چاہے

سفید، مالک سے کم تو اب بھی نہ تھی، مگر بے عزتی سے اور بے حمیتی سے۔ ماما سالن بگھار رہی ہے مصالحہ لیا اور روٹی کھالی۔ چاول دم پر ہیں نکالے اور کھانے بیٹھ گئی۔ کوئی کہنے والا نہ سننے والا کہیں نہ کہیں ساس کہیں۔ اُن کا یہ حال تھا کہ سامنے بیٹھی جلتی تھیں لیکن اتنی مجال نہ تھی کہ کچھ کہہ سکیں، مامائیں تو کس گنتی میں تھیں۔

(۲۸)

سائرہ کی بڑی جٹھانی بارہ برس کی بیاہی ہوئی تھی مگر کچھ ایسی تقدیر کی بھونڈی اور نصیبے کی ہیٹی کہ بیٹا ہوا نہ بیٹی۔ ہزاروں ہی جتن کئے مگر سب بیکار، بیسیوں فصدیں، سینکڑوں مار الجبن، تعویذ اور گنڈے، دوا اور درمن۔ مگر ایک میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ جس دن سے بھتیجا پیدا ہوا بچے پر جان نثار کرنے لگی۔ بچہ بھی کچھ ایسی بو پہچان گیا تھا کہ کیسا ہی بلک رہا ہو جہاں وہ لیکر کھڑی ہوئی کندھے سے لگا اور سو گیا۔ دودھ سے تو مجبور تھی ورنہ دن بھر وہ تھی اور بچہ۔ سائرہ فقط نام کی ماں تھی ورنہ ماں کا زیادہ تر کام وہی کرتی تھی۔

ماں باپ ہی خوب جان سکتے ہیں کہ بچے کس مصیبت سے پالے جاتے ہیں۔ راتوں کی میٹھی نیندیں، دنوں کا چین و آرام، لیٹنا اُٹھنا، کھانا پینا، آنا جانا سب قربان کر دینا پڑتا ہے جب وہ ننھی سی جان جوان نظر آتی ہے۔ آئے دن کی بیماریاں ہر وقت کی ضدیں، رونا بلکنا چیخنا مچلنا۔ بعض اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ اپنے عیش و آرام میں بچوں کو مخل نہیں ہونے دیتے، بچہ رو یا دو تھپڑ مار دئے۔ چیخ چلا کر چپ ہو گیا۔ ایسے بچے جنگل کے خودرو پھولوں کی طرح پرورش پاتے ہیں، لیکن یہ عجیب خدا کی قدرت ہے، جتنا زیادہ بچوں کا لاڈ پیار ہوا اتنی ہی بیماری اور تکلیف جن کو لاڈ کم نصیب ہوئے اُن کو دکھ بہت تھوڑے۔ اور جنکی کوئی بات نہ پوچھے وہ ہٹے کٹے موٹے تازے۔ سر میں درد بھی نہ ہو۔

اس بچے پر ماں سے زیادہ باپ اور باپ سے بڑھ کر دادی اور چچی واری اور قربان تھے۔ لیکن یہ بڑی بہو کی صریح ناتجربہ کاری تھی کہ پرائے بچہ پر جان چھڑکی اور بُری بنی۔ جو خدمت اس نے کی سائرہ اگر سو روپیہ مہینہ دیتی تو ایسا خدمت گزار نہ ملتا نتیجہ یہ ملا کہ جٹھانی کے میکے میں ایک شادی پیش آئی۔ یہاں بھی سب کے بلاوے آئے۔ ساس تو کہیں آتی تھیں نہ جاتی۔ سائرہ سے ہر چند کہا بیٹی دن بھر کے واسطے چلی جا جٹھانی بھی خوش ہو جائیگی، بات بھی رہ جائیگی، وہ ابھی تمھاری چھٹی میں ہو گئی ہیں تم کچھ کرو گی ان کو بلانا۔ جب تم جاؤ گی تو لوگ آئینگے۔ اللہ رکھے کل کو دودھ بڑھاؤ گی تم کسی کے ہاں نہ جاؤ گی تو تمھارے ہاں کون آئیگا۔

ساس نے بہتیرا کہا مگر وہ ایک ضدن عورت جو منہ سے نکل گیا وہ پتھر کی لکیر ہرگز حامی نہ بھری۔ بڑی اور منجھلی دونو دیورانیاں جٹھانیاں چلی گئیں۔ سائرہ نے ساس کے منع کرتے کرتے شاموں شام سر دھویا۔ بچہ پڑا رو رہا تھا۔ ساس نماز پڑھنے لگیں۔ ماں نے بال بھی نہ نچوڑے۔ یوں ہی دودھ پلا دیا۔ بچہ تھا نیند میں دودھ منہ میں لیتے ہی سو رہا۔

جٹھانی گئی تو سہی مگر دن بھر دل بچہ میں پڑا رہا۔ بڑی مشکل سے دن کا ٹا شام ہوئی تو ڈولی منگوا سسرال آنے لگی۔ ماں نے کہا بیٹی! عقل جاتی رہی ہے شادی میں آئی ہو یا آگ لینے۔ دور دور کے لوگ تو رات بھر رہیں تم کو سگی پھوپھی ہو کر جاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ایسا جانا تھا تو آئی کیوں تھیں۔

بیٹی۔ اماں میں رات کو رہ کر کیا کرونگی۔ بسم اللہ ہونی تھی ہو چکی ایسا ہی ہے تو میں صبح کو پھر آجاؤنگی۔

ماں اُٹھ کر کسی اور کام کو چلی گئیں دیورانیاں جٹھانیاں ڈولیاں منگوا گھر آپہنچیں منجھلی اُتر کر اپنے کمرے میں گئی۔ بڑی بیتاب ہو کر سائرہ کے کمرے سے بچے کو اٹھا تھپکتی

ہوئی لے آئی۔ گود میں لٹا کر ساس سے باتیں کرنے لگی۔ بچہ پڑا سوتا تھا۔ دو چھینکیں آئیں ہوں ہوں کرنے لگا۔ ساس نے اُٹھکر دیکھا تو بدن انگارہ تھا۔ کہنے لگیں بڑی دُلہن اس کو بخار چڑھ رہا ہے، سردی لگ رہی ہے، رضائی اُڑھا لو۔ بہو نے رضائی اڑھائی بچے کو تو اس غضب کا بخار چڑھا کہ ہاتھ نہ رکھا جائے۔ سائرہ کی عقلمندی تھی کہ بال سکھانے کیسے بچو ہٹنے تک کے نہیں اور دودھ پلا دیا۔ بچہ کو زکام ہوا زکام کے ساتھ بخار، اور بخار کے ساتھ سانس۔ بہتیرا ہشیار کیا آوازیں دیں، دودھ دیا مگر وہ ایسا لوتھ ہوا کہ دودھ کو مُنہ لگایا نہ آنکھ کھولی۔ رات کا وقت سناٹے کا عالم سانس کی آواز تمام انگنائی میں آ رہی تھی۔ رات تو جوں توں کٹ گئی صبح کو بچہ کا اللہ ہی حافظ تھا۔

چھ سات مہینے کا پلا پلایا بچہ رات بھر میں ہاتھوں پہ آ گیا۔ کتنی کتنی کوششیں کیا کیا دوائیں کیسی کیسی ترکیبیں۔ مگر سب ہیچ۔ دست کے آنے کے بیسیوں ہی علاج کیے، مگر دست آیا نہ سانس میں تخفیف ہوئی۔ بچے کی یہ نوبت، گھر کی یہ کیفیت، گھر والوں کی یہ حالت اور سائرہ کو کچھ اور ہی سوجھی۔ بیٹھے بیٹھے خدا جانے کیا خیال آیا روتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جٹھانی سے کہنے لگی ہائے میں تو خدا تک کے سامنے کہہ دوں میرا بچہ بھلا چنگا میرے پاس پڑا سوتا تھا تم اٹھا کر لائیں۔ خبر نہیں کیا کر دیا اور اب ٹسوے بہانے بیٹھیں ہائے مجھے تو ملکر مارا۔

ماں تا سائرہ کی سمجھ لو، ورنہ جٹھانی کی کیفیت سائرہ سے بدتر تھی۔ اتنی بات تو ضرور تھی کہ دودھ نہیں پلایا، پیٹ میں نہیں رکھا، مگر خدمت ماں سے کچھ کم نہیں کی۔ سائرہ پر کچھ ہی گزر رہی ہو مگر بچے کو دیکھ دیکھ کر اسکا بھی کلیجہ نکل رہا تھا۔ دیورانی کا مُنہ دیکھ کر چپ کی چپ رہ گئی۔ دل کے ٹکڑے پہلے ہی اُڑ رہے تھے۔ سائرہ کی باتیں سُنکر گھونسا سا لگا اور تو کچھ بن نہ آئی۔ روتی ہوئی اٹھی وضو کیا نماز پڑھی اور رو رو کر دعا مانگنے لگی۔ اٹھی بچے پر دم کیا ساس سے رو کر کہنے لگی۔ اماں جان میری

شرم تو خدا ہی کے ہاتھ ہے۔ اللہ میرے اوپر رحم کرے۔ چھوٹی دُلہن نے تو بھر مُنہ میرا نام لے ہی دیا۔ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہے مگر عقیدہ بھی ایک چیز ہے۔ بچے کو گود میں لیکر گھٹی میں چاول بھر کستوری ملائی اور زبردستی دو چمچے حلق میں ڈالے۔ کستوری کا حلق سے اُترنا تھا کہ کھلکر دست آگیا۔ دست کا آنا تھا کہ بچہ نے آنکھیں کھولدیں۔ سانس میں کمی شروع ہوئی۔ ماں نے لیکر دودھ لگایا۔ بچہ کو دودھ پیئے پندرہ گھنٹے ہو گئے تھے۔ غٹ غٹ پینے لگا۔ دوپہر تک بخار بھی اُتر گیا۔ سانس کو بھی آرام ہو گیا اپنے اپنے تعلق کے بموجب ہر شخص کو خوشی ہوئی مگر جٹھانی کی چڑھ بن آئی۔ شام تک تو ضبط کئے رہی مگر رات کو کہہ ہی دیا۔ چھوٹی دُلھن بوا آپکی تم دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ تمھارے بچے کی ہزاری عمر ہو۔ مجھکو تم نے غیر سمجھ کر اتنی بڑی بات کہدی۔ اللہ نے میری طرف دیکھ لیا۔ خدا تم کو اس کی بہار دیکھنی نصیب کرے۔ ہمارا کیا ہے دور سے دیکھ کر خوش ہولیں گے۔

سائرہ کو تو اپنے کہنے کا مطلق افسوس ہوا مگر ہاں شاکرہ نے بہت معذرت کی لیکن جٹھانی کا دل صاف نہ ہوا۔ روتی ہوئی یہ کہکر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ خالہ جان اپنے پیٹ کا بچہ ہوتا تو یہ انعام نہ ملتا۔ اب ان کا بچہ اللہ اُن کو نصیب کرے۔ بہت دل پھڑکیگا۔ آکر دور سے دیکھ لیا کروں گی۔

(۲۹)

بچے کے اچھے ہونے کی خوشی میں رتجگا ہوا۔ پاس پاس کی بیویاں جمع ہوئیں بارہ بجے رات تک تو سب جاگتے رہے اور پھر بڑی بوڑھیاں پڑ کر سو گئیں۔ لڑکیاں لڑکیاں جاگتی رہیں۔ رتجگے کا تو نام تھا۔ دنیا بھر کی غیبتیں شروع ہو گئیں۔ میاں کی تابعداری کا مضمون پیش ہوا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی کارگذاری کا فخریہ اظہار کیا۔

ایک۔ بوا میں تو سو گُروں کا ایک گُر یہ جانتی ہوں کہ جہاں کوئی ایسی بات ہوئی

اور میں نے دیکھا کہ اُن کا مزاج بگڑا اُس وقت تو چپ ہو جاؤں گی جو جو اُن کے مُنہ میں آئیگا کہے جائینگے۔ جب دیکھوں گی کہ اب کہہ چکے اور سہولیت پر آئے پھر جو مُنہ اوندھا کر پڑونگی جب تک ہاتھ نہ جڑوالوں گی مجھے تو بات کرنی قسم ہے۔

دوسری۔ ہمارا کام تو بیماری سے نکلتا ہے۔ ذرا میں چیڑکی اور میں بیہوش ہوئی۔ خنے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ایسے سادے ہیں کہ پھر چاہے جوتیاں سیدھی کروالو۔

تیسری۔ ہاتھ جُڑوائے تو کیا جڑوائے بات تو جب ہے کہ ناک رگڑوا دُ اور خاک اثر نہ ہو۔

چوتھی۔ ہم تو کبھی اس کمبخت بڑھیا سے تنگ آگئے۔ ہمارا گھر تو جس دن یہ مرگئی اس دن بھریگا۔ ہر وقت لگا لگا کر ایسا فرنٹ کر دیا ہے کہ بات ہی نہیں پوچھتے۔ مگر میں بھی خدا کی قسم جب موقعہ ملتا ہے ایسا ٹھیک بناتی ہوں کہ دونو ماں بیٹے مُنہ تکتے رہجاتے ہیں۔

سائرہ۔ بڑھیا کا ازارہ (اجارہ) تھوڑی ہے اپنا میاں ٹھیک ہونا چاہیئے۔ بڑھیا ٹھڑیا کی مجال ہے کہ ہوں کر سکے۔ وہی اماں جان ہیں کہ بڑی منجھلی دونو آجتک للّو پتّو میں لگی رہتی ہیں۔ پھر دیکھو کیسی مٹی پلید ہے۔ ذرا کوئی بات بے مرضی ہوئی اور سیکڑوں جوتیاں پڑگئیں۔ بھلا مجھ سے تو آنکھ ملالیں۔ خاندان بھر کو الٹ کر رکھدوں۔ اس منجھلی پہ تو خدا کی مار اللہ اس کا مُنہ کالا کرے۔ ایسی آفت کا پرکالا ہے کہ بات کا بتنگڑ بناتی ہے۔ جہاں سوئی نہ گھُسے وہاں موسل گھسیڑدے۔ دن بھر تو بناؤ کرتی رہتی ہے۔ تین تین دفعہ سر گُندھتا ہے۔ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل۔ خبر نہیں خوبصورت ہوتی تو کیا غضب ڈھاتی صُبح اٹھی مُنہ ہاتھ دھویا، کنگھی چوٹی کی اور کوٹھے پر چڑھ گئی، دن بھر اوپر ٹنگی رہتی ہے، بیچ کا دروازہ کھول لیگی اور مردوں کو گھورنے بیٹھ جائیگی۔ جب دیکھو کوٹھے پر، ہمسائی کے ہاں گھر میں تو ٹکتی ہی نہیں۔ میاں بدنصیب پردیس میں۔ پوچھو تجھے بناؤ سنگار سے واسطہ کیا۔ اور عطر پھول سے مطلب کیا۔ تو جو چوتھی کی دلہن بنی رہتی ہے تو کس کے لئے۔ کئی دفعہ ساس نے منع کیا ہمسائی کا لڑکا جوان ہے وہاں نہ جایا کرو مگر پروا ہی

نہیں اور پھرتا بعدار کہلاتی ہو۔ بھلا بیوی خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا۔ کچھ تو لالچ ہووے ہی گا۔ جو اپنا گھر چھوڑ بن سنور جا کر گھنٹوں بیٹھتی ہیں بلکہ میں نے تو یہاں تک سُنا ہی کان گنہگار ہیں کہ اُس لڑکے سے خوب باتیں ہوتی ہیں۔ یہ جو پھولدار دو پٹہ مٹکائے پھر رہی ہیں اسی کا لایا ہوا ہے۔ بے غیرتی تو دیکھو خدا کی قسم بوا غیرت تو چھو نہیں گئی۔ یوں کہو کہ وہ بیوقوف بھولا بھالا پلّے پڑ گیا ہے۔ جس رنگ نچاتی ہے ناچتا ہے۔

وہی **تیسری**۔ بوا برا مانو چاہے بھلا مُنہ پر آئی بات تو رکتی نہیں۔ تمھاری منجھلی جیٹھانی سدا کی ایسی ہی ہیں۔ میں تو اُن کو کوارپتے سے جانتی ہوں۔ میرے ساتھ کی کھیلی ہوئی ہیں۔ دیوار بیچ گھر تھا۔ بننے سنورنے کا شوق ان کو کوارپتے ہی سے ہے۔ گھنٹوں بیٹھی بھائی یوسف سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ ہمارے ساتھ کھیلنے کا تو فقط نام تھا۔ کھیلتی ہمیشہ لڑکوں کے ساتھ تھیں۔ گڑیوں کا ان کو شوق نہ تھا۔ ہنڈ کلیا میں وہ نہیں شریک ہوتی تھیں۔ ہاں شوق تھا تو کاہے کا آنکھ مچولی کا۔ کوڑی ذخن (ذقن) کا۔ بھائی چور بنے ہوئے ہیں۔ آپ دائی بنی ہوئی ہیں۔ کوڑی ذخن میں جب ہونگی بھائی کی طرف ہماری آڑی تو ہوئی نہیں۔ کئی دفعہ میری اماں نے منع کیا۔ ایک نہ سُنی۔ مجبور ہو کر کھڑکی کو تیغہ کروا دیا۔ جب چین سے بیٹھیں۔

پہلی۔ بڑی ہی کون سی نیک ہیں۔ دنیا بھر کی جھوٹی لپاٹن۔

سائرہ۔ مغز سے باتیں اُتارتی ہیں۔ میرا بس چلے تو خدا کی قسم دونوں کو ایسی جگہ ماروں جہاں پانی بھی نصیب نہ ہو۔ دونو بہوئیں ایک سے ایک افضل۔ خدا کی لاٹھی بے آواز تھوڑی ہے۔ دیکھ لو بچے کے واسطے کیا کیا نہ کیا چوہے کا بچہ بھی نصیب نہ ہوا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ صبح شکل دیکھ لو تو دن بھر روٹی نصیب نہ ہو۔ میں نے تو ایک دن جل کر کہدیا۔ بُرا مانا کریں۔ جو دیتی ہیں وہ نہ دینگی۔ جب ہوتی تھیں گجر دم آئیں اور بچہ کو اٹھا کر لے گئیں۔ کہدیا کہ بھابی جان صبح ہی صبح۔ خدا کا نام نہ رسول کا

ذکر۔ ذرا تو دن چڑھے آیا کرو۔

دوسری۔ بُوا اُن سے بھی زیادہ منحوس تمھاری ساس ہیں۔ سو مڑی بال کی کھال نکالتی ہیں۔ مجال ہے کوئی تنکا تو اِدھر سے اُدھر کر لے۔ یہ نہیں کہ بہوت ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مگر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ فقیروں کو بھی مات کیا۔ وہ تو یہ کہو کہ مولوی صاحب کے دم سے گھر میں اتنی رونق بھی نظر آتی ہے۔ اب تو مولوی صاحب ہیں بھی نہیں میں تو جانوں پیسہ کے گھی میں دو ہنڈیاں بھونتی ہوں گی۔

تیسری۔ بیٹی کے غم نے ہڑا کر دیا۔ دن پے دن دبلی ہوتی جاتی ہیں۔ بیماری ایسی بُری پیچھے پڑی ہے کہ خدا ہی ہے جو بچیں۔

سائرہ۔ خاک دُبلی ہوتی جاتی ہیں۔ میں تو جب سے آئی ہوں ویسا ہی دیکھتی ہوں۔ فیل کی فیل تو بنی ہوئی ہیں اور کیا کرینگی۔ یوں کہو جان بوجھ کر بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہیں۔ جیبرو چار ِگھار و یا پنج۔ بیٹی ہی سے کونسی بنتی تھی۔ میں نے تو دیکھا نہیں سُنتی ہوں۔ مہینہ بھر کو آتی تھی تو دن رات کی کل کل تھی۔

(۳۰)

سائرہ بیٹی بنی تو ایسی کہ ماں اور باپ دونوں کو اولاد کے ارمان کا مزہ چکھا دیا۔ بہو بنی تو ایسی کہ ساس کو ناک چنے چبوا دئے۔ بہن تھی تو بھائیوں کی جانی دشمن۔ بھاوج بنی تو نندوں کے خون کی پیاسی، میکے میں تھی تو آفت۔ سُسرال میں آئی تو مصیبت۔ بیوی بنی تو چھلاوہ۔ دیورانی بنی تو بجلی۔ غرض جو بنی لاجواب بنی۔ مگر ماں بننے میں سب کسر نکل گئی۔ وہی سائرہ جو سرِشام پڑ کر ڈھیر ہو جاتی تھی رات کے بارہ بارہ اور ایک ایک دو دو بجے تک بچے کو لئے پھرتی۔ وہی سائرہ جو بچھونے میں سلوٹ پڑ جاتی تھی تو تیوری پر بل آ جاتا تھا، بھرے ہوئے نہالچے اور لتھڑے ہوئے پوتڑوں میں سو جاتی۔ وہی سائرہ جسکو کبھی بھول کر بھی رحم نہ آتا تھا۔ ذرا سی بچہ کی ماندگی میں بدحواس ہو جاتی تھی۔

لاڈلا بچہ، پیسہ والوں کا بچہ، پہلونٹی کا بچہ، اللہ آمین کا بچہ اس کو بیماری کی کیا کمی ذراسی بدپرہیزی میں زکام، ذراسی بدعنوانی میں کھانسی، ذراسی لاپروائی میں بخار جس دن سے ہوا بیمار ہی بیمار رہا۔ آج آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ کل ہنسلی اتر گئی۔ پرسوں پیٹ کا بگاڑ ہے۔ دن تو دن ہم تو جانیں کوئی گھنٹہ بھی ایسا نہ جاتا ہوگا۔ جو اس کی طرف سے اطمینان ہو۔ ماں واری باپ قربان، دادی فدا، نانی نثار غرض بچہ کیا اندر کا تارا تھا۔

ساس نے ایک خاص ماما سائرہ کے کام کاج کے واسطے بہو کے نام کی علیحدہ کر دی تھی۔ ماما حیثیت کے لحاظ سے تو نوکر ہی تھی مگر عمر کے اعتبار سے سائرہ کی دادی کے برابر تھی۔ بڑھیا دائم مریض ضرور تھی، سو مرضوں کا مرض تو ایک بڑھاپا ہی تھا مگر کم ہمت نہ تھی۔ جس طرح ہوتا اور جتنا کچھ ہوتا صبح سے شام تک کام ہی میں لگی رہتی۔ لیکن سائرہ نے پھر بھی اس کا دم ناک میں کر رکھا تھا۔ بڑھیا کہہ کر بات کرتی۔ مردہ کہہ کر آواز دیتی۔ کیسا ہی جان توڑ کر کام کرے سائرہ کی سمجھ میں خاک نہ آتا۔ بال بچوں والی تھی سائرہ کی باتوں کو سُنکر ٹال دیتی۔ منجھلی نے دو ایک دفعہ بہکایا بھی کہ بڑی بی تم نے مات بیچے ہیں ذات تھوڑی بیچی ہے۔ چھوڑ چھاڑ گھر بیٹھو۔ لیکن بڑھیا کو سائرہ اور بچے کی کچھ ایسی محبت ہو گئی تھی کہ جب کہا یہ ہی کہا بیوی جوانی تو اس در پر کاٹی اب بڑھاپے میں کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ کہتی ہیں کہنے دو۔ میری بچی کے برابر ہیں۔ میں برا نہیں مانتی۔ اس پیٹ کمبخت کے کارن یہ باتیں سننی پڑتی ہیں۔ چھوڑوں بھی تو کس برتے پر۔ لڑکا ہے وہ بالکل بیوی کے کہنے میں۔ بہو ہے وہ شکل دیکھ دیکھ کر بھُنی جاتی ہے۔ صورت دیکھنے کی روادار نہیں۔ پاس کھڑے ہونے کی لاگو نہیں۔ بیمار پڑجاتی ہوں تو عید ہو جاتی ہے۔ بھلا بیگم اب کس کے در پر جاکر پڑوں۔ پھر اس کواری ہنیاری کا ساتھ۔ ماں مر کر چین سے سو گئی مجھکو بڑھاپے میں فکر لگا دیا کسی طرح یہ پتھر آگے سے اٹھے تو ایک کونے میں بیٹھ کر اللہ اللہ

کروں۔ روٹی کا دینے والا رازق ہے۔

سائرہ کی اس نالائقی کے بعد جٹھانی نے لینا کیسا بچے کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بچے کی اتفاق سے آنکھیں دُکھنے آگئیں اور ذرا اپنڈا بھی پھیکا ہوگیا۔ خیال یہ ہوا کہ چچی کا ہڑکا کیا ہے۔ ساس کی صلاح ہوئی کہ سائرہ جٹھانی سے قصور معاف کروائے مگر سائرہ کس کی سننے والی تھی۔ ٹس سے مس بھی نہ ہوئی۔ بچے کے بلکنے سے جٹھانی کا بھی دل کٹتا تھا۔ مگر اس کی رائے ٹھیک تھی کہ اس وقت کا صبر کر لینا بہتر ہے۔ آج منہ سے کہا ہے کل جوتیاں ماریگی۔

بڑھیا نہ ہوتی تو سائرہ ایک دفعہ کیا دس دفعہ ہاتھ جوڑتی اور قصور معاف کرواتی مگر بڑھیا سارے سارے دن اور تمام تمام رات ایک ٹانگ سے پھری۔ کبھی دروازے تک لیگئی۔ کبھی کنڈیاں کھٹکھٹائیں۔ دن ہوا تو باہر تک لے گئی رات ہوئی تو کندھے سے لگائے پھری۔ بچہ تین چار روز میں بھول بھلا گیا۔

چاہیئے کہ سائرہ جٹھانی کی کنارہ کشی سے ایک سبق حاصل کرتی۔ مطلق نہیں۔ بڑھیا کی قدر نہ کرتی اپنے لال کا تو خیال کرتی مگر وہی اٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات۔

بڑھیا کو دو روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ ایک آدھ روپیہ اور ادھر سے پڑجاتا تھا جو کچھ ہاتھ آیا سائرہ کے پاس جمع کروا دیا۔ بڑھیا اتفاق سے بیمار پڑی اور مرنے کے قریب ہوگئی سائرہ سے درخواست کی کہ اس نواسی کو تمھارے سپرد کرتی ہوں۔ اوپر خدا ہے نیچے تم۔ ماموں ممانی یوں ہی اسکے جانی دشمن ہیں۔ اُن کے پلے پڑگئی تو خدا جانے کیا کچھ نہ کریں۔ میں اسے جیتے جی کلیجے سے لگائے رہی۔ اب تمھارے ہاتھ میں ہاتھ دیتی ہوں۔ اپنے بچہ کا صدقہ میری بچی کو اچھی طرح رکھنا۔ پانچ اوپر بیس روپے چھ آنے تمھارے پاس جمع ہیں چار روپے تمھاری ساس کے پاس ہیں اس کے وقت پر دیدینا۔

بڑھیا یہ کہکر رخصت ہوئی۔ لڑکی رہنے سہنے لگی۔ سائرہ۔ نے رکھا تو سہی مگر افسوس بہت

ہی بُری طرح۔ ذرا ذرا سی بات پر ایسی بیدردی سے مارتی تھی کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔

(۳۱)

سائرہ ایک دن دوپہر کے وقت چارپائی پر صحن میں لیٹی تھی۔ لڑکی سے کہا پٹاری اٹھالا۔ اور ہاں صندوقچی بھی ساتھ کے ساتھ ہی لیتی آئیو۔ لڑکی آٹھ نہیں نو برس کی ہوگی۔ تین چار سیر کی پٹاری اسپر رکھی ہوئی صندوقچی۔ رستے میں کیچڑ۔ پاؤں پھسلا۔ گر پڑی۔ نیچے صندوقچی اور اوپر پٹاری۔ کتھ، چونہ، چھالیا، زردہ سب ایک ہوگیا۔ اپنی چوٹ تو بھول گئی۔ سائرہ کے خوف سے خون خشک ہونے لگا۔ سائرہ کیا معاف کرنیوالی عورت تھی اُٹھی اِدھر اُدھر دیکھا ایک کھپچی نظر آگئی اُسی سے مارنا شروع کیا۔ کھپچی کے ٹکڑے اُڑ گئے بدن پر بدھیاں پڑگئیں مگر اس نے نہ چھوڑا۔ مجبور ساس بولیں۔ بیٹی آگے دیکر خون تھوڑی کروانا ہے۔ بس مار چکیں جانے دو۔ ساس کا اتنا کہنا تھا کہ سائرہ نے اور زیادہ مارنا شروع کیا۔ بڑی آئیں وہ اپنا سامنہ لیکر چلی گئیں۔ منجھلی آئیں وہ دو چار گھرکیاں کھاکر سیدھی ہولیں۔ جب کھپچی ہی مارنے کے قابل نہ رہی اور اپنے بھی ہاتھ شل ہوگئے تو لاچار چھوڑنا پڑا۔

ایک ظلم ہو تو تحریر کیا جائے اور ایک ستم ہو تو کہا جائے۔ یہ کڑاکے کے جاڑے ذرا اُٹھنے میں دیر ہوئی اور بھر اکٹورا ڈالدیا۔ گرمی ہے تو دن بھر پنکھا جھلے۔ جاڑا ہو تو دن بھر پاؤں دبائے۔ گیارہ بجے رات تک سونے کا حکم نہیں۔ بارہ بجے تک کھانا نصیب نہیں۔

سائرہ ایک دن نہانے گئی۔ بچہ پڑا سوتا تھا لڑکی کو پاس بٹھا گئی۔ لڑکی نوکر تھی یا ماما تھی لونڈی تھی یا باندی مگر تھی تو بچہ۔ پاخانہ کی حاجت ہوئی اُٹھ کر چلی گئی۔ سائرہ آئی تو بچہ اکیلا پڑا تھا۔ لڑکی کو بلا کر ایک ایسا دھکا دیا کہ کمرے کی چوکھٹ پر اوندھے منہ جاکر پڑی۔ تمام کنپٹی لہو لہان ہوگئی۔ مگر نہ مُنہ والی کچھ کرسکتی تھی نہ دیکھنے والے کچھ

کہہ سکتے تھے۔ لڑکی مُنہ دھو دُھلا دیوار سے لگ کھڑی ہو گئی۔

(۳۲)

عمریں گذری اور زمانہ اُڑا چلا جا رہا ہے۔ کل سائرہ کی چھٹی تھی آج اس کا بچہ ماشاء اللہ پاؤں پاؤں پھر رہا ہے۔ عابد اور معاملات میں کچھ ہی ہو مگر دوراندیشی میں باپ سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ ماں اور بیوی، ساس اور سُسرے، بہن اور بھاوجیں سب ہی نے منع کیا، مگر چیچک کا ٹیکا اس نے چلّے کے اندر ہی لگوا دیا۔ سرسری طور پر بھی نہیں خاص اہتمام سے ٹیکا لگانے والے کو گھر پر بلوا کر ایک روپیہ نذرانہ دیکر۔ مگر اتفاق کی بات دانہ نہ ابھرا۔ جاڑہ تو خیر گذر گیا مگر گرمی بھر ست ہی ست پر جان رہی۔ اکتوبر کا شروع ہونا تھا کہ پھر عابد نے اسی ٹیکہ لگانے والے پر تقاضا کیا۔ ٹیکے والا آدمی تھا معقول۔ کچھ انسانیت کچھ سال گذشتہ کی ندامت کہنے لگا مولوی صاحب مہینہ بھر کی مہلت دیجئے۔ نومبر میں تازہ مصالحہ آجائیگا تو ٹیکہ لگا دوں گا۔

تاریخ مقررہ پر ٹیکا لگایا گیا۔ تیسرے دن سے سائرہ نے سالن دال چھوڑ دیا صرف روٹی اور گُڑ کھاتی رہی۔ پانچویں دن عابد نے بیوی سے کہا آج اسکی آستینیں اُلٹ دو کہیں دانوں میں پانی بھر گیا ہوگا ایسا نہ ہو ٹھیس لگجائے۔ سائرہ آستین اُلٹتی ہے تو بازو صاف پڑا ہے دانے کیسے ٹیکے تک کا نشان نہیں۔ ٹیکے والے کو بلا کر شکایت کی اس نے کہا میں کیا کروں۔ بچے میں چیچک کا مادہ ہی نہیں۔ برابر ہی ڈاکٹر رہتے تھے وہ اتفاق سے آرہے تھے ٹیکے والے کی تقریر سنکر بحث کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے ممکن نہیں مادہ چیچک موجود نہ ہو۔ ٹیکے والے کی رائے تھی اب اس بچے کا دانہ ابھر ہی نہیں سکتا۔

قصہ مختصر شام کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاتھ سے ٹیکا لگایا مگر دانہ نہ اُبھرنا تھا اور نہ اُبھرا ڈاکٹر صاحب بھی اپنا سا مُنہ لیکر رہ گئے ایک سال اور گزر گیا۔ جاڑے بھر ٹیکے والے گھر گھر پوچھتے پھرے خلقت

ملہ یہ واقعہ ہے پہلی مرتبہ مصالحہ اچھا نہ تھا ٹیکا لگانیوالا مجبور کیا گیا مگر اس نے ۔۔۔ تھا غالباً دانہ نہ ابھریگا دوسری (باقی بر صفحہ ۲۶)

کی یہ کیفیت دیکھنے والے نے گلی میں قدم رکھا اور گھروں کی کنڈیاں لگائیں۔ وقت منظور، پریشانی منظور، موت منظور، مگر ٹیکہ لگوانا منظور نہیں۔ تیسرے سال جا کر آخر اپریل سے چیچک کا زور شروع ہوا اور اس غضب کا کہ سینکڑوں بچے ضائع ہو گئے۔ جدھر دیکھو تمام اور جسے دیکھو رخصت۔ بچوں پر ایسا بھاری سال غدر سے پہلے کبھی آیا ہو تو آیا ہو۔ نکلی بھی اس طرح کہ جس گھر میں تین بچے ہیں تو تینوں کے اور چار ہیں تو چاروں کے۔ کیا مصیبت کا زمانہ تھا۔ اِدھر دانہ دکھائی دیا اُدھر بچہ ختم۔ مہینہ کے اندر ہی اندر سینکڑوں گھر سنسان اور بیسیوں محلے ویران ہو گئے۔ مرد حیران عورتیں پریشان بھلے چنگے بچوں کو دیکھ دیکھ کر جان نکلی جاتی تھی کہ خدا خیر کرے۔ دن خیر سے پورا ہوا تو رات جاگ کر کاٹی۔ رات اچھی طرح گذری تو دن خدا خدا کر کے گذارا۔ دن ہو رات ہو، صبح ہو شام ہو، آدھی ہو پچھلا ہو۔ ہر طرف سے رونے کی آوازیں چلی آتی تھیں۔ کیسے کیسے تندرست و توانا بچے ایک چھوڑ دو دو دفعہ کی چیچک نکلی ہوئی تین تین چار چار دن میں چٹ پٹ ہو گئے۔ گورکنوں کی یہ کیفیت تھی کہ روٹی تک کے کھانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ ایک سے فارغ نہیں ہوئے کہ چار اور رکھے ہوئے ہیں۔ ابھی اُنکی نوبت نہیں آئی کہ دو اور آ پہنچے۔ مہینے سوا مہینے تک تو بچوں ہی کا نمبر رہا پھر بڑوں کی باری آئی۔ جوان جوان عورتیں دو تین دن بخار رہا اِدھر نکلی اُدھر رخصت۔ ساٹھ ساٹھ پینسٹھ پینسٹھ برس کے بڈھے۔ پوتا پوتی والے۔ نواسا نواسی والے اسکی بھینٹ چڑھ گئے۔ چیچک، خسرا، موتی جھرا، یہ ہی تین چار مرض تھے۔ غرض ہر بہانے موت آئی تھی۔ چیچک کیا ایک آفت ناگہانی تھی۔ محلّے کے محلّے غارت اور گھر کے گھر اُجڑ گئے۔ جسکو دیکھو گریاں اور جس سے پوچھو نالاں۔ کوئی ایسا ہی خوش نصیب گھر ہوگا جس میں دو ایک کم نہ ہو گئے ہوں۔ بیسیوں بڈھے، سینکڑوں جوان، ہزاروں بچے تین تین چار چار دن بیمار رہ کر

مرتبہ دو دانوں کا مصالحہ فوراً ہی پہنچ گیا ایک کا نہ ابھرنا کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ تیسری مرتبہ غالباً مصالحہ بھی ایسا ہی سا تھا اور اگر سچ پوچھو تو ڈاکٹر صاحب کو [illegible] نا بھی نہ آیا کا بکثرت ہے ان کو شاید عمر بھر میں یہ پہلا ہی اتفاق تھا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۵)

رخصت ہوگئے۔ نو دس ہفتے میں ایک انقلاب عظیم ہوگیا۔ جو مرگیا وہ مرگیا جو بچ گیا وہ مرنے سے بدتر۔ کسی کا باپ گیا کسی کا بھائی گیا، کسی کی ماں گئی اور کسی کی بہن۔ عزیزوں سے عزیز چھوٹے، ماں باپ سے اولاد چھوٹی۔ کوئی بیوہ ہوئی کوئی یتیم ہوا۔ چیچک بلاشک ایک غضب الٰہی تھا کہ بالکل ہی تباہی آگئی۔ اتنا بڑا غدار شہر بالکل سنسان معلوم ہوتا تھا۔ دس پانچ آدمیوں کا مجمع ہیئت کے ساتھ تو نظر آجاتا تھا ورنہ رستے ویران اور سڑکیں سنسان کوئی ایسا ہی ضرورت کا مارا نکل آیا تو نکل آیا۔

دلوں میں ایسا خوف بیٹھ گیا تھا کہ سب کاروبار بند پڑے تھے۔ ہر وقت موت پیش نظر تھی۔ سائرہ جیسی کٹر عورت جس نے کبھی بھول کر بھی خدا کو سجدہ نہ کیا۔ ہر وقت اللہ اللہ کیا کرتی تھی۔ عابد اور سائرہ دونو میاں بیوی اپنے واسطے چاہے جس قدر خائف ہوں مگر بچے کی طرف سے دونو کو اطمینان تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا خدا جانے کس کا کہنا تھا کہ خطا ہی نہ کر سکتا تھا۔

ذرا امن ہوا تو دل ٹھکانے ہوئے۔ ہونی شدنی۔ ساس نے ایک دن کہا چھوٹی دلہن بیٹی اب تو اللہ نے فضل کیا پانی گرم کرو اگر ذرا بچے کا بنڈا دھلا دو۔ چار مہینے ہوگئے۔ گردن پر تھتڑ کے تھتڑ میل کے جمے ہوئے ہیں۔

تمام عمر میں یہ پہلا کام سمجھو حکم سمجھو تجویز کہو صلاح کہو سائرہ نے ساس کی رائے سے اتفاق کیا اور ارشاد کی تعمیل کی۔ وہ کیا کر رہی تھی تقدیر کروا رہی تھی کہنے لگی ہاں اماں جان سچ کہتی ہو۔ پان کھالوں تو اٹھ کر نہلا دوں۔ پانی کا تمتیڑا تو چولھے پر رکھا ہے۔

بچے کو بلا کر کپڑے اتارے، نہلا چکی تو اجلے کپڑے پہنائے، کنگھی کی، سرمہ لگایا بیچ میں ایک ٹیکا بھی لگا دیا کہ نظر نہ ہو جائے۔ ننھی کے دم میں تھی بچے سے کہنے لگی۔ جاؤ دادی اماں کو سلام کر آؤ۔ بچے نے جا کر سلام کیا۔ دادی نے گود میں لیکر پیار کیا۔ لیٹ کر کہنے لگا دادی اماں نیند آگ رہی ہے۔ دادی نے تکیہ سرہانے رکھ دیا۔ لڑکا بے کر سو گیا۔ زیادہ

سے زیادہ آدھ گھنٹہ سویا ہوگا۔ ہوں ہوں کرتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ دادی نے گود میں لیا تو بخار میں ہل ہلا رہا تھا۔

لڑکے کو بخار چڑھنا تھا کہ سب کے دل دہل گئے۔ عابد حکیم کو لینے چلا۔ ماں نے کہا بیٹا ابھی حکیم کو نہ لاؤ۔ دن خراب ہو رہے ہیں ایک آدھ دن دیکھ لو۔ کچھ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ صبح تک انشاء اللہ اُتر جائیگا۔ تم ایک دو آنے کے سچے موتی لا دو۔ میں بچے کو کھلا دوں۔

رات گذر گئی، صبح ہوئی، دوپہر ہوئی، شام ہوئی۔ غرض تیسرا دن ہوگیا۔ اور بخار نے جنبش نہ کی اب تو سب کو یقین ہوگیا کہ بخار سیتلا کا ہے۔ ایسے ویسے بخار کا تین چار دن کیا کام۔ دوپہر کو چڑھا شام کو نہ اُترا۔ رات کو پسینہ آکر اُتر گیا۔ یہ تھوڑی کہ بچہ نہا کر جو لیٹا تو اٹھا ہی نہ گیا مصیبت یہ کہ کچھ علاج نہیں حکیم یا ڈاکٹر جو کچھ ہیں گھر کی عورتیں یا محلے کی بڑی بوڑھیاں۔ مختلف آدمی مختلف رائیں ایک کہتی ہے دیکھو ہاتھوں میں کیسی بساند آ رہی ہے، ناک بہ رہی ہے چھینکیں آ رہی ہیں۔ بخار تو اُسی کا ہے۔ دوسری کہتی ہے نہیں بی اسکا بخار تو چھپا ہی نہیں رہتا فصلی ہے کل تک اُتر جائیگا۔

ایک دن ایک رات اور اسی مساوات میں گذرا پانچویں دن دیکھا تو تمام جسم لال ہوا اور اون کا مہین مہین جال بنا ہوا ہے۔ اب دوسرا اختلاف شروع ہوا ایک نے کہا موتیا۔ دوسری نے کہا سویا تیسری کی رائے ہوئی یہ تو کھسرا ہے ہنسی کھیلنی ڈیڑھ دن کی کل تک دیکھ لینا بھوسی سی اُڑ جائیگی۔

سائرہ تو بالکل ہی بدحواس تھی، ساس نے اتنی دور اندیشی کی کہ آنکھوں کی برنیوں پپوٹوں ناک کے نتھنوں پر کان میں سینہ پر سرمہ چھڑک دیا۔ دانے تھے کہ لمحہ بلمحہ بڑھنے شروع ہوگئے خشخاش جتنے تو اُسی دن ہوگئے تھے۔ دوسرے دن شام کو تو خاصا مٹر برابر دانہ تھا۔ سائرہ کا ماتھا بچہ کا بخار ہی دیکھ کر ٹھنک گیا تھا۔ دانوں کا دکھائی دینا تھا کہ بالکل ہی ناامید ہوگئی اور دیواروں سے ٹکریں مارنے لگی۔ ماں نے ہرچند سمجھایا، ساس نے بہتیری

تسلی دی۔ مگر اسکو سوا رونے کے کوئی اور کام نہ تھا۔ تین دن تک دانوں میں پانی پڑتا رہا۔ لڑکے کی حالت العیاذ باللہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ دن تو خیر کسی نہ کسی طرح گذر جاتا تھا مگر رات تمام آنکھوں میں کٹ جاتی تھی۔ سات دن ہو گئے بچے کے منہ میں اُڑ کر دانہ نہیں گیا۔ بخار سے پہلے کی کھچڑی کھائے ہوئے تھا۔ دانے بھرے اور خوب بھرے۔ نویں دن جب دانے خوب بھر چکے ہیں رات کو بچہ گھڑی ساعت پر آ گیا۔ سائرہ لڑکے کا نام لے لیکر بیان کرنے لگی۔ عابد چیخ پیٹ تو نہ رہا تھا مگر بچے کو دیکھ دیکھ کر کلیجے کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے۔ ادھر دادی اُدھر نانی سب تھہر بنے ہوئے تھے۔ رات بھر یہی حالت رہی۔ صبح کو حلال خوری کمانے آئی۔ سائرہ سے کہنے لگی بیگم! میں تو کچھ کہہ نہیں سکتی مگر بچوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ ماتا کی بھینٹ دو۔ میرا بھائی اس کام کو کرتا ہے ایسا بہت خرچ بھی نہیں ڈیڑھ روپے کی بات ہے۔ رات ہی کو بچہ ہوشیار نہ ہو جائے تو سہی

سائرہ۔ اری بھو ڈیڑھ دو کیسے میری تو چاہے جان تک کی بک جائے مگر میرا بچہ بچ جائے ایک بھینٹ کیا میں تو دو چڑھا دوں۔ جا تو ابھی بلا لا۔ پیچھے کمائیو۔

حلالخوری۔ بڑی بیگم سے پوچھ لیجئے ایسا نہ ہو میں لاؤں اور وہ بگڑنے لگیں

سائرہ۔ اری یہ پوچھنے کا وقت ہے۔ تو ٹوکرا رکھ اور جلدی لیکر آ۔

حلالخوری جاکر بھائی کو لائی۔ سائرہ اٹھ دروازے پر آئی۔ دیکھا سب ہی نے مگر خیال کسی کو بھی نہ ہوا۔ حلالخور نے کہا بیگم صاحب ماتا کی بھینٹ چڑھا دو ایک بکرا منگوا لو سوا روپیہ نقد دو۔ ڈھائی سیر کھیر پکوا لو۔ چاہے چھوٹے مولوی صاحب سے رکھوا دو، چاہے آپ میرے ساتھ چلکر چڑھا آؤ۔

سائرہ۔ اب اس وقت کھیر پکنے میں تو بڑی دقت ہو گی۔

حلالخور۔ میں اپنے ہاں پکوا لونگا

سائرہ نے اسی وقت صندوقچی کھول پانچ روپے مہتر کے حوالے کئے۔ ساس سنکر چپ کی چپ رہ گئیں۔ شام ہوئی۔ ادھر بچے کا سانس چل رہا تھا اُدھر سائرہ جانے کے واسطے برقع ڈھونڈھ

رہی تھی۔ مانا کہ سائرہ ماں تھی اسکی مامتا تھی جگر تھا کلیجہ تھا سب ہی کچھ تھا لیکن دادی بھی دشمن نہ تھیں۔ من بھر نہیں سیر بھر۔ سیر بھر نہیں چھٹانک بھر کچھ تو پوتے کی محبت ہووے ہی گی۔ جانور پالتے ہیں۔ اس سے اُنس ہوجاتا ہے وہ تو اپنے لال کا لال تھا۔ دوست تھیں یا دشمن۔ بہو سے تو کچھ نہ بولیں مگر سمدھن سے کہا بوا تم سمجھاؤ۔ یہ کیا بیہودہ پن ہے۔

شاکرہ ڈرتی ڈرتی اٹھی وہ سوچتی ہی رہی کہ کیا کہوں اور کیونکر کہوں جو سائرہ برقع اوڑھ لڑکی کو ساتھ لے مہتر کے پیچھے ہولی۔

یہ وہی بی سائرہ ہیں جو باپ سے قصور معاف کروانا کسر شان سمجھتی تھیں آج ایک مہتر کی خوشامد اور بچے کے کارن ایمان قربان کر رہی ہیں۔ گلی کے باہر چوراہا تھا۔ مہتر نے لیجا کر سجدہ کروایا دعا منگوائی اور بی سائرہ واپس آگئیں۔

خدا کی قدرت عجیب ہے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ سائرہ چوراہے سے گھر تک بالکل مایوسانہ حالت میں واپس آئی۔ پاؤں اٹھاتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ دل میں بُرے بُرے خیال آرہے تھے۔ لڑکے کی صحت سے اُس کو یہاں تک نا امیدی ہوئی تھی کہ رستے بھر یہی سوچتی رہی دیکھئے گھر جاکر زندہ بھی پاتی ہوں یا نہیں۔ لڑکھڑاتی ہوئی آئی اور سٹپٹاتی ہوئی اندر گھسی۔

قدرت میں قیاس کام نہیں کرتا۔ رات ہی کو باگ مرغ کی باگ کے مڑتے ہی آنکھیں کھولدیں کہنے لگا بھوک لگ رہی ہے۔ سب کی جان میں جان آگئی۔ کھانے کی بہت سی چیزیں پہلے ہی سے رکھ چھوڑی تھیں۔ گُڑ کے میٹھے چنے پانچ سات دانے کھا کر مُنہ پھیر لیا۔

تین چار دن میں دانے بالکل خشک ہوگئے ایڑی اور تلووں کے ذرا ہرے رہے مگر آٹھ دس روز میں وہ بھی مرجھا گئے۔ بیس پچیس روز میں سب دیولیاں سی جھڑ گئیں۔ نکلی اس غضب کی تھی کہ آنکھ اور کان حلق اور زبان غرض کہیں اور کسی جگہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پٹریاں کی پٹریاں جمی ہوئی تھیں اور گچھے کے گچھے رکھے ہوئے۔ چہرہ تو

تو ضرور بگڑ گیا۔ مگر مرد بچّے کی صورت کا دیکھنا کیا۔ بگڑ گیا تو بگڑ گیا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ سائرہ جیسی عقیدے کی کچی عورت کے واسطے تو بچّے کا اچھا ہونا بھنگی کو کامل سمجھنے کے واسطے کافی تھا۔ چنانچہ کامل اور عامل بالکہ اور دو چار ہاتھ بڑھا ہوا کہہ رہی تھی۔ سائرہ کی تقدیر میں مشرک ہونا تھا ہوئی۔ ایمان جانا تھا گیا۔ بھنگی کی بات خدا کو رکھنی تھی رکھی۔

چاہئے یہ تھا کہ سائرہ اس رحم و عنایت کے بدلے کچھ نہ کرتی تو درگاہ ایزدی میں سجدۂ شکر بجا لاتی مگر کمبخت کو بھنگی کی خوشامد سے فرصت ہوتی جب۔ داود [illegible] کچھ کرنا تھا کیا۔ ملانے کھانے نیاز دلائی۔ عابد نے مولود شریف پڑھی۔ شاکرہ نے خدا کا شکر کیا۔

(۳۴)

مولوی صاحب روانگی کے وقت یہ انتظام کر گئے تھے کہ درگاہ کے پینسٹھ روپے گھر کے خرچ کو کافی ہونگے۔ دوسو روپیہ ششماہی جو زکوٰۃ آباد کی سرکار سے آتا ہے جمع ہوتا ہے دونو لڑکے نوکر ہیں ایک پیشکار ہے دوسرا ضلعدار۔ وہ جو کچھ بھیجیں اُن کی بیویاں جانیں اور اوپر کا خرچ جانے۔ سخاوت پور کے بیس روپیہ ماہوار عابد اور سائرہ کو اوپر کے واسطے بہت ہونگے۔

چلنے سے گھڑی بھر پہلے تینوں بہوؤں کو سامنے بٹھا کر آواز کہدیا۔ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ خدا جانے تمہاری صورتیں دیکھنی اب نصیب ہوں یا نہ ہوں۔ تنخواہوں کا میں نے یہ انتظام کر دیا۔ سخاوت پور کے روپے میاں عابد اور چھوٹی دولہن کے۔ زکوٰۃ آباد کی تنخواہ تم تینوں بہن بھائیوں کی دونوں لڑکے اور چھوٹی لڑکی کی جمع ہوتی رہیگی۔ مسجد کے دس روپے منجھلی لڑکی کے۔ تمہارے کان بات ڈال دیتا ہوں خیال رکھنا۔

بچّے کے اچھے ہونے کی خوشی میں سائرہ نے ایک شادی کی تجویز کی۔ امیر ہو یا فقیر

جیتی جان کے ساتھ ہزاروں قسم کے خرچ لگے ہوئے ہیں۔ ساس کو ادھر تو لڑکے کی بیماری نے زیربار کیا (دوائی ٹھنڈائی نہیں ہوئی تو کیا مہمانوں کی آ رجا رکھانا، پینا، پان چھالیہ، ڈولیوں کا کرایہ، نذر نیاز، غرض بیس جھگڑے تھے) ادھر اپنی بیماری۔ زکوٰۃ آبادی کی تنخواہ آٹھ مہینے ہو گئے ایک کوڑی نہیں آئی۔ شادی کی آواز جس دن سے بچہ نہایا تھا اسی دن سے کان میں آ رہی تھی مگر ان کے منہ پر کسی نے رکھا نہ انھوں نے ہاں نا کا جواب دیا۔ سائرہ منتظر تھی کہ یہ آپ ہی تاریخ مقرر کر کے بلاوے بھیجدیں۔ میرے کہنے کی ضرورت بھی نہ ہو۔ جب یہ دیکھا کہ ساس کروٹ ہی نہیں لیتیں تو آپ ہی منہ پھوڑ کر کہنا پڑا اماجان دن نکلے چلے جا رہے ہیں۔ میرے دل میں وہم آتا ہے جمعرات کو بلاوے بھیجد یجئے۔

ساس۔ بیٹی میرے پاس ہو تو تم سے زیادہ تھوڑی ہے بچے پر سے صدقے کیا۔ کیا بتاؤں چھوٹی دلہن آج کل میرا ہاتھ ایسا تنگ ہو رہا ہے کہ کبھی نہیں ہوا۔ خبر نہیں کس طرح مہینہ گذار رہی ہوں۔ مجھے تو یہ نو دن پکڑنے مصیبت ہو گئے۔ کل بڑی بہو سے روپیہ لے کر اوپلے منگوائے ہیں۔

سائرہ۔ ہمارے واسطے ہوا ہی کب ہے جو آج ہو گا۔ نہیں ہے تو خدا نہیں ہی کرے سائرہ یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے میں گھسی۔ پیچھے سے میاں نے آ کر کہا ذرا میرے کرتے میں جلدی سے گھنڈی لگا دو اذان ہو رہی ہے۔

بیوی پہلے ہی منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ میاں کی صورت دیکھ کر اور بھی کپا ہو گئیں۔

عابد۔ سنا تو کرو کیا کہہ رہا ہوں۔ گھنڈی لگا دو نماز کو دیر ہو رہی ہے۔

سائرہ۔ مجھ سے نہیں لگتی وگتی۔ پیچک رکھی ہے اپنے ہاتھ سے لگا لو خدا نے ہاتھ دیئے ہیں۔ جب ایسے بیفکیرے باپ ہوں نہ۔ جو اولاد کی مٹی یوں برباد ہو۔ موئے فقیر بھی ہوتے ہیں تو دو صورتیں جمع کر لیتے ہیں۔ بلا سے کچھ نہیں تو۔ وہی سالن ہی سہی۔ تم اختنوں کے ہاں یہ بھی نہ جڑا۔ وہ تو میرے نام کی آگ ہے صبح ہی منجھلی بھابی کو

بیس روپئے دیئے ہیں۔ میں نے کہا تو جھٹ مکر گئیں۔ یہ بچہ اُن کا تھوڑی ہے اس کو تو میں اپنے ساتھ لیکر آئی تھی۔ کون سے لاکھوں اُٹھ جاتے۔ اے بیس نہیں پچیس۔ خبر نہیں کہاں کہاں اُٹھ جاتے ہیں۔

عابد۔ تم کو سوا ان باتوں کے اور بھی کچھ کام ہے۔ میری نماز قضا ہو رہی ہے۔ تم اپنی داستان لے بیٹھیں۔ تم نہیں لگاتیں تو میں بڑی بھابی سے لگوالیتا ہوں۔

سائرہ۔ بسم اللہ کرو۔ منع کس نے کیا ہے۔

عابد بھاوج سے گھنڈی لگوا نماز کو چلا گیا۔ سائرہ بیٹھی بڑبڑاتی رہی۔ نماز پڑھ کر آیا تو ماں نے بلا کر کہا بیٹا بہو شادی کرنے کو کہہ رہی ہیں۔ میں خدانخواستہ جلتی نہیں منع نہیں کرتی۔ پاس ہو تو سب کچھ ہے نہ ہو تو بھیک نہیں مانگی جاتی۔ تم سمجھا دو۔ آٹھ دس روز اور ٹھہر جائیں۔ خرچ آجائے مجھے کچھ عذر نہیں ہے۔

عابد ماں سے تو کچھ نہ بولا چپکا اُٹھ بیوی کے پاس چلا آیا۔ اتنا ہی کہنے پایا تھا ابھی آٹھ دس روز اور ٹھہر جاؤ۔ بیوی ماشاء اللہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کہنے لگی :۔

ٹھہرنے کو میں کسی کو ذبح تھوڑی کر رہی ہوں۔ نہیں کرتیں نہ سہی۔ سب آٹھ دس روز ہی ہیں۔ بھلا تم مجھکو اُلو بناتے ہو۔ اب وہ ایسی ہو گئیں کہ اُن کے پاس بیس پچیس روپے نہیں ہیں۔ میں تو اول ہی دن سے اس گھر کو دوزخ سمجھ رہی ہوں۔ جلا جلا کر یہ حال کر دیا۔ ہڈی سے چمڑا الگ گیا، بے عزتی کی روٹی، بے شرمی کا کپڑا۔ تمھارے دم میں دم ہے تو جان لیکر بھی پیچھا نہ چھوڑنا۔ لونڈیوں کی بھی ادر زیادہ ہو گی جیسی مجھ بہو کی کر رہی ہیں۔ وہ بھی تو دونوں بہوئیں ہیں ذرا ایسی ویسی ہو سارے گھر کو سر پر اٹھالیں۔ دو بہوئیں ہیں میں آئی لگائی۔ وہ بیگمیں ہیں میں زرخرید۔ دنیا بھر کے عیب مجھ میں۔ سارے جہان کی برائیاں مجھ میں۔ چھوٹی میں۔ زبان دراز میں۔ مکار میں بے ایمان میں۔ ماما تک کی بات کا یقین ہو اور نہ ہو تو میرا۔ ایک آفت ہو

تو بھگتی جائے۔ بچہ تک سے بغض ہے۔ ذرا کھیلتا ہوا دالان میں گیا اور چاروں طرف سے لے لے پڑی میں جب جانی منجھلی بھابی کو روپے نہ دیتیں۔ صبح ہی چوڑیوں کے بیس روپے دیئے ہیں۔ سب کاموں کے واسطے ہیں۔ شادی کے نام کے نہیں ہیں۔ خیر میں تو جسطرح ہوگا قرض کروں یا مام کروں۔ کروں ہی گی۔ آج بائیس دن تو ہو ہی گئے۔ میرا بچہ پڑ گیا تو میں کسی کا کیا کر لوں گی۔ کلیجے کو تو میرے ہی لگے گی بلا سے میں اپنی ایک چیز رکھدیتی ہوں۔ اللہ دیگا چھڑا لونگی۔ نہیں مجھکو اس سے زیادہ نہیں ہے۔

میاں۔ ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ قرض لیکر شادی کرنی کس نے بتائی ہے۔ اماں سنینگی تو تمھارے ساتھ مجھ کو بھی نکال باہر کرینگی۔

بیوی۔ میں تو خدا سے چاہتی ہوں کہ اس گھر سے غارت ہوں۔ کہیں وہ گھڑی آ بھی چکے۔ جواِن بلاؤں سے چھٹکارا ہو۔ ذرا مجھکو ڈولی لا دو۔

میاں۔ تم ایسی خودمختار کب سے ہوگئیں اماں سے بھی پوچھ لیا یا یوں ہی ڈولی لا دو۔ وہ تمھاری شادی سے جلتی تھوڑی ہی ہیں جو اُن کے نام سے بھی نفرت ہوگئی۔ پوچھنے کی ضرورت نہ اجازت کی حاجت۔ جو دل میں آیا وہ کیا جہاں جی چاہا وہاں چلی گئیں۔

بیوی۔ میکے جا رہی ہوں پردیس تو نہیں جا رہی کہ ہاتھ جوڑوں اور قصور بخشواؤں۔

میاں۔ میں ڈولی نہیں لا سکتا۔

عابد یہ کہکر باہر گیا۔ سائرہ ڈولی منگوا بچے کو لے میکے پہنچیں۔ سائرہ تو خیر ناتجربہ کار تھی یا سر پر شامت سوار۔ مگر شاکرہ کی عقل خدا جانے کہاں چرنے گئی تھی کہ لڑکی کو سمجھایا نہ گیا۔ آٹھ دن تھے آٹھ برس تو نہیں تھے۔ ایسی کیا آفت پڑ رہی تھی کہ جو کچھ ہوتا ان ہی آٹھ دنوں میں ہو جاتا۔

سائرہ ماں سے دو دو باتیں کر کھڑکی سے نکل ہمسائی کے ہاں آئی مالا اُتار حوالے کی کہ مجھ کو پچاس روپے ابھی منگوا دو۔

مفت خوروں کا کیا بگڑتا تھا ہلدی لگی نہ پھٹکری گھر بیٹھے بھلائے سات تولے کی مالا ہاتھ آگئی۔ ڈیڑھ سو روپیہ لا پچاس سائرہ کو دیئے باقی اپنے پاس رکھے۔ عیب کرنے کو ہنر چاہیئے۔ سائرہ کو اگر زیور ہی رکھنا تھا تو میکے کی بہت سی چیزیں تھیں۔ کمبخت نے روپیہ بھی قرض لیا تو چڑھاوے کی مالا پر کہ میکے کا بھی منہ کالا ہو۔ اس کی نگاہ میں سرے سے خاوند ہی کی وقعت نہ تھی۔ ساس کی عزت اور سسرال کا خیال تو دوسری چیز تھا۔

سائرہ کا یہ فعل خلافِ توقع نہ تھا شاکرہ کے مزاج سے البتہ بعید تھا کہ آگے دیکر بیٹی کی مٹی پلید کروا دی۔ سائرہ اپنے ہاتھوں اگر تمام زیور کو آگ لگا دیتی تو تعجب انگیز بات نہ تھی۔ مگر شاکرہ جیسی عورت جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دے خاک نہ سمجھ سکی۔ اگر شادی کا ایسا ارمان تھا، نواسے کی محبت ایسا ہی جوش کر رہی تھی، زیور ہی رکھنا تھا تو خدا کا دیا اپنے پاس بھی تو سب کچھ تھا۔ اپنی ایک چیز اٹھا کر رکھ دیتی۔ عقل کام نہیں کرتی کہ شاکرہ کی آنکھوں پر کیوں پردے پڑ گئے اور سمجھ کو کیا آگ لگ گئی۔ کہ اپنے در پر بٹھا کر بیٹی کو لٹوا دیا۔ یہ یقین نہیں آتا کہ شاکرہ کے گھر پر اتنا بڑا کام ہو جائے اور شاکرہ کو خبر بھی نہ ہو۔

روپیہ ہاتھ میں آنے کی دیر تھی۔ جمعرات کے بلاوے بھیجدیئے۔ سائرہ کی مرضی تو یہی تھی کہ شادی بھی میکے ہی میں ہو۔ مگر کچھ خدا ہی کو شرم رکھنی منظور تھی جو شاکرہ کو اتنی عقل آگئی کہ اپنے گھر پر نہ ٹھہرائی ورنہ پوری ہی لٹیا ڈوبتی۔

ساس کو کہیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جا کر بہو کے میکے جانے کی خبر ہوئی رنج بھی ہوا افسوس بھی مگر کیا کرتیں اور کس سے کہتیں بیٹا سامنے آگیا اس پر بگڑنے لگیں۔

عابد ایک سلیم الطبع منکسر المزاج آدمی، وہ تو ماں تھیں راہ چلتا بھی اگر اس کو دو چار باتیں سنا جاتا تو چاہے ناگوار معلوم ہو لیکن الٹ کر جواب نہ دیتا۔ کچھ عجیب

قماش کا آدمی تھا۔ بھلے بُرے سعادتمند بدمعاش نمازی پرہیزگار، چوٹٹے، مکار سب ہی قسم کے آدمی دیکھنے میں آئے مگر عابد جیسا البشر ہماری نگاہ سے تو گذرا نہیں مزاج میں شر نہ تھا، مُنہ میں زبان نہ تھی، طبیعت میں غصہ نہ تھا، لڑائی کا مادہ نہ تھا خفگی کی عادت نہ تھی، کوئی شوق اس کو نہ تھا، کوئی امنگ اس میں نہ تھی، جوان آدمی ہو کر کوئی ارمان اس کو نہ تھا، کوئی حسرت اس کو نہ تھی، آدمی کیا پتھر تھا۔ اچھے سے واسطہ نہ بُرے سے کام، بھلائی سے مطلب نہ بُرائی سے غرض۔ خوشامد سے معذور التجا سے مجبور۔ خدا معلوم وہ بیوی کی خوشامد کس طرح کرتا ہوگا اور نماز کے بعد خدا سے دعا کیا مانگتا ہوگا۔

عابد جیسا مردہ دل آدمی جو جوانی میں دنیا و مافیہا کو فانی سمجھ چکا دو چار ہزار میں شاید ایک آدھ نکلے تو نکلے۔ ماں کی گفتگو سُن کر تھوڑی سی افسردگی ہوئی۔ مگر بیوی کا نام سنکر مُسکراہٹ سی آگئی۔ چپکا بیٹھا سنتا رہا اور وہ کہتی رہیں بڑی مشکل سے اور دقت سے رک رک کر اور چبا چبا کر اتنا کہا:۔

آپ جو فرمایئے وہ میں کردوں۔

اُن بیچاری کی خود ہی عقل حیران تھی کیا بتائیں اور کیا فرمائیں۔ جواب نہ دینے پائی تھیں کہ کہاروں نے آواز دی سواری اُتروالو۔ بہو کا خیال بھی نہ رہا۔ ماما سے کہنے لگیں دیکھ تو کون ہے۔ اتنے میں آگے آگے بچہ پیچھے پیچھے بہو بیگم آرہی ہیں۔

سائرہ ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لڑکی کو بھیجکر میاں کو بلوایا۔ میاں ابھی چوکھٹ ہی پر تھا کہ بیوی نے کہا:۔

میں تمھارے یا تمھاری اماں کے بھروسہ پر نہیں بیٹھی ہوں۔ میں نے اپنا سب انتظام کرلیا۔ تم سے تو کسی کام کی امید کرنی ہی فضول ہے۔ اپنی اماں سے کہدو جہاں جہاں بلاوے بھیجنے ہیں جمعرات کے بھیجدیں۔

عابد۔ تم آپ ہی جا کر کہدو۔ میں نہیں کہتا تم جانو وہ جانیں۔ وہ تمھاری شاکی تم اُن سے بیزار، وہ تم سے ناخوش تم اُن سے متنفر، میں ادھر بولوں نہ اُدھر۔

سائرہ۔ تم کیا کہتے ہو سارا زمانہ جانتا ہے کہ وہ میری دشمن ہیں جیسی میں اُن سے بیزار ہوں میرا اللہ جانتا ہے۔ جیسا میں نے صبر کیا اللہ میرے آگے لائے۔ جیسا اُنھوں نے ظلم کیا اللہ اُن سے سمجھے۔

عابد۔ تم میرے سامنے اُن کی شان میں گستاخی مت کیا کرو۔ تم تو اپنی زبان کے آگے دنیا بھر کو بے ایمان سمجھتی ہو۔ تم نے دشمن سمجھ لیا اچھا کیا مگر میرے روبرو ان کلمات کی احتیاط کیا کرو۔ میں جہاں تک درگذر کرتا ہوں تم سر پر چڑھی جاتی ہو۔

سائرہ۔ یہ الٹی الٹی باتیں مجھے نہیں اچھی معلوم ہوتیں جتنا میں دبتی ہوں اُتنے ہی تم شیر ہوئے جاتے ہو۔ مجھکو تمھارا ڈر نہ تمھاری اماں کا۔ تمھاری پرواہ نہ تمھاری اماں کی۔ مجھکو رخصت کرد اپنی اماں کو لئے بیٹھے رہو۔ تم مجھ سے ناخوش میں تم سے ناخوش تم اپنے گھر خوش میں اپنے گھر خوش۔ تم تو خدا سے چاہتے ہو بچے کی شادی میں کسی طرح کھنڈک پڑے ایسے باپ سے تو غیر اچھے۔ خیر تم نہیں کہتے میں آپ جا کر کہدیتی ہوں۔

عابد کھڑا بیوی کا مُنھ ہی دیکھتا رہا اور بیوی جو وہاں سے اٹھی تو سیدھی ساس کے پاس

سائرہ۔ میں نے سب فکر کر لیا۔ تمھیں جس جس کو بلانا ہے پرسوں کے بلاوے بھیجدو۔ اپنے ہاں میں خود بھیج آئی۔

ساس۔ بیٹی میں تو کچھ نہیں کہتی جو کیا وہ اچھا کیا جو کرتی ہو وہ خوب کرتی ہو کوئی بڑا بوڑھا تمھارے سر پر نہیں اپنے دل کی مختار ہو۔ مجھے بلاوے کہاں بھیجنے ہیں۔ چار غیر نہ بیٹھے میں بیٹھ گئی۔ اور کوئی نہیں آتا جاتا۔

سائرہ۔ نہیں آتا تو نہیں سہی۔ اب میں آپ تھوڑی ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑنے جاؤں گی۔ یہ اچھی زبردستی ہے آپ کریں نہیں دوسرے کو کرنے نہ دیں میں تو

کروں ہی گی۔ چاہے بگڑو چاہے سنورو۔ جو کہنا تھا وہ کہہ دیا چاہے بلاؤ چاہے نہ بلاؤ۔ ساس کیا اور میاں کیا اگر تمام زمانہ سر پٹکتا تو سائرہ جمعرات کا جمعہ کرنے والی نہ تھی۔

گو سائرہ کی حالت اور عادت سے ناممکن بھی ممکن و قرین قیاس تھا تاہم ساس کو یہ امید نہ تھی کہ یہ ایسی آزاد اور یہاں تک خودسری ہو جائیگی۔ بہو کی بات کا جواب تو دیدیا مگر یقین نہیں آیا کہ یہ سچ کہتی ہے۔ یقین آجاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کرتیں۔ بلاوے نہ بھیجتیں مہمان نہ بلاتیں گھر تو درست کر لیتیں۔ شاکرہ کے صبح ہی صبح آنے سے البتہ یہ خیال ہوا کہ آج جمعرات ہے کہیں سچ مچ ٹھہرا تو نہیں دی ابھی سوچ ہی رہی تھیں کہ ماموں نے آکر آواز دی پان چھالیہ لے جاؤ اور ریزگاری کے واسطے رومال بھیجدو۔ اب تو بڑی بی کا چہرہ لال ہو گیا مگر کیا ضابط عورت تھیں دل کی کیفیت جو کچھ ہو بظاہر تیوری پر بل نہ آنے دیا۔ اُٹھیں جو کچھ ہو سکا اور جتنا کچھ ہو سکا اور جس طرح بھی ہو سکا گھر کو ٹھیک کیا دریاں خاک میں اٹ رہی تھیں اتنا وقت تو تھا نہیں کہ ان کو جھڑواتیں۔ جھاڑو دلوا کر اوپر سے چاندنی بچھا دی۔ ایک دالان درست کرنے پائی تھیں کہ مہمان آنے شروع ہو گئے۔ غصہ تو بیڈھب آرہا تھا اور واقعی غصہ کی بات بھی تھی نہانے سے گئیں دھونے سے گئیں، دھوبی کے دھوئے ہوئے سفید کپڑوں سے گئیں۔ بیویاں ڈولی سے اُتر اُتر کر ملنے آرہی ہیں۔ بڑی بیوی کے کپڑے گردآباد، سر پر منوں خاک، صورت ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔

اندیشہ یہ تھا کہ ساس کی ناراضگی شادی میں بدمزگی پیدا نہ کردے مگر وہ بہو کی طرح چھچھوری تھوڑی تھیں، اُف بھی نہ کی۔ دن بھر مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگی رہیں اتنا تو ضرور کیا کہ آپ کھانا نہ کھایا مگر کیا مجال جو شادی اور شادی کے بعد کبھی بیٹے یا بہو کے منہ پر کہا ہو

(۳۴)

عابد کے ایک دوست جو برسوں ہم سبق رہے اور بنگالے کے رہنے والے تھے اور اب کسی رسالے سے تعلق ہو گیا تھا اتفاق سے شہر میں آئے اُن کے آنے کی غرض کچھ ہی ہو۔ عابد کو ایک وقت کی دعوت کرنی لازم تھی۔

عابد کی حالت بلکہ قسمت پر ہنسی تو کیا خاک آتی ہے رونا آتا ہے۔ باہر دعوت کر آیا، اندر بیوی سے کہا۔ آج ذرا کھانا زیادہ پکیگا۔ تم اتنا کام کرو کہ تمام انتظام شام ہی سے ہو جاوے مغرب کے بعد کھانا بالکل تیار ملے۔ اماں کو بخار چڑھ آیا۔

میاں کی یہ درخواست بیوی کی نگاہ میں جس قدر وقعت رکھتی تھی وہ ظاہر ہے۔ میاں ماشاءاللہ اتنے سیدھے کہ بیوی کی نالائقی کا قبل از وقوع کبھی شبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ بیوی چشم بد دور اتنی ٹیڑھی کہ میاں کیسی ہی عاجزانہ گفتگو کیوں نہ کریں سیدھے مُنہ بات ہی گناہ۔ پہلے تو میاں کو کچھ جواب ہی نہ دیا۔ دو تین دفعہ کہا تو ناک بھوں چڑھا کر یہ کہدیا۔ میرے آپ سر میں درد ہو رہا ہے۔ تھیں تو روز یہی شعبدے آتے ہیں مجھ سے یہ جنجال نہیں بھگتے جاتے۔

میاں۔ آج تو جس طرح ہو سکے تم اس تکلیف کو گوارا کر لو کیونکہ میں کہہ چکا آیندہ احتیاط کرونگا۔

بیوی۔ درد کی تو مجبوری ہی۔ بخار میں آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ آخر گیہوں بیٹھی تلوا رہی ہیں یا نہیں۔ کھانے کا نام سُنکر بخار چڑھ آیا۔ اُن ہی سے پکواؤ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا میں بھی کر دوں گی۔

میاں۔ ہاں اس سے تم خاطر جمع رکھو تم اکیلی نہیں رہو گی۔ وہ تمھارے ساتھ لگی رہیں گی۔

میاں یہ کہکر کوٹھے پر گئے۔ ماں نے ظہر کی نماز پڑھی۔ پڑھ چکیں تو اسی بخار

میں اُٹھ کر کھانے کا اہتمام شروع کیا۔ عصر کے وقت تک بہو کی راہ دیکھتی رہیں مگر بہو کو ایسی کیا غرض پڑی تھی کہ مفت کی بیگار بھگتے۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے باورچیخانہ میں وارد ہوئیں۔ پتیلیوں کو کھولکر دیکھا، ایک ایک نوالہ سب کا چکھا۔ سالن میں نمک زہر تبایا۔ چاولوں میں کنی بتائی۔ کباب کچے تجویز کئے۔ ساس اندر کے دالان میں جا لیٹی تھیں۔ ساس سے کہا آٹا تو گندھی چکا ہے لاؤ پراٹھے میں ڈالدوں۔

ساس۔ پراٹھے تو یہ بھی ڈال لیگی۔ تم فقط قورمہ بگھار لو اور تو سب تیار ہے میری اب ہمت نہیں پڑتی۔ نہیں میں آپ ہی بگھار لیتی۔

سائرہ کو آج تک کھچڑی پکانے کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ قورمہ تو بڑی چیز تھی۔ ماما یہ کہکر باہر گئی "اے ہے بیوی دہی بھول آئی تم اتنے مصالحہ بھونو میں بھاگ کرے آؤں"۔ اب باورچیخانہ تھا اور پکا پکایا کھانا اور بی سائرہ مصالحہ بھوننے کھڑی ہوئیں تو کوئلہ۔ اور گوشت بگھارنے اٹھیں تو جلا کر خاک کردیا گھی ڈالا تو رتی بھر، پانی ڈالا تو مواں مُنہ۔ غرض قورمہ تیار ہوکر اُترا تو عجب ڈھنگ کا۔ رنگ کالا، مزے کا کڑوا، دیکھنے میں قلیا، کھانے میں دلیا۔ قورمے کے علاوہ دو چیزوں پر اور عنایت کی اُن کو بھی غارت کیا، زردہ دم پر تھا اس پر یہ کرم کیا کہ کنی سمجھ کر گھونٹ گھانٹ گلتھی کر رکھدیا۔ پلاؤ بالکل تیار تھا، پتیلی اُتار نیچے رکھدی، چاول پاٹھا مار گئے۔

اِدھر زردہ برباد ہوا اُدھر پلاؤ کا ناس ہوا۔ ساس بخار میں ہی رہیں۔ بہو نے کھانا نکال باہر بھیجا مگر کیسے پھوہڑپنے سے۔ زردے کی طشتری میں راکھ ہے، سالن میں بوٹی نہیں۔ دسترخوان پر روٹی نہیں۔

عابد کھانے کو دیکھتے ہیں تو سبحان اللہ۔ ہم تو عابد کی تعریف ہی کریں گے صدآفرین اس کی ہمت کو بیوی کی بدولت یہ کچھ ذلت اُٹھائی۔ مگر کیا مجال جو

ذرہ بھر شکایت کی ہو۔

کوئی چیز کھانے کے قابل ہوتی تو کھاتے۔ دو دو چار چار نوالے کھا کھا کر سب نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ایک شامی کباب ٹھیک سمجھو وہ کوئی پیٹ بھرنے کی چیز تو تھی ہی نہیں دو نہیں چار کھا لئے۔ باقی سالن کے پیالے بھرے کے بھرے، پلاؤ زردے کی رکابیاں جوں کی توں۔ سارا کھانا یوں کا یوں ہی پلٹ آیا اور بھو کے ننگالی رخصت ہوئے۔

(۳۵)

عابد اپنے دوست کو پہنچانے تھوڑی دور ساتھ چلے۔ اندھیری رات تھی۔ ابر گھرا ہوا۔ گلی کے نکڑ پر سڑک کوٹنے کے کنکروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اندھیرے میں اوپر چڑھ گیا، کنارے پر تھا گڑھا، اترتی دفعہ پاؤں اس میں جا پڑا۔ آدھا دھڑ گڑھے میں آدھا کنکروں پر، ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہائے ہائے کرتا گھر آیا۔ چاہا بہت کہ صبر کروں۔ مگر ہڈی ٹوٹی تھی خراش تو تھی ہی نہیں۔ لمحہ بہ لمحہ تکلیف بڑھنے لگی کسی طرح کل نہ پڑتی تھی جس پل لیٹتا تھا تکلیف اور جس کروٹ لیٹتا تھا بے چینی۔ صلاح یہ ہوئی کہ گنگی پہلوان کو دکھانا چاہیے۔ گنگی آئے، چار پانچ منٹ تک تو ہاتھ کو ادھر ادھر پلٹ پلٹا کر دیکھتے رہے اور پھر کہنے لگے پیر مرشد یہ تو کنجی میں موچ آ گئی ایک لیپ لگا لیجئے رات بھر میں ہاتھ کھل جائے گا۔

"صاحب الغرض مجنون" دو روپے میاں گنگی کے نذر کئے۔ خبر نہیں اللہ کا بندہ کاہے کے پتے پیس کر باندھ گیا۔ خدا جانے پتوں میں کیا تاثیر تھی کہ ایک چیخ آسمان اور ایک زمین۔ تمام رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ ماں کی تو ماتا تھی لیکن دونوں بھاوجوں کو بھی پلک سے پلک جھپکانی حرام تھی مگر لعنت خدا کی سائرہ پر جھوٹے منہ بھی تو آکر نہ پوچھا یہ نہیں کہ جانتی نہ ہو جس وقت میاں تڑپتا ہوا آیا ہے بیٹھی پان کھا رہی تھی۔ گنگی کے آنے تک تو اپنے کمرہ میں بیٹھی جاگتی رہی۔ پھر جو پڑ کر ڈھیر ہوئی تو ایک بجے

کے قریب جب نند نے آکر ایک لمبی پٹی کے واسطے جگایا ہے ہوشیار ہوئی، اٹھی تو سہی مگر کیسی بگڑتی ہوئی کہ نند بھی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

نند۔ چھوٹی بھابی ایک پٹی دیدو۔

بھاوج۔ میرے پاس پٹی رکھی ہوئی ہے؟

نند۔ کل جو لم درازآئی ہے اُس میں سے عرض کی ایک اُتار دو۔

بھاوج۔ توبہ، سونے کا بھی تو حکم نہیں ہے۔ دن بھر تجھے چین نہ لینے دیں رات بھر تمھاری آنتیں پڑی رہیں۔ پتی رکھی ہوئی ہے کوئی ہو لیجاؤ، لم دراز تو میں نے رنگنے کو دیدی۔

اتنا کہکر لیٹ گئی اور لیٹتے ہی سوگئی۔ نند کی تو ہستی کیا تھی جو بھتیجی کو ہاتھ لگالیتی دو تین آوازیں اور دے چلی آئی۔ بڑی بھاوج نے اپنا پرانا دوپٹہ پھاڑکر پٹی باندھی صبح کو ڈاکٹر نے آکر ہڈی جوڑی۔ اس کے زور سے بخار بھی چڑھ آیا۔ غرضکہ پندرہ بیس روز بڑی مصیبت سے گذرے! مرحبا بی سائرہ میاں کی خدمت تو درکنار کسی دن اور کسی کام میں رتی بھر مدد نہ دی۔

مزاج میں کیسی ہی انسانیت اور طبیعت میں کتنا ہی انکسار کیوں نہ ہو تجربہ انسان کو کھرے کھوٹے کی شناخت اور اچھے بُرے کی تمیز بتا دیتا ہے۔ عابد کی طینت میں گو مخالفت کا مادہ قریب قریب معدوم تھا مگر دوران علاج میں اس کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ بیوی کو میرے جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم۔ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا کہ ایسی بیوی پلّے پڑی۔ ہر دم کی سوختگی، ہر لمحہ کا عذاب۔ غرض عمر خراب ہوئی میری تو خیر تقدیر میں یہی لکھا تھا جس طرح ہوگا مروں گا اور بھروں گا۔ مگر میرے ساتھ اماں کی کیسی مٹی پلید ہوئی۔ میں نے آج کی گھڑی تک کبھی ان کو جواب بھی نہیں دیا۔ یہ کم بخت جو مُنہ میں آئے وہ کہہ ڈالے اُنکی شرافت تو

یہانتک کہ بہو سے اطاعت کی متوقع نہیں، فرمانبرداری کی خواہشمند نہیں۔ خدمتگزاری کی خواہاں نہیں۔ بہو کی لیاقت کچھ کہ زبان درازی کو فخر سمجھے، گستاخی کو سعادت جانے انکی عنایت بھلمنسایت محبت کچھ ہی سمجھو کہ برابر درگذر کر رہی ہیں۔ یہ وقت اُن کا بڑھاپے کا ہے اسی دن کو اولاد کا ارمان کرتے ہیں کہ آخر وقت خدمت کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ میری طرف سے ان کو متواتر اذیت پہنچ رہی ہے۔ مُنہ سے کہنے کو کہہ لوں۔ دل میں سمجھنے کو سمجھ لوں کہ نعمتِ غیر مترقبہ ہیں، باعث برکت ہیں مگر اس کہنے سے حاصل کیا۔ عقل کام نہیں کرتی۔ کیا انتظام کروں۔ جی یہ چاہتا ہے کہ وہ بڑی بوڑھی بنی بیٹھی رہیں اور ہم سب دست لبستہ خدمت میں حاضر رہیں۔ مجھکو تقدیر کی کیا خبر تھی۔ میں تو قیامت تک بھی اجازت نہ دیتا۔ بلا سے تھوڑی دیر کے واسطے بے شرم ہو جاتا۔ مگر اس عمر بھر کے عذاب سے چھوٹ جاتا۔ خود بھی مصیبت میں پھنسا اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی پھنسایا۔ بارہا دیکھ چکا ہوں جب کوئی سخت سُست بات کہی۔ مُنہ دیکھ کر چُپ ہو جاتی ہیں۔ کیا میں سمجھتا نہیں یا جانتا نہیں کہ اُن کے دل پر صدمہ پہنچتا ہوگا پھر آخر اس گناہ کا مرتکب کون ہے؟ میں ہی تو ہوں۔ سبب گناہ میں ہوں تو مرتکب گناہ پہلے ہوا۔ بڑی بیٹی نے مَرکر داغ دیا۔ چھوٹے بیٹے نے جیتے جی باغ باغ کر رکھا ہے۔

عابد کے دل میں ان خیالات کا آنا تھا کہ بیوی کی صورت سے نفرت ہو گئی۔ وہ طبیعت رہی نہ رغبت، الفت رہی نہ محبّت، نوبت یہانتک پہنچی کہ بلا ضرورت بات تک کرنی چھوڑ دی۔ صبح کا کھانا کھایا اور اوپر جا بیٹھا۔ رات کے دس بجے اترا کھانا کھایا پڑ کر سو رہا۔

(۳۶)

اب یہ دیکھنا ہے کہ عابد کی اس حالت کا سائرہ پر کیا اثر ہوا۔ اور نتیجہ موافق ہوا یا نہ ہوا۔ سائرہ جیسی بھی تھی بہرحال انسان تھی حیوان نہ تھی کہ اثر محسوس ہوتا۔ بچہ

نہ تھی، اندھی نہ تھی کہ میاں کے تعلقات میں اتنی بڑی تبدیلی ہو جاتی اور اسکو خبر بھی نہ ہوتی۔ دیکھنے سے معذور نہ تھی سمجھنے سے مجبور نہ تھی اب رہی اصلاح یہ البتہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ میاں کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کو اور ہی دُھن سوار ہوئی۔ یقین ہو گیا کہ میرا گھر ساس نے کھویا۔ آج بلا ضرورت بات نہیں کرتے۔ اگر میر اُن کا ساتھ رہا تو کل بہ ضرورت بھی بات نہ کرینگے۔ جس طرح ہو سکے الگ گھر لیکر بیٹھوں۔ یہ خیال ذہن میں ایسا جما کہ رفتہ رفتہ ارادہ ہوا اور آخر کار مصمم۔ منجھلی اور بڑی دونو جٹھانیوں سے بھی کہدیا۔ اُن دونوں نے جاکر ساس سے جڑ دیا۔

جیسی ساس سائرہ کو ملی ایسی اور پرائی اتنی جہان کی بیٹیوں کو نصیب ہو۔ یہ سُنکر سیدھی اٹھی سائرہ کے پاس چلی آئیں۔ سائرہ کھانا کھا رہی تھی پاس بیٹھ کر کہنے لگیں:۔

بیٹی! میں اس دن کو تھیں بیاہ کر لائی تھی کہ تم میری صورت سے بیزار ہو کر الگ گھر کرو۔ یہ گھر کسی اور کا ہے۔ تمھارا نہیں ہے؟ میں نے ایسی کیا خطا کی کہ تم میرے نام پر لاحول بھیجنے لگیں۔ چھوٹی دولہن میں نے بیٹی سے زیادہ تم کو سمجھا۔ ہر طرح تمھاری خاطر کی۔ ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ کسی طرح تمھارا دل آزردہ نہ ہو۔ جو تم نے کہا ماں میں ہاں ملاتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ملا کہ تم الگ گھر لے کر بیٹھو۔ بیٹی! میری چار دن کی زندگی کیوں ویران کرتی ہو۔ میرے بعد جہاں جس کے سینگ سمائیں چلے جانا۔ میں تمھاری کسی بات میں خلل دیتی ہوں تو بتاؤ۔ غیروں کی طرح بیٹھی دیکھتی ہوں اسی واسطے کہ نہ میں بولونگی نہ تم کو بُرا معلوم ہوگا۔ تمھارا گھر ہے جو جی چاہے سو کرو۔ میں کیا عاقبت کے بورئیے سمیٹونگی بے حیا زندگی ہے کہ دن بھگت رہی ہوں اور تھوڑے دنوں کی مہمان ہوں اگر تمھاری یہی خوشی ہے تو یہ رنج بھی لیتی جاؤں گی۔

سائرہ۔ مجھے تو جھوٹی سچی باتیں ملانی آتی نہیں۔ وہاں بیٹے کو لگا لگا کر فرشتہ کر دیا کہ وہ بات نہیں کرتے یہاں آ کر یہ کہنا شروع کیا۔ میں تو کھری آدمی ہوں جو

دل میں آیا وہ صاف کہدیا۔ میں کیا جانتی نہیں۔ اُنہی ڈونفتنیوں نے جاکر لگایا ہے آپ ہی تو مجھ کو بہکایا۔ آپ ہی وہاں جاکر اُکسایا۔ خیر میں تو نہیں مکرتی۔ ہاں میں نے کہا تھا۔

ساس۔ عابد کی تو کیا مجال ہے کہ تم کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے۔ سر پر ہاتھ رکھکر میں لائی ہوں وہ بیچارا ہوتا کون ہے۔ بیٹی! اب ایسی بات مُنہ سے نہ نکالنا۔ بہکانے والوں کا کیا ہے ایک شگوفہ چھوڑ دیا اور سیر دیکھنے بیٹھ گئے۔

بہو کو سمجھا کر اپنے دالان میں آئیں۔ ماما کو بھیجکر بیٹے کو بلوایا۔ عابد آیا تو کہنے لگیں :-

میاں عابد! تم بھلے مانس کہلاتے ہو مولوی کہلاتے ہو، شریف کہلاتے ہو اور گُن تھارے ایسے کہ کمینوں کو بھی مات کیا۔ بھلا یہ کیا سوجھی کہ بیوی سے بات نہیں کرتے۔ بیٹا مجھ بوڑھی ماں کے چونڈے کی اچھی لاج رکھی۔ آج کو بات کرنی چھوڑی کل کو گھر سے نکال باہر کرنا بس تو جب تم خود مختار ہو گئے تو تم جانو تمھارا کام جانے۔ میں بیچ میں بولنے والی کون۔

عابد۔ یہ تو آپ نے غلط سُنا کہ میں نے بات کرنی چھوڑ دی۔ البتہ کم کردی۔ اُنہیں میرا کیا قصور ہے آخر ان بدعنوانیوں کی کوئی انتہا بھی ہو، مجھ کو اپنی ذاتی تکالیف کی مطلق شکایت نہیں۔ رونا یہ ہے کہ آپ کی اطاعت نہیں کرتیں۔

ماں۔ نہیں کرتیں تو وہ جانیں میں جانوں تم کیوں آپس میں دل بُرے کرو۔ مجھ کو اُنکی نافرمانی کا اتنا رنج کبھی نہیں ہوا۔ جتنا تھاری اس نالائقی کا۔ تم بہت سعادتمند ہوئے کہ میرے رنج کا انتظام کیا تو ایسے طریقہ سے جو اس سے زیادہ رنج آمیز ہے۔

عابد۔ اگر آپ کو ناگوار ہو تو آپ معاف کیجئے آیندہ احتیاط کرونگا۔

ماں۔ میری مراد تو یہی ہے کہ تم کو ہنسی خوشی چھوڑ کر جاؤں جو ہو گیا سو ہو گیا اب ایسا بیہودہ پن نہ کرنا۔

عابد۔ اب انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا۔

عابد یہ کہہ کر باہر آیا دروازے پر دیکھا تو ڈولی رکھی تھی اندر آتا تھا کہ بیوی سے مٹ بھیڑ ہوئی۔ میاں پوچھتا ہی رہا سائرہ ڈولی میں بیٹھ پردہ چھوڑ کہاروں کو آواز دے یہ جا وہ جا۔

پہلونٹی کے لڑکے کی پیٹھ پر ایک تین مہینے کی بچی اتر کر اب سائرہ کی ایک لڑکی ساتویں برس میں تھی۔ ایک لڑکا چوتھے برس میں ایک لڑکی تیسرے میں۔ برس بھر کی لڑکی گود میں۔ آٹھ نو برس کی بیاہی پانچ چھ بچوں کی ماں بہوں بہوں کرتی ڈولی سے اتری۔ باپ، ماں، بہن، بھائی سب پریشان ہو گئے۔ ماں کھچڑی دھونے اٹھی تھی کہ بیٹی کے رونے کی آواز کان میں آئی۔ جان نکل گئی، سٹ پٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی بیٹی سے پوچھا خیر تو ہے؟

کوئی بات ہو تو بیٹی بتائے، ماں پوچھ پوچھ کر تھک گئی۔ باپ سر ٹیک ٹیک کر ہار گیا۔ مجبور شاکرہ جل کر کھڑی ہو گئی۔ میاں سے بگڑ کر کہنے لگی۔ اے ہے اتنی پر چول کا ہیکی ہے۔ لڑائی بھڑائی ہوئی ہوگی۔

شاکرہ سائرہ کی ماں ضرور تھی مگر ایسی بے غیرت نہ تھی کہ داماد کی آؤ بھگت میں کمی کر دیتی۔ بیچاری کا بیٹھ پیچھا ہے نو برس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بیٹی آئی ہو اور داماد کو نہ بلایا ہو جب تک بیٹی رہتی دونوں وقت داماد یہیں کھانا کھاتا، اچھا یا برا جو میسر ہوتا مگر کھلاتی ضرور۔

بیٹی کی شکل دیکھتے ہی اس نے بیٹے کو بھیجدیا تھا کہ دولہا بھائی سے کہہ آ۔ آج شام کو کھانا یہیں کھائیں۔

سلیم تھوڑی دیر تک تو سائرہ کی داستان مصیبت سننے کا منتظر رہا۔ مگر پھر اٹھ کر چلا گیا۔ باپ کے بعد بیٹی نے ماں کو اپنی رام کہانی سنائی اور یہ بھی کہدیا کہ

میں تو اب اس در پر جاتی نہیں۔ برابر والا گھر خالی کروالیں۔ میں موجود ہوں بلا سے دکھڑا کروں گی اور پیٹ بھرونگی مگر وہاں نہ جاؤنگی۔

رنج اور افسوس زیادہ تر خلاف توقع واقعات کا ہوتا ہے۔ سائرہ کے مزاج اور عادت سے یہ تجویز کچھ بعید نہ تھی۔ شکایت شاکرہ سے ہے کہ ایسی سمجھدار اور شکر گزار عورت ہو کر بیٹی کی رائے سے فوراً اتفاق کر لیا۔ شاکرہ کا فرض تھا کہ سائرہ کو سنتے ہی ڈانٹ دیتی۔ مانا کہ وہ سنتی تو ماں کی کیا باپ کی بھی نہیں مگر جو کچھ کرتی سسرال ہی میں جا کر تو کرتی شاکرہ کے اوپر تو بات نہ آتی۔

عابد نے ماں کے کہنے سے یہ ارادہ مصمم کر لیا تھا کہ اب بظاہر بیوی کو ذرہ بھر بھی موقع شکایت کا نہ دونگا۔ ابھی یہ ارادہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ بیوی نے یہ عنایت کی میاں سے ذکر نہ کیا، ساس سے اجازت نہ لی۔ اپنی خوشی ڈولی منگوا چمپت ہوئی۔

عابد کے مزاج میں حرارت نہ سہی غصہ نہ سہی شرارت نہ سہی مگر شوہر تو تھا ہی۔ بیوی کی یہ حرکت بہت ہی ناگوار ہوئی ماں کے پاس آکر شکایت کرنے لگا۔ ماں سمجھا رہی تھیں کہ سسرال سے طلبی کا پیغام پہنچا۔ آج پہلا دن بلکہ پہلا اتفاق تھا کہ عابد کو عمر بھر میں ایک جوش آیا مگر عجیب مزاج کا آدمی تھا۔ دروازے تک آتے آتے بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ وہاں اقرار کر لیا ماں کے پاس آیا تو پھر مرضی پلٹ گئی۔ ماں نے سمجھا بجھا کر رضامند کیا اور مغرب کے بعد سسرال بھیجدیا۔

شاکرہ نہ ہوتی تو عابد بھوکا آتا، بھوکا سوتا، بھوکا اُٹھتا اور بھوکا ہی جاتا۔ سائرہ تو اُدھار کھائے بیٹھی تھی کہ کب میاں آئے اور کب الگ گھر کا فیصلہ کروں۔ مگر شاکرہ نے اتنی انسانیت کی کہ پہلے کھانا کھلا دیا۔

کھانے سے فراغت ہوئی تو شاکرہ نے کہا:۔

میاں اب ماشاء اللہ تم سب لائق ہوئے ماباپوں کا ساتھ سدا نہیں نبھتا۔

دنیا جہان کا دستور ہے برس دو برس ساتھ رہے پھر الگ ہو گئے۔ تمھارے بیاہ کو تو اللہ رکھے نواں برس ہے، تم ہی سوچو اب بال بچوں کے ساتھ ایک گھر میں کس طرح گذر ہو سکتا ہے۔

عابد۔ جناب ہمارے یہاں کا یہ دستور نہیں ہے۔ یہ ہی انوکھی بہو تھوڑی آئی ہیں اور بھی تو دو ہیں۔ ان کے بیاہ کو تو نو برس ہوئے اُن کے بیاہ کو پندرہ اور بیس۔ الگ گھر کرنے کی کبھی اُن کی مرضی ہوئی نہ کسی نے صلاح دی۔ وہ بھی رہتی ہیں یا نہیں۔ یا وہ انسان نہیں ہیں، اِن میں کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے جو اِن کو وہاں رہنا عذاب ہے اور اگر اِن کی یہی ہٹ ہے تو اماں سے صلاح لیں۔ نکاح کر کے تو وہ لائی ہیں جو اُنکی رائے وہ میری رائے۔

ساس۔ اُن دونوں کا کیا ہے آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ کوئی نام لیوا نہ پانی دیوا۔ نگوڑی ناٹھیاں بے اولادیاں اُنکو چاہئے ہی کیا۔ جہاں جگہ پائی چار پائی بچھائی اور پڑ رہیں مصیبت تو بچوں والی کی ہے۔ سارا جھگڑا ٹنٹا تو اللہ رکھے بچوں کے دم کا ہوتا ہے۔ بُرا نہ ماننا اپنی منجھلی بہن کو ہی دیکھ لو بھائی کالے کے بیاہ میں مہینہ بھر کے لئے پٹیالے سے آئیں اور بھاوج سے نہ بنی۔ جالے تک بھی نہ ٹھیریں مہینہ بھر کی جاتی آٹھ ہی دن میں اُکتا کر چلدیں وہ دن اور آج کا دن پھر اس اللہ کی بندی نے ادھر رُخ نہیں کیا۔ بھلا کہیں اپنے گھر کا سا آرام دوسری جگہ مل سکتا ہے۔

سائرہ۔ میں ہی کون سے ہزاروں کوس کو کہہ رہی ہوں، نیم والا مکان دیوار بیچ ہے۔ پاس کی پاس اور دور کی دور۔

عابد۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ اماں سے ذکر کروں گا۔ دیکھوں کیا جواب دیتی ہیں۔

شاکرہ۔ ایسی جلدی کیا ہے صبح کو چلے جانا۔

عابد۔ بہت اچھا۔

رات بھر میاں عابد سسرال میں رہے مگر کیا مجال کہ نام کو بھی نیند آئی ہو۔ پلک سے پلک جھپکانی حرام تھی۔ چت پڑا ہوا تھا اور آسمان پر نگاہ تھی سوچتا رہا کہ اب کیا کروں جو تدبیر کی وہ خراب۔ اور جو تجویز کی وہ اُلٹی۔ رات بھر اسی ادھیڑبن میں رہا۔ عابد کی اس رات کا کسی بدنصیب کی شب فراق سے مقابلہ ہوتا تو معلوم ہوتا کہ کس کی رات بڑھ کر رہی۔ وہاں اختر شماری تھی تو یہاں ذلت و خواری۔ وہاں دیدار جاناں محال تھا تو یہاں بیوی کی اصلاح خواب و خیال۔ مگر وہ خواہشیں مکروہ ارمان گندے۔ یہ خانہ داری کے جھگڑے اور دنیا کے دھندے۔

بہ ہزار دقت عابد نے رات تمام کی، خدا خدا کرکے یہ مصیبت کی گھڑی ٹلی۔ اور اللہ اکبر کی آواز آئی۔ چھوٹی بچی جو باپ سے بہت مانوس تھی اُٹھ بیٹھی مگر وہ بچی کو روتا اور بیوی کو سوتا چھوڑ لمبا ہوا۔ مسجد میں نماز پڑھی۔ گھر پر آکر آواز دی۔ بہن نے آکر کنڈی کھولی۔ ماں نماز پڑھ چکی تھیں کہ بیٹے نے تمام سرگذشت سُنائی۔ تھوڑی دیر تک تو چُپ سناٹے میں بیٹھی رہیں اور پھر رونکھی ہو کر کہنے لگیں۔ اچھا بیٹا اگر اُن کی یہی خوشی ہے تو بسم اللہ کرو۔ جب ان کو یہ ضد چڑھی ہے تو آج نہیں کل۔ کل نہیں پرسوں۔ ایک دن الگ ہو کر رہیں گی۔ میں کہاں تک روک سکتی ہوں۔ تم میاں بیوی رنج نہ کرو۔ میں آج ہی مکان صاف کروائے دیتی ہوں۔

ساس نے دوپہر سے پہلے پہلے مکان میں جھاڑو بہارو دلوا مٹکے رکھ پانی بھروا بہو کو خوش خبری بھیجدی۔ شام کو سائرہ ہنسی خوشی آکر اپنے الگ گھر میں رہنے سہنے لگیں۔

سائرہ کو علیحدہ رہنے سے جو اذیتیں پہنچیں اور مصیبتیں اُٹھانی پڑیں اُن کے مفصل بیان کی ضرورت ہی ہے نہ فرصت۔ مختصر یہ کہ مہینے کے اندر اندر چھٹی کا کھایا یاد آگیا۔ ماما کوئی ٹکتی نہ تھی، آپ پکانا آتا نہ تھا، ساس سے مانگ سکتی نہ تھی۔ چلے

ہوئے ٹکڑے اور اودھ کچری دال کھانی پڑی۔ وہ بھی دونوں وقت نہیں۔ ہمت کی تو پیٹ بھر لیا اور جو آلکسی کی تو فاقہ۔

سائرہ کی تقدیر میں جو مصیبت لکھی تھی وہ جھیلی۔ جیسا کیا ویسا پایا۔ کیئے کی سزا بھگتی۔ الگ ہونے کا مزہ چکھا۔ عابد کو کیا کتّے نے کاٹا تھا کہ وہ ماں کی زندگی میں گھر ہوتے ساتے روٹی سالن چھوڑ کر نمک روٹی اور باسی تباسی دال میں شریک ہوتا بیوی کی یہ کیفیت دیکھ کر ماں کے ساتھ کھانے لگا۔ اب بھی اس نے اتنی انسانیت کی۔ بیوی سے پھر کہا کہ اگر اپنے قصور پر نادم ہو جاؤ تو کچھ نہیں بگڑا۔ میں تمہاری مصالحت کرا دوں۔ مگر اس کمبخت کے سر پر ایسا جن سوار تھا کہ فاقے کیئے۔ ہاتھ پاؤں جلائے مصالحے پیسے سب ہی کچھ کیا۔ مگر میاں کا ہی کہنا نہ کیا۔

یہ درست ہے کہ اگر ساس کو بہو کی ان تکالیف کا علم ہو جاتا تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ انتظام کرتیں۔ اپنی ماما کو بھیجکر پکواتیں اپنے ہاں سے پکواکر بھیجتیں۔ کوئی نہ ہوتا تو وہ اس مزاج کی عورت تھیں کہ خود جاکر پکاتیں اور بہو کو کھلاتیں مگر سائرہ نے تو یہ بندوبست کیا تھا کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو۔

(۳۷)

مولوی صاحب کو گئے ایک حساب سے آٹھ اور ایک سے تقریباً نو برس ہو گئے۔ سائرہ کو دو دن کی دلہن چھوڑ کر گئے تھے۔ اب ماشاءاللہ اس کا پہلوٹھی کا بچہ ان گنے میں تھا۔ کوئی خط پتر خیر خبر مطلق نہ معلوم ہوئی۔ مولوی صاحب کے بڑے صاحبزادے جو کسی جگہ پیشکار تھے۔ اتفاق سے کسی انگریز کو بمبئی تک پہنچانے گئے۔ بمبئی پہنچکر خیال آیا کہ ابا کا حال جب سے گئے ہیں معلوم ہی نہیں ہوا۔ خبر نہیں۔ جیتے بھی ہیں؟ یہاں تک آیا ہوں تو لگتے ہاتھ یہ بھی پتا لگاتا چلوں۔ لوگوں سے سُنا کہ حجاج کا ایک قافلہ بیت اللہ سے واپس آیا ہے۔ سُنتے ہی پہنچے۔ ایک شخص نے مولوی صاحب کا پورا

حلیہ بیان کر کے نہایت افسوس سے کہا میں اور مولانا ایک ہی جگہ مقیم تھے۔ میں بھی چوتھے برس وطن جارہا ہوں اُن کا ارادہ بھی اس سال واپسی کا تھا۔ ہشتم ذی الحجہ تک خاصے اچھے رہے۔ رات کو قافلہ کے ساتھ سفر کیا۔ عرفات پہنچکر بخار چڑھا۔ دو گھنٹہ میں رخصت ہوئے۔

اوّل تو حاجی اس پر دیکھنے میں مرد معقول۔ ساٹھ ستر برس کی عمر، سفید ڈاڑھی نورانی چہرہ، کوئی وجہ نہ تھی کہ اُن کے کہنے کا یقین نہ آتا۔ جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں، بہکانے کا کوئی سبب نہیں، اہل قافلہ میں سے ایک اور شخص نے اس بیان کی تائید کی۔ یقین حق الیقین ہوگیا۔ منجھلے بھائی کو جو ضلعدار تھا فوراً تار دیدیا اور ایک خط گھر لکھدیا۔ بھائی اتفاق سے رخصت پر تھا تار اور خط دونوں ساتھ پہنچے۔ تار کا نام سُنتے ہی عورتیں بدحواس ہوگئیں۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مولوی صاحب کی طرف کسی کا دھیان بھی نہ تھا۔ کیا مبارک خاندان تھا۔ جب تک تار پڑھا جائے بچّے سے لیکر بڈھے تک سب کی زبان پر الٰہی خیر تھا۔

لڑکے نے تار پڑھ کر ضبط کی کوشش کی مگر کچھ ایسا جوش آیا کہ ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگا۔ غرض سب کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ گھنٹہ ہی بھر کے اندر اندر تمام شہر میں مشہور ہوگیا۔ مولوی صاحب کے محامد اخلاق علمیت فضیلت، خدا پرستی، دینداری کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ شہر بھر کا مجمع ہوگیا۔

گھر میں عورتوں کی یہ حالت تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ عابد کی والدہ ماجدہ گم سم بہوؤں کی آنکھ سے زار قطار آنسو مگر کیا مجال جو ایک لفظ ناشکری کا زبان سے نکل گیا ہو۔ بیٹا ایک طرف پتھر بنا بیٹھا تھا۔ بیٹی دوسری طرف سر منہ اوندھائے لیٹی تھی۔ دو تین روز تک یہی کیفیت رہی آخر رفتہ رفتہ سب کو صبر آگیا۔

مولوی صاحب کی موت کا اثر ہوا تو کیوں نہیں مگر پھر بھی کم ہوا۔ اوّل تو

اُن کی واپسی کی امید ہی کم تھی۔ دوسرے آٹھ نو برس کی مفارقت نے یوں بھی طبیعتوں کو عادی کر دیا تھا۔ بڑا لڑکا جو پانچ برس سے پردیس میں تھا اس موقع پر تین مہینے کی چھٹی لیکر گھر آیا۔ منجھلا پہلے ہی سے موجود تھا۔ موت کا اثر دسویں تک تو کچھ رہا بھی اور پھر خاصی گھما گھمی ہو گئی۔

اس معاملہ میں سائرہ کی حالت بہت ہی قابل افسوس رہی۔ بہو ہو کر غیروں سے بھی بدتر نکلی۔ برائے نام آئی دو چار منٹ بیٹھی اور چلی گئی۔ آنکھ میں آنسو کے بدلے میل نہیں، چہرے پر افسردگی نہیں، نہ ہرا بر ملال نہیں۔ رتی بھر خیال نہیں، سسر کا غم نہ میاں کا خوف، ساس کی شرم نہ دنیا کا لحاظ۔ کھلکھلاتی ہوئی آتی اور ہنستی ہوئی چلی جاتی۔

عابد سیدھا تھا یا سادہ۔ کچھ ہی تھا اتنی عقل رکھتا تھا کہ ان معاملات کو سمجھتا اور ان تعلقات کو پہچانتا۔ بیوی کو دیکھ دیکھ کر آنکھوں میں خون اترتا جسم میں شعلے اٹھتے مگر کچھ کہہ سکتا تھا نہ کر سکتا تھا۔

(۴۸)

عابد جیسے مزاج کے آدمی کو سائرہ نے یہاں تک لا ڈالا کہ دن رات میں سینکڑوں مرتبہ غصہ آتا بیسیوں مرتبہ لڑائی ہوتی مگر پھر بھی چونکہ اس کا مسلک صلح کل تھا اور بردباری اس کی طبیعت میں ودیعت تھی اس حالت میں بھی وہ حتی الوسع اس بات کی کوشش کرتا رہتا کہ کوئی جھگڑا نہ ہو۔

عابد بدنصیب ان آفات سے یہاں تک پہلو بچاتا تھا کہ کبھی کسی معاملے میں تعرض ہی نہ کرتا۔ جو اس کی سمجھ میں آتا وہ کرتی۔ مگر آٹھوں پہر کی کل کل، ہر وقت کی پٹ پٹ خواہ مخواہ کے جھگڑے بے فائدہ کی شرارتیں آخر کہاں تک درگذر کرتا۔ مرد تھا، خاوند تھا مفلس نہ تھا، دست نگر نہ تھا، وہ اس کا کیا بندو بست کرتا اور

کیونکر مان لیتا کہ نماز گھر میں پڑھا کرو مجھ کو اکیلے ڈر لگتا ہے۔ دروازے پر کوئی آواز دے ڈیوڑھی سے باہر نہ جایا کرو۔ ماں بہنوں کے پاس جاؤ تو مجھ سے کہکر۔ بھائی بھاوجوں کے پاس جاؤ تو مجھ سے پوچھ کر۔

عابد جیسا متحمل مزاج آدمی ہونا مشکل ہے ایک عرصہ تک اس کی بھی تھوڑی بہت برداشت بلکہ تعمیل کرتا رہا۔ عشا کی نماز گھر میں پڑھنے لگا۔ ڈیوڑھی میں تو لوگوں سے بات نہ کی مگر گلی سے باہر بھی نہ نکلا۔ بڑے گھر میں پوچھکر نہیں تو بے کہے بھی نہیں گیا۔ جب سب طرف سے تھک گیا اور ہر طرف سے نا امیدی ہوگئی طرح دیتے دیتے ہار گیا اور درگذر کرتے کرتے تنگ آگیا تو اس کو یقین ہوا کہ چاہے یہ مکان اپنی جگہ سے سرک جائے مگر بیوی اپنی عادت سے باز آنے والی نہیں۔ مجبور بات چیت میں کمی کی، اس سے بھی کام نہ نکلا تو آمد و رفت۔ یہ بھی بے سود رہا تو رات کو بھی ماں ہی کے ہاں سونے کا ارادہ کر لیا۔

ساس ہو تو ایسی ہو۔ رات کو عابد سو رہا۔ اُن کو اس وقت خبر بھی نہ ہوئی۔ صبح کو اُٹھیں تو عابد کو دیکھ کر سینکڑوں ہی باتیں سُنائی ہونگی۔ اس قدر لعنت ملامت کی کہ پھر کبھی عابد کی ہمت نہ ہوئی کہ بیوی کو اکیلا چھوڑ یہاں آکر سونے کا ارادہ کرتا لیکن اب عابد کے تعلقات بیوی کے ساتھ برائے نام تھے۔ تین تین چار چار دن بات کرنے کی نوبت نہ آتی۔ دس بجے رات کے آیا۔ اپنے ہاتھ سے بچھونا کیا اور پڑ کر سو رہا۔ صبح مُنہ اندھیرے اٹھا اور چلدیا۔ میاں کا یہ رنگ دیکھ کر سائرہ نے بہت ہاتھ پاؤں پیٹے۔ مگر عابد کا طرز عمل بہت ٹھیک تھا کہ ایک چپ سو کو ہراتی ہے۔ ایک کہی نہ دو۔ رات ہوئی تو پڑ کر سو رہا۔ صبح ہوئی تو اُٹھ کر چل دیا۔ ساس کا جو اول دن سے معمول تھا آج تک اس میں کمی نہ کی۔ عصر کی نماز پڑھکر ایک پھیرا کر جانا۔ تھوڑی دیر بیٹھنا اور چلا جانا۔ پہلی کو آنا

اور پینتیس روپے ہاتھ میں دے جانا۔ بیس تنخواہ کے پندرہ اپنے پاس سے۔)

میاں کو اُکھڑا ہوا دیکھ کر اور اس درجہ متنفر پاکر سائرہ نے ایک کوشش یہ بھی کی کہ سسرال کو بالکل ہی آگ لگاؤں اور میکا آباد کروں۔ لیکن شاکرہ اگرچہ اور دو ایک موقعوں پر کسر کر گئی مگر اس معاملے میں سائرہ کو پُھٹکے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیا۔

اب ایک سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ بڑا لڑکا ماشاء اللہ نویں میں تھا مگر سوا کھیلنے کے اس کو اور کام نہ تھا۔ دن نکلے جاتے تھے اور تعلیم کا انتظام خاک نہ ہوتا تھا۔ عابد کبھی زبردستی لے بیٹھتا مگر مار وہ نہیں سکتا تھا، گھرک وہ نہیں سکتا تھا۔ ذرا سخت آواز سے بولا اور سائرہ بچے کو پکڑ کر لے گئی۔ عابد کہتا تھا لڑکا عالم فاضل نہ ہو تو جاہل بھی نہ رہے۔ سائرہ کہتی تھی ہمارے ہاں بچوں کو ماریں پیٹیں۔ نہ ہم بیٹے کی قدر جانیں۔ نصیب میں ہوگا تو آپ ہی آجائیگا۔ بڑے گھر میں تھے تو مارے باندھے عم کا سیپارہ ختم ہو چکا تھا۔ اب سائرہ نے باپ کے پاس آنے کی قطعی ممانعت کر دی۔ جو کچھ پڑھا تھا سب چوپٹ ہوگیا۔ صبح سے شام تک یا کنکوّے یا گلی ڈنڈا۔ کبھی ڈور لوٹ رہے ہیں کبھی گلی برج ہو رہا ہے کہیں گالیاں کھائیں۔ کہیں گھرکیاں سنیں۔ کہیں پٹے۔ اگر موقع واردات قریب ہوا اور بچے کے رونے کی آواز کان میں آگئی۔ سائرہ ننگے پاؤں اور ننگے سر گلی ڈنڈا ہوا تو دروازے پر، پتنگ بازی ہوئی تو کوٹھے پر جا پہنچیں۔ دو چار کو سنے دیئے مگر کس کو؟ اپنے بچے کو نہیں اوروں کے اور بچے کو لے آئیں۔

بساطیوں کی آپس میں صید تھی جو دہ دن سے ہاتھ لگا ہوا تھا۔ کچھ نہیں تو سو روپے روز کی بربادی کا اوسط فریقین کا ہوگا۔ لڑانے والے دونو طرف کھینچ کے تھے مگر ایک پیچ اتفاق سے ڈھیل کا ہو گیا۔ کچھ ایسی گرہ پڑی کہ پچکے کے پچکے

اور ٹھاریوں کی ٹھاریاں دونوں طرف خالی ہوگئیں اور پیچ ادھر ہوا نہ اُدھر ہوا تھی کم۔ دونوں اُدھوں نے پیٹا چھوڑ دیا۔ سائرہ کا لڑکا جس دن سے پتنگ بازی شروع ہوئی تھی روٹی بھی کوٹھے پر کھاتا تھا۔ پیچوں کے [illegible] کا اس طرح انتظار کرتا تھا جس طرح مُردوں کا گد۔ ڈور کا نیچے ہونا تھا کہ پیٹھ [illegible] لانگ [illegible] ال دونوں گڈیاں توڑ لیں۔ انٹی کر رہا تھا کہ ایک بیس پچیس آدمی [illegible] کا کھٹ کا غل مچاتا ہوا دروازے پر آپہنچا اور ریگیدنا شروع کیا۔ عابد باہر نکلے پیشکار بھی نکلے۔ ضلعدار بھی نکلے۔ منجھلا تھا آدمی سمجھدار۔ آہستگی سے گفتگو [illegible] لگا مگر بڑے صاحب پیشکاری کی ہوا میں چڑھے ہوئے تھے ذرا ڈانٹ کر بولے [illegible] اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ٹینٹوا پکڑ لیا۔ کجا وہ بیس بلکہ پچیس [illegible] ایک بدمعاش اور ایک سے ایک نہنگ۔ کجا یہ را نے گنے تین آ[illegible] و [illegible] ڈھیلے مالش۔ خیریت یہ ہوئی کہ غل غپاڑہ سُنکر محلے والے نکل آئے اور بیچ بچاؤ [illegible] ورنہ سب عزت آبرو رخصت ہو جاتی۔ اور جو بیچ پوچھو تو ہو ہی گئی۔

بھیڑ چھٹ گئی تو ایک مرد بزرگ جو عمر میں مولوی صاحب مرحوم سے بھی دو چار برس بڑے ہونگے بڑے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھک میں لے گئے اور ٹھوڑی میں ہاتھ دیکر نہایت [illegible] سے فرمانے لگے۔ برخوردار اس قدر سمجھدار آدمی ہو کر ایسی چھچھوری باتیں۔ آج کو پیشکار ہوئے کل کو خدا کرے تحصیلدار اور ڈپٹی ہو مگر میاں اس احاطہ کے اندر تو تم [illegible] ادھی بلکہ نرے نا اہدہی ہو۔ پیشکاری کیا اگر لاٹھ صاحبی کی حیثیت سے بھی آ[illegible] گے تو [illegible] تم سے ڈرنے والے نہیں۔ حکومت تو باہر ہی خوب سجتی ہے شہر [illegible] کر حکومت کرنی مفت کی ذلت اُٹھانی ہے۔ تم ہی سوچو جن لوگوں نے [illegible] تمہارے ساتھ پڑھا برسوں تمہارے ساتھ کھیلے دنوں اور راتوں تمہارے [illegible] جلیس رہے آج تم اُن کو حقارت کی نظر سے دیکھو تو کس قدر ناگوار ہونے کی

بات ہے۔ اور پھر قصور تو سراسر تمہارا۔ بھتیجے کو سمجھانے سے رہے۔ اُلٹے اُنہی کو
بُرا بھلا کہنے کھڑے ہو گئے۔ تم کو کتنا ہی عروج کیوں نہ ہو اور یہ کیسے ہی مفلس و محتاج
کیوں نہ ہوں۔ انکی عزت کرنی تمہاری کسرشان نہیں ہے۔ میری عمر بھی پردیس میں
گذری ہے۔ بخدائے لایزال یقین کرکے ماننا جب کسی شخص سے سُنتا تھا کہ دہلی کا
رہنے والا ہے چاہے جان پہچان ہو یا نہ ہو جان میں جان آتی تھی تعجب ہے کہ کس طرح
تم نے ایک غریب ہمسائے پر ہاتھ اُٹھایا۔ مولوی صاحب مرحوم محلے والوں پر جان چھڑکتے
تھے۔ تم نے جن کو کم استطاعت اور رذ[illegible] سمجھا۔ خود اُنکے گھروں پر جاتے تھے ذرا
کوئی بیمار ہوتا تھا تو گھنٹوں جاکر بیٹھتے۔ میاں [illegible] نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے
یہ ہی تمہاری آسیہ پسنہاری کا لڑکا بھاگا ہوا آ[illegible] اور وہ مسجد سے نکل رہے تھے۔
لڑکے کا پاؤں پھسلا ایک ٹوٹی سی بوتل میں تیل [illegible] تمام اوندھ گیا۔ تمہارے
والد مرحوم اس بچے کو گود میں لیجاکر تیل لائے او[illegible] دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام
محلہ اور شہر کیا امیر اور کیا غریب کیا بچہ اور کیا بڈھا کیا ع[illegible] اور کیا مرد اُن کو روتا ہے
انکے سامنے یہ محلہ گلزار بنا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تو خیر [illegible] م کو جس وقت باہر
تشریف لاتے تھے عجیب عالم ہوتا تھا۔ یہی بساطی اور بٹیے اُ[illegible] رہوتے اور یہی
تارکش اور ملّاے اُنکے مشیر کیا ضابطہ کی پابندی تھی کہ عصر [illegible] کو پہنچ جانا
اور دن بھر کی روئداد سُنادینی۔ ذرا کسی کی تکلیف سنتے تھے تو بیچین ہو [illegible] تے تھے۔ جان سے
مال سے کبھی دریغ ہی نہ کیا۔ آدھی ہو یا پچھلا۔ جس کسی نے جاکر آواز دی عصا ہاتھ
میں لیا اور ساتھ ہو لئے۔ اُن کا رعب بھی اس قدر غالب تھا کہ اچھے اچھے جوانوں
کی اُن کو دیکھ کر روح فنا ہوتی تھی۔ کس کی مجال تھی جو ایک دوسرے پر ظلم کر سکے۔
ذرا بیواؤں اور یتیموں سے جاکر پوچھو۔ رواں رواں دعا دیتا ہوگا۔ شہر میں یہ کچھ کال
پڑے چوریاں ہوئیں۔ ڈاکے پڑے۔ تم نے بھی کبھی سُنا کہ تمہارے محلے سے

چور پکڑا گیا یا تنکا ادھر سے اُدھر ہوا۔ یہ اُن ہی کے دم کی برکت تھی کہ ہر قسم کا اطمینان تھا رات کو سونا اچھالتے چلے جاؤ اور کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے اُن کے سامنے کبھی کسی کو عدالت تک جانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اُن کا مُنہ موڑنا تھا کہ محلے کی خاک سی اُڑ گئی۔ سب ایک ایک کر کے رخصت ہوئے وہ صورتیں خاک میں چھپ گئیں۔ ایک میں بدنصیب اُنکے رونے کو باقی رہ گیا اب جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں رنگ ہی اور چھایا ہوا ہے۔

یاروں میں یاری نہیں، عزیزوں میں محبت نہیں، دوستوں میں مروت نہیں۔ ایک دوسرے کی جان کا دشمن، خون کا پیاسا، عزت کا لاگو، وہی محلہ اب ہو کہ سب اپنے مطلب کے آشنا، غرض کے بھوکے، ماں فاقے سے پڑی ہو بیٹا ڈٹ ڈٹ کر کھا رہا ہے ایک اللہ کے بندے مولوی صاحب تھے کہ چھمن بتھنی تک کے گھر کی خبر رکھتے تھے کہ کیا پکا اور کیا کھایا۔ اب اس محلے کو دیکھ کر کلیجے پر سانپ لوٹتا ہے۔ کچھ ایسی ہوا چلی کہ اُن میں کا ایک بھی نہ رہا۔ اور کیوں جاؤ اپنی مسجد ہی کو دیکھ لو۔ مغرب کے وقت تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی اب ایک بیچارے امام الدین رہ گئے ہیں۔ آپ ہی مؤذن آپ ہی مکبر، آپ ہی امام۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا آ گیا تو آ گیا نہیں تو آپ ہی اذان کہی آپ ہی نماز پڑھ لی۔ اب آٹھ برس کے لڑکے کو بھی دیکھتا ہوں تو بغیر بوٹ کے زمین پر پاؤں نہیں دھرتا۔ دو حرف پڑھ لئے مُنہ میں چرٹ دبایا پائجامہ میں جیبیں لگوائیں اور صاحب بہادر ہو گئے۔ تم ہی بتاؤ تم کو بھی آئے ہوئے بیس پچیس دن ہو گئے تم نے کسی بھلے مانس کا پاجامہ بھی ٹخنوں سے اونچا دیکھا۔ میریاں ماشاءاللہ ایسی کہ ایک چھوڑ چار ٹانگیں ڈال لو، موزے چاہے چلکٹ ہی ہوں مگر ہوں ضرور، ٹوپی میں پھندنا لگی ہو، آستینوں پر بٹن بھی ہوں، گلے میں کالر بھی ہو۔ گھر میں فاقہ ہو تو بلا سے مگر باہر کی ٹیپ ٹاپ میں فرق نہ آوے۔ صاحبزادو۔ میں نے تمہارا بہت مغز چاٹا بُرا معلوم ہو تو معاف کرنا۔ (تینوں بھائی موجود تھے)

بڑے میاں کی تقریر کچھ ایسی مؤثر تھی کہ تینوں کے آنسو نکل پڑے۔ عابد کو ادھر تو بیٹے کی نالائقی کا خیال اُدھر بھائی کی بے عزتی کا ملال سب سے زیادہ بڑے میاں کی وعظ کی تاثیر۔ جب دونوں بھائی گھر میں چلے گئے تو وہ اپنے ہاں آیا۔ بیٹا زمین میں لوٹ رہا تھا اور ماں سے کہہ رہا تھا بے ایمانی ہائے میرا ڈور کا گولہ دے۔" عابد کا ارادہ لڑکے کو مارنے کا ہ[illegible] تھا مگر [illegible] کا ضرور تھا۔ گود میں اٹھا کر اندر لایا اور رسی سے دونو ہاتھ باندھ کر کہنے لگ[illegible] سمجھا [illegible] میں لٹکاؤں۔ یہ کہکر لے چلا۔ دروازے تک پہنچا تھا کہ سائرہ چیختی چلا[illegible] آئی اور عابد کی کمر سے لپٹ گئی۔ ہر چند اس نے آنکھ سے سمجھایا اشارے سے منع [illegible] کی سُننے والی تھی وہ چیخم دھاڑ مچائی کہ ساس جیٹھ اور جیٹھانیاں گھبرا کر آ[illegible]۔ عابد [illegible] کو چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ دونو جیٹھ ہنسنے لگے۔ ساس خاموش ہو گئیں [illegible] بھی نے اتنا کہہ ہی دیا۔ واہ بوا۔ اچھے فیل مچانے آتے ہیں۔ ہم نے جانا خبر نہیں [illegible] آفت [illegible]۔

سائرہ۔ آفت پڑے میرے دشمنوں پر مجھ [illegible] اتنا لگی اتنا کچھ ہو گیا تمھارے نزدیک کچھ ہوا ہی نہیں۔ بچے کو جان سے مار ڈالے۔ تو [illegible] کچھ ہوا منجھلی کچھ جواب دینا چاہتی تھی مگر ساس سمجھا کر اپنے ساتھ لے گ[illegible]

ماما کی وہ لڑکی جس کی سائرہ امین تھی۔ اب خا[illegible] ساس کی دور اندیشی دیکھو صرف اس خیال سے کہ لڑکا بھی جوان ہے۔ [illegible] لڑکی کا رکھنا ٹھیک نہیں۔ اسکی نسبت ٹھہرا دی اور سائرہ کی اس عقل کے [illegible] یہ آئی کہ مجھکو تکلیف دینے کی غرض سے اس کو علیحدہ کرتی ہیں۔ کو[illegible] بہت کی مگر چلی ایک بھی نہیں۔ ساس نے تاریخ مقرر کر نکاح کر دیا۔ بڑھیا یہ تو [illegible] ساس نے بھی کہہ گئی تھی کہ چھوٹی دلہن کے پاس میرے روپے جمع ہیں۔ لڑکی کے وقت پر [illegible] آئینگے۔ مگر یہ نہ بتا گئی تھی کہ کتنے ہیں۔ اب ضرورت ہوئی تو بہو سے استفسار کی[illegible]

ناہنجار سائرہ صاف انکار کر گئی۔ بہو کے مکرنے سے ساس کو افسوس تو بہت ہوا مگر یہ سمجھ کر بات کو دبا دیا کہ اگر اس کی بدنامی ہوئی تو کس کی، وہ بھی تو میری ہی ہوئی۔

بیوی کے ہاتھوں عابد کا دم یہانتک ناک میں آیا تھا کہ وہ بسا اوقات اپنی زندگی سے موت کو غنیمت سمجھتا تھا مگر خدا کا فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں اگر شریعت اس کے مزاج میں اس قدر گھسی ہوئی نہ ہوتی تو خدا جانے وہ اب تک کے دفعہ خودکشی کا ارادہ کر چکا ہوتا۔ سائرہ کی صورت سے اس کو یہاں تک نفرت ہوگئی تھی کہ دیکھنے تک کا روادار نہ تھا۔ جو کہہ سکتا تھا وہ کہہ لیا، جو کر سکتا تھا وہ کر لیا۔ لڑ کر دیکھا اکڑ کر دیکھا مل کر دیکھا بگڑ کر دیکھا مگر کتے کی دم جب دیکھی ٹیڑھی۔ بیوی کے ساتھ تو خیر جیسی گذرنی تھی گذری۔ اب پورا اندیشہ اولاد کا تھا۔ لڑکے کو دیکھتا تھا تو بے ادب، لڑکی کو دیکھتا تھا تو بدتمیز۔ غرض چاروں پانچوں ایسے بے تربیت اٹھے کہ دعا نہ سلام۔ بات کرینگے تو جیسے پتھر کھینچ مارا۔ کام کرینگے تو گویا بیگار ٹالدی۔ لڑکا ہے کہ عادات قبیحہ میں لتھڑا۔ جوان ہوتا چلا آرہا ہے۔ لڑکی ہے کہ نالائقوں کا پہاڑ اٹھا چلا جارہا ہے۔ غرض کیا بڑا اور کیا چھوٹا، کیا لڑکا اور کیا لڑکی سب ایسے ناہموار اٹھے کہ استغفراللہ چار برس کی لڑکی، اماں نہ کہتی باپ نہ کہتی یا وانہ کہتی مگر وہ تو خاصی اچھی طرح پکار پکار کر عابد کہتی تھی۔ وہ اتنی سی فتنی بھی گود میں آتی تھی تو ڈاڑھی کھسوٹتی ہوئی۔

(۳۹)

منجھلے کی چھٹی ختم ہونے آئی تو اپنے افسر یا کسی دوست کے واسطے ایک درجن چار کی پیالیاں اور چھ طشتریاں لا کر بیوی کو دیں کہ احتیاط سے رکھدو۔ بیوی نے اٹھا کر الماری میں رکھدیں۔ بھتیجا کھیلتا ہوا چچی کے کمرے میں جا پہنچا۔ گلی کا ڈنڈا ہر وقت ہاتھ میں رہتا تھا (رات کو ساتھ لیکر سوتا صبح کو ہاتھ میں لیکر اٹھتا) دیواروں پر پٹخارتا ہوا الماری کے پاس پہنچا۔ چچی اتفاق سے موجود نہ تھی۔ ایک ڈنڈا جو رسید کیا تو

پانچ پیالیاں چھن سے نیچے آ پڑیں۔ منجھلی بیچاری گھبرا کر کمرے میں آئی۔ دیکھا تو بھتیجے صاحب ٹکڑے سمیٹ سمیٹ کر کرتے میں رکھ رہے ہیں۔ ایک دھموکا اس زور سے دیا کہ لڑکتا ہوا آگے جا پڑا۔ پیالی کا ٹکڑا کنپٹی میں چبھ گیا۔ ذرا سا خون نکل آیا۔ بچہ روتا چیختا ہائے مار ڈالا کہتا ہوا [illegible] پاس پہنچا۔

باپ کی تو اتنی مجال [illegible] اولاد کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے۔ چچی بیچاری تو کس گنتی میں تھیں۔ بچے کا ہاتھ [illegible] ہوئے دروازے ہی میں سے ہنکارتی ہوئی آئی اور جٹھانی کے آگے لا کر [illegible] یا کہا [illegible] تم اس کو جان سے مار ڈالو کہ ٹھنڈک پڑ جائے۔ ابھی تو میں جیتی بیٹھی ہوں [illegible] بے دا [illegible] تھوڑی ہے جس نے چاہا کچومر کر دیا میں تمھارے نام پر جوتی بھی نہیں مارتی۔ تم [illegible] میرے بچے کو ہاتھ لگانے والی کون۔ قربان کی تھیں ایسی دادی چچیاں [illegible] بچے کو لہولہان کر دیا اور سب بیٹھے دیکھتے رہے۔

منجھلی۔ بیوی ذرا زبان سنبھال کر بات [illegible] یہاں [illegible] ہمارا کوئی دبیل نہیں ہے اغماض اٹھائینگی تو ساس اُٹھاوینگی یا میاں، دوسرے کی جوتی [illegible] بھی غرض نہیں کہ تمھاری باتیں سُنے۔ میں تم سے بات نہیں کرتی۔ تم کو خدا [illegible] اس لائق [illegible] نہیں کیا کہ کوئی تمھارے مُنہ لگے۔ اندر آ کر پھوٹی آنکھوں سے دیکھ لو کے [illegible] کیا آفت [illegible] ہے۔

سائرہ۔ کیا آفت ڈھائی ہے کسی کو جان سے مار ڈالا۔ تم ہی کلموئیوں کے کارن میں نے اس گھر کو آگ لگائی۔ پھر بھی صبر نہ آیا۔ ذرا سی دیر کو بچہ آ [illegible] بیٹھتا پڑ جاتا ہے۔ مفت کا بچہ تھا نہ کہ مار لیا۔

منجھلی۔ کلموئیوں کے سر پر سینگ تھوڑی ہوتے ہیں۔ [illegible] اپنے گھر میں بیٹھے ہیں جس کا مُنہ تمام جہان میں کالا ہو رہا ہے۔ وہی کلموئی [illegible] گھنڈلے میں پڑی۔ بُرا کرے کوئی جا کر تھوکتا بھی نہیں۔ دیکھو یہ پیالیاں [illegible]

لگانا بھی تو نصیب نہیں ہوا۔ اکھٹی پانچ پیالیاں ٹکڑے کر دیں۔ اسکو تو مارنے سے رہیں اور الٹی حمایت لینے کو آگئیں۔

سائرہ۔ بچوں کا کام ہی یہ ہے۔ تم نامراد بچوں کی قدر کیا جانو۔

منجھلی۔ نامراد ہو گی تم تمھاری [illegible] ہاں تک طرح دیئے جاتی ہوں دماغ ہی پر چڑھی جاتی ہو، ایسے ظلمی [illegible] کو نصیب کرے۔ میرے ہاں ہوں تو گلا گھونٹ دوں یا زہر دید [illegible]

سائرہ۔ گلا گھونٹوا اپنا [illegible] زہر دو اپنے پیاروں کو اپنے چہیتوں کو اپنے بھائی کو، بھتیجا بھتیجی کو۔ بھانجا بھانجی کو۔ میرے بچوں کو کہو تو خاک میں نہ ملا دوں آگ لگا دوں تم کہتی کے منہ کو۔

منجھلی۔ آگ لگاؤ اپنے منہ کو، اپنے اماں باوا کو، بہن بھائیوں کو۔

دیورانی جیٹھانی [illegible] لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی جاتی تھی اور ساس غریب بدنصیب کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ تمام ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑے تھے۔ کبھی منجھلی کو آ کر سمجھاتی تھیں کبھی چھوٹی کو۔ بھوٹی کا کچھ اور بس نہ چلا تو دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹ لیا، اتنے میں بڑا لڑکا اندر آیا دیکھا تو کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے۔ منجھلی تو جیٹھ کی صورت دیکھتے ہی دوپٹہ اوڑھ سر ڈھانک قرینے سے بیٹھ گئی مگر چھوٹی جیٹھ کو دیکھ کر اور زیادہ رنگ لائی وہ بے چارا چبوترے پر آ کر متحیر کھڑا ہو گیا۔ ماں کو دیکھا تو چہرہ سفید پڑا ہے۔ بھاوجوں کو دیکھا تو ایک سر پیٹ رہی ہے ایک کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ بھتیجا زمین میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے بھتیجی اماں اماں چیخ رہی ہے۔ بیچ کے در میں بہن ساکت کھڑی ہے۔ باورچی خانہ [illegible] بیوی گم سم بیٹھی ہیں بہ ہزار دقت اور خرابی سائرہ کو سمجھا بجھا کر پانی پلایا اور وہاں سے اٹھا کر دالان میں لائے۔

(۴۰)

سائرہ جس وقت علیحدہ ہوئی ہے ساس اور میاں نے ہر چند منع کیا کہ صرف ضرورت کی دو چار چیزیں ساتھ لے جاؤ۔ باقی یہیں رہنے دو یہ بھی نہیں کہ چھدا اُتارنے کو معمولی طور پر کہدیا ہو۔ بلکہ نشیب و فراز دکھا کر اور اونچ نیچ سمجھا کر۔ مگر اس اللہ کی بندی نے خاک نہ سُنا زیور کا صندوقچہ، جہیز کے کپڑے، تانبے کے برتن، غرض جھاڑو کا تنکا تک جو اس کے نام کا تھا یا ہو سکتا تھا ساتھ لے گئی۔

دنیا میں سب ہی قسم کے لوگ ہوتے اور محلے میں ہر وضع کے آدمی رہتے ہیں۔ برابر میں ایک درزی کا گھر تھا اس کا لڑکا آوارہ عیاش بدمعاش شراب کا لتیا جوے کا دھتیا غرض مجسم نالائق تھا۔ بی سائرہ کو تو اپنے جوش میں کچھ ہوش رہا نہیں دروازہ چوپٹ کھول لڑنے چلی گئیں۔ درزی کا لڑکا خدا جانے کب سے تاک میں تھا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ اپنی دیوار سے چھت پر کود زینے سے نیچے اُتر آیا۔ زیور کا صندوقچہ عقل کی دشمن نے سامنے ہی کی الماری میں اوپر کے تختے پر رکھ چھوڑا تھا۔ بغل میں دبا سیدھا ہو لیا۔

تقدیر کا لکھا ہر طرح آگے آتا ہے۔ چوری سے چار دن پہلے ماموں کے ہاں بسم اللہ میں جانے لگی۔ گہنا نکال کر دیکھا تو گلوبند کا ڈورا بالکل ٹوٹا ہوا۔ منجھلی کا گلوبند منگوا کر پہن گئی۔ واپس آئی تو اپنے گہنے کے ساتھ صندوقچے میں رکھدیا وہ بھی گیا۔ چوری کا حال تین دن تک تو معلوم بھی نہ ہوا۔ چوتھے دن جاکر وہ بھی جب منجھلی نے اپنا گلوبند منگوایا ہے تو دینے اُٹھی دیکھا تو صندوقچہ ندارد۔ سارا گھر تلپٹ کر ڈالا۔ صندوقچہ ہو تو ملے۔ رونے پیٹنے لگی۔ ساس نند دیورانیاں جٹھانیاں دیور جیٹھ سب ہی نے مل کر سب ہی کچھ کیا مگر خاک پتہ نہ ملا۔ سب صبر کرکے بیٹھ گئے۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ کسی کو یقین آیا کسی کو نہ آیا۔ کوئی چوری سمجھا کوئی مکاری؟

منجھلی کچھ بولنا چاہتی تھی مگر ساس نے تیور دیکھتے ہی کہدیا بیٹی تمھاری بلا سے گیا تو میرا گیا ان کا بھی جسطرح ہوگا بنواؤں گی تم اپنے گلوبند کا فکر نہ کرو میرا رکھا ہوا ہے ابھی چل کر دیدیتی ہوں۔ چھوٹی دُلہن بیٹی جو ہونا تھا وہ ہوگیا تم اپنا دل نہ کُڑھاؤ۔ اسی دن کے لئے تم کو منع کیا تھا رہتا تو تمھارے ہی کام آتا تین لڑکیوں کا ساتھ ہے کیا کروگی کہاں سے لاؤگی۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہارا ہی ہے تم کو ننگا بٹھا کر میں پہنتی اوڑھتی کیا اچھی لگونگی۔ بچوں کے وقت پر تو میں کہاں ہونگی پریشان ہوگی تو تم ہوگی۔

آدمی کتنا ہی اینٹھے کتنا ہی اکڑے مگر انقلاب زمانہ وہ بُری بلا ہے کہ اچھے اچھے جوانمرد پہلوان بادشاہ اور وزیر امیر کبیر شہ زور اور کمزور حکیم اور فیلسوف عقلمند اور بیوقوف طاقتور اور بودے چشم زدن میں اسکی بدولت رنج کے تودے بنگئے۔ سائرہ کی تو ہستی ہی کیا تھی۔ بیفکری کا زمانہ ختم ہوا۔ بچپن تو سبحان اللہ بہت ہی اچھا گزرا۔ جوانی بھی خیر لشتم پشتم گذر گئی۔ مگر جب جوانی کا روز روشن ڈھلنا شروع ہوا تو رنج والم کی شام نظر آنے لگی۔ فارغ البالی وغیرہ جو کچھ تھی مولوی صاحب ہی کے دم تک تھی۔ انتقال کی خبر کا مشہور ہونا تھا کہ تنخواہوں میں ڈھیل ڈھال شروع ہوگئی۔ یا تو ادھر انتیسویں دن اُدھر تین تین چار چار دن پہلے آدمی آیا اور دروازے پر دے گیا۔ یا اب مہینے کے دوسرے مہینے اور تیسرے مہینے ششماہی کا سال اور ڈیڑھ سال۔ کچھ دن یوں بھی گذرے پھر یہ بھی نہ رہا۔ سب سے پہلے سخاوت پور کی تنخواہ بند ہوئی جو سائرہ کے نام کی تھی۔ ساس جو کچھ دیتی تھیں وہ بدستور دیتی رہیں مگر کجا پینتیس اور کجا پندرہ بہت ہی تنگی سے گذر ہونے لگی۔

قیاس چاہتا ہے اور واقعات مقتضی ہیں کہ سائرہ پر ان تغیرات کا زیادہ اثر نہ ہو مگر نہیں یہاں آکر قیاس غلط ہوگیا اور واقعات مخالفت کرنے لگے۔ زیور کا اثر باوجودیکہ ساس نے اس قدر تسکین کردی بہت زیادہ ہوا۔ یہ صدمہ اس کے دل پر

ایسا بیٹھا کہ دن کی بھوک اور رات کی نیند بالکل غارت ہوگئی۔ ہر وقت اسی میں محو رہتی۔ دو چار سو کا بھی نہیں ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کا زیور سوچتی تھی اور سمجھتی تھی کہ ہزار روپے کا زیور اگر سو دفعہ مرکر جیؤنگی تو میسر نہ ہوگا۔ زیور کے صدمے سے ابھی پنپنے نہ پائی تھی کہ موقوفی تنخواہ سے سامنا ہوا۔ یا تو وہ بے غل وغش خرچ کہ ایک کی جگہ دو اور دو کی جگہ چار (تنخواہ کا تو اصل میں نام تھا پینتس کے پچاس پڑتے تھے) یا اب پندرہ ہی رہ گئے وہ بھی اس ساس کی جوتیوں کا صدقہ جس کو عمر بھر جوتیاں ماریں۔

کیا انقلاب ہے وہی سائرہ جو مغرب کے وقت سے پڑکر ڈھیر ہو جاتی تھی۔ اب گھنٹوں لیٹی کچھ نہ کچھ سوچتی رہتی مگر جس طرف نظر ڈالتی اور جس پہلو پر غور کرتی مایوسی ہی مایوسی نظر آتی۔ یہ خدا کا شکر تھا کہ بچے موجود تھے اُن کے ساتھ لگی رہتی تھی ورنہ سائرہ کچھ اس طرح چاروں طرف سے گھر گئی کہ مخبوط الحواس ہو جاتی تو تعجب تھا۔

وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ نہا کر اٹھتی تو آدھی شیشی عطر کی خالی ہوتی۔ ایک یہ دن تھے کہ لونڈیوں سے بدتر ہڈرا ماماؤں سے بُری گت، کپڑے چکٹ، سر الجھا ہوا، بال بھولے ہوئے، بدن چپچپا رہا، دوپٹہ پھٹا ہوا جوتی ٹوٹی ہوئی۔

(۴۱)

جاڑوں میں ایک دن چار بجے صبح سے جو مہاوٹ پڑنی شروع ہوئی تو دس بج گئے اور مینہ نہ تھما لڑکی نے کہا اماں آج تو بینی روٹی پکا لو۔ اب کہاں ہنڈیا پکاتی پھرو گی۔ تم بیٹھی رہو میں آٹا گوندھ کر روٹی ڈال لیتی ہوں۔ بیسن رکھا ہی ہوا ہے۔ سائرہ بولی اچھا۔ لڑکی نے روٹی پکائی سارے گھر نے چین سے بیٹھکر کھائی۔ دو بجے ہونگے کہ بڑے لڑکے کو دست آیا۔ ایک آیا دوسرا آیا اور ایسا آیا کہ دو ہی دستوں نے بالکل جھلنگا کر دیا۔ چار بجے تو یہ کیفیت تھی کہ ابھی گیا اور ابھی آیا۔ دو کی گنتی تھی نہ چار کی، دس کی نہ بیس کی۔ پلنگ کے برابر چوکی لگا دی۔ آٹھ دس دفعہ وہاں گیا

پھر تو اٹھنا کیسا ہل بھی نہ سکا گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ دنیا بھر کے علاج کر ڈالے مگر اس غضب کے دست چھوٹے کہ جان لیکر ہی بند ہوئے۔ بارہ بجے تک آنکھیں بالکل بیٹھ گئیں۔ تین بجتے بجتے۔ بچہ رخصت ہوا۔

تفکرات نے پہلے ہی سائرہ کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ بیٹے کا مرنا تھا کہ بالکل ہی مُردہ ہو گئی۔ سڑنوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتی اور پاگلوں کی طرح ایک ایک کا مُنہ تکتی۔ گھنٹوں گم سم بیٹھی رہتی۔ راتوں پڑی روتی وہ تیہا اور زبان سب ختم ہو گئی۔ وہ مزاج رہا نہ غصہ۔ وہ وقت رہا نہ بات۔ ہاں اسکی یاد گار ایک کلنک کا ٹیکا رہ گیا۔ جو قمر چہار دہم کی طرح ماتھے پر چمک رہا تھا۔ یہی علائق دنیا جنکو شیر کی طرح دبائے ہوئے تھی سر پر سوار ہو گئے۔ چاروں طرف سے نرغہ کر لیا۔ چند ہی روز میں زندگی سے بیزار موت کی دعائیں مانگنے لگی۔ مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ حالت میں انقلاب عظیم۔ عادتیں چھوٹ گئیں۔ زور اڑھے گیا۔

جس سائرہ کو ساس کی آدھی بات کی برداشت نہ تھی اب اس قابل ہو گئی کہ آیا گیا لعنتی کا طوق پہنا جاتا اور کچھ نہ بولتی۔ چوری اور تنخواہ وغیرہ کا اثر تکلیف دہ ضرور تھا مگر جگر خراش نہ تھا۔ مغموم رہتی تھی، افسردہ رہتی تھی لیکن لڑکے نے مر کر تو بالکل ہی بٹھا دیا۔ سائرہ کو یوں تو سب ہی بچوں سے بے انتہا محبت تھی اور کیوں نہ ہوتی اس کی اولاد تھی مگر اس لڑکے سے اسکو عشق تھا۔ ذرا سر میں درد کہہ دیتا تھا تو بے چین ہو جاتی تھی۔ ہائے کم بخت دنیا کیا ستم کیا جن ہاتھوں سے برسوں خدمت کی ان ہی سے نہلا دھلا کفن پہنا رخصت کر دیا۔

عابد کو بیوی سے جو کچھ نفرت پیدا ہوئی یا شکایت ہوئی وہ صرف اس کی عادات و حرکات سے۔ جوں جوں بیوی کی حالت تبدیل ہوتی گئی میاں کے دل میں محبت و موانست پیدا ہوتی گئی۔

عابد کی حالت بیوی کی طرح ایسی ابتر تو نہ تھی مگر پھر بھی وہ ماں تھی تو وہ باپ بیٹے کے مرتے ہی دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہوا اور قبرستان جا پہنچا۔ قبر پر بیٹھا کبھی پڑھتا رہتا کبھی روتا رہتا۔

عابد کا دل بے ثباتی دنیا سے پہلے ہی بیزار تھا۔ نظارہ قبرستان نے بالکل ہی بیکار کر دیا، صبح کا سہانا وقت ہوتا تھا۔ بادنسیم ناپائیداری دنیا کے خیال کو تروتازہ کر دیتی تھی۔ ہزاروں لاکھوں اللہ کے بندے اپنے پیاروں سے منہ موڑ عزیز آشناؤں کو چھوڑ ان قبروں کو بسائے ہوئے تھے۔ ایک شہر خموشاں بس رہا تھا۔ کچی پکی قبریں پٹی پڑی تھیں۔ بڑے بڑے سرکش اور اونچے اونچے نامدار جوانان گلعذار فقیر و تاجدار پنجہ موت کا شکار ہوئے بیکس و لاچار پڑے تھے۔ نیم، املی، گوندنی، شیشم کے درخت کہیں کہیں سایہ کئے ہوئے تھے۔ کوئی مونس نہ تھا، ہمدم نہ تھا، مہربان نہ تھا غمگسار نہ تھا۔ یہ بندگان خدا بے وارث نہ تھے، کوئی بھائی تھا کوئی باپ، کوئی ماں تھی کوئی بیٹی، مگر رشتہ حیات منقطع ہوتے ہی سب تعلقات معدوم ہو گئے۔ عزیزوں کے عزیز۔ ماؤں کے بیٹے، بیویوں کے سرتاج، خاوندوں کی پیاریاں، ماں باپوں کی دولاریاں عمر بھر کی کمائیاں، باوا اور مائیاں، بڑھاپے کے سہارے، آنکھوں کے تارے، بے خبر پڑے سوتے تھے۔ کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ انکی تنہائی پر دو آنسو بہا لے۔ ایک سناٹے کا عالم ہوتا تھا کبھی کبھی فاختہ کی آواز کان میں آجاتی تھی قبریں مختلف الحیثیت ضرور تھیں مگر قبر والوں میں کوئی امتیاز نہ تھا بعض ڈھے گئی تھیں۔ بعض دبے گئی تھیں۔ بعض برابر ہو گئی تھیں۔ کسی کا چونہ اکھڑ گیا تھا کسی کی اینٹیں نکل گئی تھیں۔ یہ وہ مقام تھا کہ بڑے بڑے سرکش یہاں آکر لاچار ہو گئے اور نیچا دیکھ لیا۔ جن کو اندھیرے میں نیند نہ آتی تھی۔ منیوں من مٹی کے نیچے جا سوئے۔ بچھونے کی حاجت ہوئی نہ چراغ کی ضرورت۔

طبیعت انسان کسی واقعہ سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ اس اثر کو زائل کر دیتی ہے۔ امید تھی کہ اس اصول کے بموجب عابد کی حالت چندروز بعد درست ہو جائیگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مگر ایک یہ دقت آپڑی کہ عابد غریب کی خرمن طبیعت میں پہلے ہی وحدت کی بارود بچھی ہوئی تھی۔ گورستان کا نظارہ ایک دہکتا ہوا انگارا تھا کہ لوازمات و فروعات سب کو جلا کر خاک کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بلاناغہ تین بجے رات سے اُٹھکر چلا جاتا اور شاہ غفور اللہ صاحب قدس سرہٗ کی مسجد میں نماز جماعت سے پڑھتا۔ دس گیارہ بجے کے قریب گھر آیا کھانا کھایا بیوی کو دو چار باتیں نصیحت کی سنائیں۔ ظہر کی نماز پڑھی اور پھر چلدیا۔ ظہر کا گیا گیا عشا پڑھ کر آیا۔

سال بھر کے قریب عابد کا یہی حال رہا۔ اگر ماں دست اندازی نہ کرے تو غالبًا بلکہ یقینًا وہ اس معمول کو ترک نہ کرے۔ بیٹے کی یہ کیفیت دیکھ کر ماں کو ایک اور خلجان پیدا ہوا۔ مجبورًا اُنھوں نے عابد کو حکمًا جانے کی ممانعت کر دی۔ اگرچہ یہ حکم عابد کے واسطے بہت سخت تھا۔ ہر چند تڑپا مگر سعادتمندی کے یہی معنی ہیں جس وقت سے ماں نے منع کیا پھر اُدھر کا رُخ نہ کیا۔

انسان کی حالت کبھی یکساں نہیں رہتی۔ جوں جوں دن گذرتے گئے بچے کی یاد ماں اور باپ دونوں کے دل سے کم ہوتی گئی۔ میاں بیوی میں جو چندروز کے واسطے کچھ کشیدگی سی ہو گئی تھی وہ بھی نہ رہی۔ سائرہ کے مزاج میں جوں جوں انسانیت آتی گئی عابد کی طبیعت مائل ہوتی گئی۔ سائرہ کو اگر خدا عقل دیتا اور وہ ذرا سمجھ سے کام لیتی تو میاں اوّل ہی دن سے بے داموں کا غلام تھا۔ یہاں تک ہرگز بھی نوبت نہ پہنچتی۔ مگر آدمی کچھ کھو کر سیکھتا ہے اب سائرہ یہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ میکے میں اللہ کا نام ہے۔ ماں کسی قابل نہ باپ کسی لائق۔ سسرال میں لے دیکر ایک ساس کا دم ہے۔ دیور جیٹھ کس کے ہوئے ہیں جو میرے ہونگے۔ اگر میاں کو بھی ہاتھ سے کھوتی ہوں تو کوئی بات بھی نہ پوچھیگا۔ سائرہ

کا یہ خیال معقول تھا یا نامعقول مگر بات لگتی ہوئی تھی اور سوچ بچار عورت کے تعلقات سسرال سے بالواسطہ ہیں جو کچھ وقعت و عزت ہے وہ میاں کی وساطت سے جب میاں ہی کے دل میں گھر نہ ہوگا تو گھر والے کیا خاک عزت کریں گے۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ سائرہ کی عادت اور طبیعت برسوں کی یکجائی اور یکرنگی سے لازم ملزوم ہوگئی تھیں۔ عمر بھر کی پڑی ہوئی عادتوں کا چھٹنا آسان بات نہ تھی۔ اتنا ہوگیا کہ میاں کو وقت پر کھانا مل جاتا پانی کے واسطے کھاتے کھاتے اٹھنا نہ پڑتا۔ بچھونا بچھا بچھایا مل جاتا۔ بیوی کا اتنا کرنا کوئی خدمتوں میں خدمت تھی نہ اطاعتوں میں اطاعت مگر عابد کو واقعی بہت غنیمت تھی۔ شکایت تو ناکامی توقع پر ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ میاں نے کبھی بیوی سے امید ہی نہ کی جس کے نہ ہونے سے افسردگی ہوتی۔ اب رہیں ساس نندیں جٹھانیاں اُن کی اطاعت محبت میل ملاپ سائرہ نے کیا نہ وہ کرسکتی تھی۔ ساس اس بات کی تو خواہشمند ہی نہ تھی کہ بہو میری خدمت کرے۔ اتنا ہی دیکھکر اُن کا دل باغ باغ ہوگیا۔ البتہ اس وقت انھوں نے پھر یہ کوشش کی کہ بہو کو اپنے گھر میں لے آئیں۔ مگر افسوس کامیابی نہ ہوئی۔

سمجھ میں نہیں آتا اور عقل کام نہیں کرتی کہ ساس کے نام کی ایسی سائرہ کو کیا آگ پڑگئی تھی کہ وہاں جاکر رہنا کیسا اگر وہ گھڑی بھر کو یہاں آجاتی تھیں تو انگاروں پر لوٹتی تھی۔ جٹھانیوں کو تو آکر جھانکتی بھی نہ تھیں۔

ادھر بڑے کا صدمہ پرانا ہوتا جاتا تھا۔ ادھر منجھلا ماشاء اللہ سیانا۔ دونوں ماں باپ اس میں محو ہوگئے۔ زیور کی کمی ساس نے پوری کردی۔ بچہ کے بدلے بچہ اللہ نے دیدیا۔ البتہ خرچ کی تکلیف بعض دفعہ بہت ستاتی تھی مگر دل ٹھکانے ہوں تو سلوک میں مٹھی بھر چنے بھی پلاؤ کی رکابی سے بڑھ کر ہیں۔

(۴۲)

جس روز سے بڑے میاں نے نصیحت کی تھی عابد کو کچھ ایسی اُن سے محبت ہو گئی کہ چاہے کھڑے ہی کھڑے کیوں نہ جائے مگر دن رات میں ایک دفعہ اُنکی خدمت میں ضرور جاتا۔ بڑے میاں جن خیالات کے آدمی تھے عابد کی رگ رگ میں وہ باتیں بھری ہوئی تھیں۔ خوب میزان پٹی۔

بڑے میاں نرے بڑے میاں ہی نہ تھے نہایت معزز اور معقول آدمی تمام امیروں اور رئیسوں میں اُن کا رسوخ تھا۔ ستّر روپے پنشن کے ملتے تھے۔ بیس پچیس روپے کا کرایہ تھا عابد کی مالی حالت پر اکثر افسوس کیا کرتے تھے۔ تنخواہ کے بند ہونے کا حال سُنکر کئی دفعہ ارادہ کیا کہ کچھ سلوک کروں مگر ہمّت نہ پڑی۔ ایک دن یوں ہی بیٹھے بیٹھے خدا جانے کیا جی میں آئی عابد کو ساتھ لیکر اُٹھ کھڑے ہوئے باہر آکر یکہ کیا اور سخاوت پور جا پہنچے۔ رئیس سخاوت پور ایک خلیق آدمی میر صاحب (بڑے میاں) کی شکل دیکھتے ہی تعظیم کو کھڑا ہو گیا اور نہایت عزّت سے اپنے برابر بٹھایا۔ میاں عابد کی تعریف سُنکر نہایت عقیدت سے مصافحہ کیا۔ اور بہت کچھ وقعت کی۔ سائرہ کے نام جو تنخواہ مقرر ہوئی تھی وہ اسی سرکار سے تھی۔ رئیسوں کے دربار میں جہاں دو چار بھلے مانس ہوتے ہیں وہاں چند فتنہ پرداز بھی لگے رہتے ہیں۔ موقع پاکر دو ایک ایسی جڑ دیں کہ تنخواہ یک قلم بند ہو گئی۔ عابد کو ہمراہ لانے کی غرض میر صاحب کو صرف تنخواہ کھلوانا منظور تھا۔ اثنار گفتگو میں مولوی صاحب کا ذکر چھیڑ دیا۔ نواب صاحب کو مولوی صاحب سے سچی عقیدت تھی بے انتہا تعریف کی اور نہایت افسوس سے کہنے لگے میر صاحب میں نے سُنا ہی تینوں صاحبزادوں میں سے ایک بھی کام کا نہ نکلا۔ مرمت و زینت ضرورت مسجد کے خیال سے میں بھی کچھ نذرت کیا کرتا تھا۔ سُنا یہ کہ اب مسجد میں ابابیلوں کے گھونسلے بنے ہوئے ہیں برسوں بھی چراغ جلنا نصیب نہیں ہوتا۔ چاروں طرف بیٹ ہی بیٹ نظر آتی ہے۔

جا نماز اور بوریے تو درکنار بدنی تک میسر نہیں۔ موذن ہر وقت شاکی، نمازی ہیں تو نالاں مجبور تنخواہ بند کردی، مجھکو اس کے دینے میں اب بھی عذر نہیں ہے۔ مواضعات وقف کی آمدنی بالکل علیحدہ ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ چھوٹے مولوی صاحب معقول انتظام کا وعدہ کریں۔
میر صاحب نے عابد کا مفصل حال اور عسرت کی کیفیت بیان کر کے آئندہ احتیاط کا یقین دلایا۔ نواب صاحب کو کیا عذر تھا اسی وقت خزانچی کو بلا کر سب چڑھی ہوئی تنخواہ دلوا دی۔ دو سو روپے کا ایک دوشالہ تنخواہ کے علاوہ پچاس روپے اور نذر کیئے آئندہ کے واسطے حکم دیدیا کہ تنخواہ پہلی کی پہلی پہنچ جایا کرے۔
عابد یا تو پیسے پیسے کو محتاج تھے یا اکٹھے ساڑھے تین سو روپے ہاتھ میں آ گئے آنکھیں کھل گئیں۔ دوشالہ اور روپے لاکر ماں کے آگے رکھدیئے انھوں نے لیجا کر بہو کو دیدیئے بی سائرہ تو اللہ رکھے سب گنوں پوری تھیں۔ آخر تھی بھی تو کس باپ کی بیٹی۔ وقت پر ضرورت کا رفع ہونا شرط ہے پھر چاہے کچھ ہی ہوا کرے بنئے کی اچاپت مہینوں سے اٹھ رہی تھی۔ میاں کو علم تھا نہ ساس کو خبر، بنئے کی ذات ڈوبتی ہوئی آسامی کو تو روپیہ دھیلی کا سودا کیا ادھی کا گڑ بھی ادھار نہ دے۔ مولوی صاحب کا گھر لاکھ بگڑ گیا تھا مگر للّا بنئے کو یہ یقین تھا کہ دو چار سو روپے اب بھی جوکھوں میں نہیں ہیں۔
فرض کر لو سائرہ نے ضرورت سے مجبور ہو کر قرض منگوایا۔ نہ منگواتی تو کرتی کیا۔ بھوکا تو مرا نہیں جاتا فاقے سے سویا نہیں جاتا مگر اللہ کی بندی اپنے پاس بھی تو حساب رکھتی۔ اتنی عقل خدا دیتا پرچہ نہ چٹھی حساب نہ کتاب جو بنئے کے دل میں آیا وہ بہی پر ٹانک لیا۔ روپے کے بارہ آنے تو کھلم کھلا ٹھہرائے آنہ دو آنے بیاج کے رکھے دو چار پیسے نفع کے۔ غرض دیا ایک تو لکھے تین۔ عابد بچے میں سے اترے تو باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ روپوں کا رومال ہاتھ میں تھا۔ سامنے للّا بیٹھا تھا۔ رومال دیکھتے ہی پیٹ میں درد ہونے لگا۔ خبر نہیں کس مشکل سے دن کاٹا۔ شام ہوئی تو لڑکے کو بھیجا

کہ چھوٹی بیگم سے کہہ کب کا حساب ہو گیا۔ مجھے تو مانگتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ دو چار روپے ہوں تو بٹے کھاتے ڈال لوں سینکڑوں کی رقم تو نہیں چھوڑی جاتی۔ اسوقت تو حساب صاف کر دیں۔ پھر چاہے کل ہی جتنا سودا منگوالیں۔ لڑکا ابھی پلٹا بھی نہ تھا کہ ایک پھٹی سی دقیانوسی بہی بغل میں دبا آپ آن پہنچا اور مولوی جی مولوی جی کہکر دُہائی دینی شروع کی۔ عابد نے باہر نکلکر دیکھا تو لالہ بلّا کھڑے ہیں۔ بیوی سے جاکر پوچھا بیوی کو تو ماشاء اللہ تیس کے آگے گنتی بھی یاد نہیں تھی۔ حساب تو کیا بتاتیں۔ بنئے سے آکر پوچھا۔ اس نے کہا مولوی صاحب جی سو روپئے سے اونچے نکلتے ہیں۔ اب تو عابد ذرا چوکنّے ہوئے۔ مگر بلّا نے کہا مولوی صاحب! تاریخ وار حساب لکھّا ہوا ہے ادھی کا بل نکل آئے تو کوڑی نہ دو۔

بلّا کا حساب صاف کرنا پڑا اور روپئے دینے بنی۔ زیادہ سے زیادہ پچیس تیس کا سودا وہ بھی جھینک جھینک کر دیا ہوگا۔ مگر کہتے تو کس برتے پر اور کرتے تو کیا حساب کتاب جو کچھ تھا بنئے کی زبان یا وہ پھٹے ہوئے کاغذ۔ روپئے کے روپئے گئے اور احسان کا احسان ہوا۔ عابد نے بیوی سے اتنا تو کہہ ہی دیا کمال کیا مجھ کو خبر تک کی اور سو روپئے کا قرضہ کر بیٹھیں۔

بیوی۔ تم نہیں جانتے تھے کہ یہ کہاں سے آرہا ہے۔ آسمان پر سے تو آن ہی نہیں پڑتا تھا قرض نہ منگواتی تو اور کیا کرتی۔ تم دیکھتے نہیں تھے یا جانتے نہیں تھے۔

جواب سخت تھا یا طنزیہ مگر بات معقول تھی اسکے بعد عابد کی آگے بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ بنیا باہر نکلا تھا کہ حلوائی نے آکر آواز دی۔ اس کے ہاں سے بچوں کا سودا آیا کرتا تھا چھتیس روپئے وہ لے گیا۔ حلوائی گیا قصائی آیا۔ اکیس روپئے اسکو دیئے۔ ان تین رقموں سے فرصت ہوئی تو چھوٹے موٹے حساب شروع ہوئے۔ غرض رات کے دس بجے تک قرضخواہوں کا تار نہ ٹوٹا۔ ساڑھے تین سو روپئے ڈہائی تین گھنٹے میں

اُڑ گئے پھر بھی سوا سو کا قرضہ باقی رہا۔ بزاز سے تو دوسرے دن جھک جھک بھی ہوئی جھک جھک کیا جو جو اُس نے کہا سب کان دبا کر سُننا پڑا۔ مولوی صاحب کے مکان پر آجتک قرضخواہ نہ آیا تھا۔ سائرہ کی ساس اس آن کی عورت تھیں کہ چاہے جان نکلجائے مگر غیر کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں۔ قرضخواہوں کے تقاضے اُن کے کلیجے پر تیر لگ رہے تھے۔ خصوصًا بزاز کی آواز تو اُن کو بہت ہی ناگوار معلوم ہوئی۔ اتفاق سے اس وقت وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بولی کچھ نہیں چپکی اُٹھ اپنے ہاں چلی آئیں۔ عابد نے باہر نکل کر منت خوشامد سے مہینہ بھر کا وعدہ کیا اور بزاز کو ٹالا۔

ایک قرضخواہ ہو تو کہا جائے چلن سے چلتی تو پندرہ روپئے کچھ کم نہ تھے۔ پیٹ دونوں وقت بھر سکتا تھا گھی نہیں اُوبالا گیہوں نہیں چنے، سالن نہیں دال۔ روکھی سوکھی ہنسی کسی کچھ ہی ہوتی مگر یہ آفت تو نہ ہوتی۔ پانچ مہینے سقے کے چڑھے ہوئے تھے۔ دھوبن کو چھ مہینے سے ایک کوڑی نہیں دی تھی اور تو اور تین مہینے حلالخوری کے ہو گئے تھے۔ دورویوں کو کنجڑا جھینک رہا تھا۔ سوا روپئے کو دودھ والی پیٹ رہی تھی۔

سائرہ کا دل تو کوارپتے ہی سے قرضہ پر شیر تھا دینے کا فکر ہوتا تو لینے سے ڈر لگتا یہ بھی اتفاق سے ادا ہو گیا ورنہ بنیا کیا اور حلوائی کیا بزاز کیا اور قصائی کیا عمر بھر پیٹتے اور کوڑی وصول نہ ہوتی۔ محلے میں ایک اندھی بڑھیا بھی رہتی تھی۔ کیا بدنصیب عورت تھی۔ دو بیٹے جوان مرے ایک بیٹی مری۔ داماد مرا۔ بہن مری بہنوئی مرا غرض چار مہینے کے اندر اندر چھ جنازے ایک گھر سے نکلے۔ بھرا گھر خالی ہو گیا۔ بیٹی بیوہ ہوئی آپ اندھی ہوئی دونوں ماں بیٹیاں مزدوری کرتیں اور پیٹ پالتیں بیٹی کی سلائی ماں کی پسائی۔ دونوں کے ڈھائی تین آنے ہو جاتے۔ بڑھیا کی نو پسائیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ حساب کتاب کی خبر سُنکر لکڑی ٹیکتی ہوئی آئی۔ چوکھٹ ہی میں تھی کہ سائرہ نے للکارنا شروع کر دیا۔ بڑھیا دو وقت کے فاقے سے تھی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی اگر

چار ہی پیسے دید و تو چولھا گرم ہو جائے۔ سائرہ کے تو پاس سے بھی ہو کر رحم نہ گذرا تھا تو بسائیوں کی پانچ لگائیں۔ اس میں بھی دو پیسے اور کاٹے کہ دو دفعہ آٹا اُترتا ہوا تھا بڑھیا نے اسپر بھی صبر کیا۔ مگر افسوس دیئے وہ بھی نہیں۔ کہدیا اب جا پھر آئیو۔

خدا کی شان ہے بنیا بچیس کے سوا سولے جائے اور بڑھیا جس نے چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہایا تین تین بجے رات سے اُٹھ کر چکی کی مصیبت بھگتی۔ پیسوں کے بدلے فضیحتیاں سُن جائے۔

عابد رستے بھر شیخ چلی کے سے منصوبے کرتے چلے آ رہے تھے بیوی نے دم بھر میں چُنا چُنایا محل ڈھا دیا۔ بیوی سے تو کچھ کہنے کی ہمت ہوئی نہیں۔ ماں سے جا کر شکایت کی۔ کوئی دوسری ساس ہوتی تو پچاس اور جڑ دیتی مگر سائرہ کی ساس آجکل جیسی ساس نہ تھیں۔ مُنہ ہی سے نہیں دل سے۔ زبان ہی سے نہیں۔ درحقیقت سائرہ کی محبت انکو بیٹی سے کچھ کم نہ تھی۔ دل ہے جیسا آجائے۔ بہوئیں دو اور بھی تھیں اور سعادتمند۔ مگر جو بات چھوٹی کی تھی ان دونوں کی نہ تھی۔

عابد کو یہ توقع ہی نہ کرنی چاہیئے تھی کہ ماں بہو کے برخلاف میری ہاں میں ہاں ملائینگی۔ یہ اُن کی تجربہ کاری اور ہوشیاری تھی کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو اس طرح شیشے میں اُتارا کہ اپنی شکایت بھی غلط سمجھنے لگا۔

(۳۴)

پندرہ روپئے ساس دیتی تھیں بیس روپئے یہ آنے لگے پینتیس ہوگئے۔ مزے سے گذرنے لگی۔ اطمینان کا ہونا تھا کہ پھر سائرہ دون کی لینے لگیں وہ مسکینی اور بردباری مفلسی ہی تک تھی۔ وہی طنطنہ اور مزاج وہی زبان درازی اور نخوت۔ اس فارغ البالی سے تو وہ فقیری ہی اچھی تھی یہ تو نہ تھا کہ عابد چراغ ہاتھ میں لئے تکیہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

سائرہ کا پلٹا کھانا تھا کہ عابد پھر مصیبت میں پھنسا۔ دبتا تھا تو بیوی شیر ہوتی تھی۔

سر اٹھاتا تھا تو ماں گلا دباتی تھیں۔ مجبور غریب نے اپنے دل میں یہ آخری فیصلہ کر لیا کہ جب تک جان میں جان ہے عمر بھر اس بیوی کے ہاتھوں پریشان رہونگا۔

پہلے تو خیر اتنا ہی تھا کہ کسی بات پر بگڑی اور میکے جا پہنچی اب یہ ایک اور ہنر سیکھا کہ میاں نے گھر سے باہر قدم نکالا اور بیوی محلے میں چار چار پانچ پانچ گھنٹہ غائب۔ چھتوں ہی چھتوں اور کوٹھوں ہی کوٹھوں چار بیسے ڈولی تک پہنچ جاتی تھی۔ بچے ہیں کہ چاروں طرف اماں اماں چیختے پھر رہے ہیں۔ اماں پر محلے بیٹھی ہیں۔

سائرہ کے مزاج میں خود بینی کا مادہ حد اعتدال سے بڑھا ہوا تھا۔ محلے والوں نے جو خاطر مدارات کی وہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہ تھی سب ہی کیا کرتے ہیں۔ امیر اپنے لائق غریب اپنے لائق۔ مولوی صاحب ایسے معمولی آدمی بھی نہ تھے۔ اُن کی عزت کے خیال سے تو اگر محلے کی عورتیں سائرہ کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتیں تو بیجا نہ تھا۔ جھمن سقہ کا گھر دیوار بیچ تھا پہلے دن ہی پہنچیں سقنی بیچاری خوشی کے مارے اُچھل پڑی۔ اِدھر اُدھر کی سب عورتوں کو جمع کر لیا۔ اب ایسی جگہ سائرہ کی جسقدر آؤ بھگت ہوتی تھوڑی تھی۔ سائرہ تھیں کہ ہل گئیں۔ بڑی اور منجھلی دونوں بہوئیں۔ وہ بہوئیں کہ جنھوں نے آجتک چوکھٹ سے باہر قدم نہ نکالا سائرہ کو دیکھکر سارا محلہ تعجب کرتا تھا اور بیچ کرتا تھا کجا مولوی صاحب کی بہو۔ کجا جھمن سقہ کا گھر۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ عابد گھر میں آیا اور بیوی کا پتہ نہیں۔ جب دیکھو ممی کے ہاں اور جب دیکھو چھمی کے پاس۔

عابد کو بیوی کی یہ حرکت جس قدر ناگوار معلوم ہونی چاہئے تھی اتنی ہوئی اور تکلیفیں تو خیر جس طرح ہوا برداشت کریں۔ اب سب سے بڑا اندیشہ اپنی عزت کا پیدا ہوا کہ تمام محلے میں رسوائی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی پوتی مولوی صاحب کی بہو، میاں سلیم کی بیٹی، سقنی اور کنجڑیوں کی بہن بنی ہوئی ہے۔

عابد ایک دن کھانا کھا کر ہاتھ دھو رہا تھا کہ کہاروں نے آواز دی۔ ڈولی اتروالو۔ ساس کے شبہ میں ڈولی کا پردہ اُلٹ دیا۔ دیکھتا ہے تو میروکی پھوکری ہاتھ میں مٹھائی کی ٹوکری لئے بیٹھی ہے۔ عابد پردہ چھوڑ کر مُڑے ہی تھے کہ لڑکے نے چیخکر کہا اماجی خالہ نصیبن آئیں۔ خالہ کا نام سُنکر سائرہ ڈیوڑھی میں آئی۔ میاں کو باہر کیا اور بہن کو لیکر اندر آئیں۔

مولوی صاحب مرحوم خلیق تھے منکسر المزاج تھے رحیم تھے مگر اتنے بے عزت نہ تھے کہ سقے دھوبیوں کی عورتیں اُنکی بہو بیٹیوں کے برابر بیٹھیں۔ شادی بیاہ میں آئیں اپنے قرینے سے بیٹھیں اٹھیں چلی گئیں۔

عابد بیوی کی حرکات پر یوں ہی زہر کے گھونٹ پی رہا تھا نصیبن کا نام سُنکر تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دن بھر تو گھر میں نہ آسکا۔ شام کو نصیبن چلی گئی تو اندر آیا۔ بیوی سے کہا تم اچھی بہو آئیں کہ ہمارے تمام خاندان کی ناک کاٹ کر رکھدی۔ ذرا سوچو تو سہی ہماری عزت اس قابل ہو کہ یہ کم ظرفیں ہم سے رشتے جوڑیں تم کو مطلق شرم نہیں۔ ذرا غور تو کرو کس کی بیٹی کس کی بہو اور کس کو بہن بناؤ۔ تم نے اس میل جول میں کیا نفع دیکھا۔ آج کو حصہ بخرے کا لین دین ہی۔ کل کو بٹیا بیٹی کا شروع کردیا۔

سائرہ۔ مجھے تو غرور نہیں آتا جیسی اللہ کی بندی میں ایسی وہ، مجھ میں کیا لال لگے ہوئے ہیں کہ ایک شخص محبت سے ملے اور میں نفرت کروں سب دنیا کے ڈھکوسلے ہیں۔ اللہ کے ہاں سب ایک ہیں تم تو بڑے اللہ والے ہو۔ میں تو یہ کہتی ہوں امیر ہو چاہے فقیر جو اپنے سے ملے اسکی پاؤں کی خاک رہے۔ غیر بھی ہو تو اپنوں کا اپنا ہے اور چاہے اپنے پیٹ کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے سے رکے تو اسکی طرف مڑکر بھی رخ نہ کروں۔ یہ بیچاریاں میرا کیا لے لیتی ہیں۔ محبت سے بولتی ہیں گھڑی آدھ گھڑی جا بیٹھتی ہوں اور پیسے دھیلے کا خون ہی کراتی ہوں۔ نصیبن آئی تو کیا زہر مل گیا۔ پورے دن بیٹھی تھی۔ بن نے کہا نہیں

پاؤں پھیر جا۔ تم کو تو لڑنے کے واسطے ایک بہانہ چاہیئے۔ جس دن سے تنخواہ کھلی ہے چھدتا ڈھونڈ رہے ہو۔ ایسی تنخواہ کو بھی سلام اور ایسے گھر کو بھی سلام، کہیں آنے کی میں نہیں۔ جانے کی میں نہیں۔ کسی سے بولوں میں نہیں۔ چالوں میں نہیں۔ دن رات گھر میں بیٹھی سڑا کرو کسی سے بات کی نہ چیت کی۔ بلا سے سقّے ہیں یا دبگیّے اب تو سو شریفوں کے شریف ہیں۔ ہم میں کیا شرافت لگی ہوئی ہے بیچی ہیں دو دو دپٹوں سے تیسرا دوپٹہ نہیں۔ کرتے بھی چار خبر نہیں کیونکر بن گئے نہیں ننگی ہی پھرتی۔ اُن کم ظرفوں کو جا کر دیکھو لو مہین ململ کے دوپٹے بابل لیٹ کی کرتیاں۔ ورلیس کے پائجامے۔ چاندی کا ہے تو بلا سے گوندنی کی طرح گہنے میں لدی ہوئی ہیں میاں ایسے تابعدار کہ پیسہ ہو تو ۔۔ نہ پیسہ ہو تو بیویوں کو اختیار ہے۔ ایسی شرافت کو کیا آگ لگانی ہے کہ بدن پر چیتھڑا تک نہیں۔ تنخواہ کیا کھلی میری جان کو تو عذاب ہو گیا۔ ساس ہیں وہ دن رات جوتیاں مارتی ہیں۔ میاں ہیں وہ ہر وقت کھائے جاتے ہیں۔ میں تو اس گھڑی کو نہیں پاتی جب نکاح بندھا مجھے خبر تھی کہ ایسے قل آعوذیے میری تقدیر میں لکھے ہیں۔

سائرہ یہیں تک پہنچی تھی کہ لڑکی پتیلی لیکر آئی اور کہا اماں مجھکو بھوک لگ رہی ہے۔ سالن نکالدو۔ کفگیر ہاتھ میں لیا، بات میاں سے کر رہی تھی منہ اُدھر تھا دھیان اِدھر خیال کہیں کان کہیں کٹورے میں سالن ڈال رہی تھی ایک چھینٹ اُڑ کر ہاتھ پر آ پڑی بھری ہوئی سالن کی پتیلی اٹھا کر انگنائی میں پھینکدی اور چیخنا شروع کیا۔ آواز ماشاءاللہ ایسی کراری تھی کہ گلی کے نکڑ پر سے صاف سُن لو۔ عابد بیوی کی یہ کیفیت دیکھ کر ایسا کان دبا کر بھاگا کہ صبح تک گھر میں آنے کی ہمت نہ پڑی۔ بیوی کے سمجھانے کا یہ مزا چکھا کہ رات بھر مسجد میں اکڑا۔

سرکاری مدرسہ میں ایک مدرس کی ضرورت ہوئی، جگہ اچھی تھی تنخواہ معقول محنت کم۔ عزت زیادہ۔ عابد کی علمی لیاقت میں تو کسی کو کلام تھا ہی نہیں، صرف درخواست کی دیر تھی سفارش کی ضرورت ہوئی نہ کوشش کی حاجت پچاس روپے ماہوار پر تقرر ہو گیا۔

کیسا ہی متحمل و بردبار آدمی کیوں نہ ہو۔ مادہ نفسانیت غارت نہیں ہو جاتا۔ تحمل کی ایک حد ہوتی ہے اور بردباری کی ایک انتہا۔ سائرہ کے مظلمے قیاس سے بھی تو دو چار ہاتھ تجاوز کیے ہوئے تھے۔ ایک بیوی کی نالائقی نے زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ خدا کے فضل سے پڑھا لکھا ہٹا کٹا نوکر چاکر پھر کیا وجہ تھی کہ عابد زندگی سے بیزار ہو کر موت کا خواستگار ہو جاتا اور بیوی کا انسداد و تدارک مطلق نہ کرتا۔ عابد کا اس میں کچھ قصور نہیں۔ یہ سرشت انسانی ہے کہ روپیہ ہاتھ میں آکر مزاج کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ سخاوت پور کی تنخواہ میں سے تو ماں کے جیتے جی کوڑی اِدھر سے اُدھر نہیں سرکا سکتا مگر اس تنخواہ کا ارادہ مصمم کر لیا کہ بیوی کو بھاپ بھی نہ دکھاؤں گا۔ مہینہ ختم ہوا، تنخواہ ملی، لا کر ماں کے ہاتھ میں دی۔ عابد منہ ہی دیکھتا رہا اور ماں نے پچاس کے پچاس روپئے بہو کو دیدیے اور کہا بیوی یہ تمہاری تنخواہ اللہ تم کو نصیب کرے ہماری خوشی یہی ہے کہ تم کو خوش دیکھیں۔

ساس ہو تو عابد کی ماں جیسی کہ بھر مٹھی پچاس روپے بہو کی جھولی میں ڈالدیئے اور بہو ہو تو سائرہ جیسی کہ ٹوٹے ہاتھوں سے دو انگلیاں بھی ماتھے پر نہ رکھی گئیں۔

عابد اس وقت تو ماں کے سامنے خاموش ہو گیا مگر اس بات کا منتظر رہا کہ کسی طرح اپنے ارادے کا اظہار ماں پر کر دوں۔ کوئی آٹھ روز بعد ادھر تو عابد ظہر پڑھ کر بڑے گھر میں آیا اُدھر ماں دعا مانگ کر اٹھیں اس سے اچھا موقع کہاں ملتا اور کونسا ملتا پاس آبیٹھا اور کہنے لگا۔

آپ کی تجویز کے خلاف اور آپ کے حکم سے انحراف کرنا سراسر گستاخی اور علانیہ نالائقی ہے۔ میرے ہاتھوں یا میری وجہ سے جس قدر تکلیف آپ کو پہنچی اور پہنچ رہی ہے خدا شاہد ہے کوئی گھنٹہ ایسا نہیں جاتا جو اس کا افسوس نہ کرتا رہتا ہوں۔ جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہوں مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہے۔ رونا تو یہ ہے کہ کوئی تلافی بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف وفور جوش اور انتہائے محبت ہے کہ آپ کے دل پر ان معاملات کا

اثر واقعی نہیں ہوتا۔ ورنہ میں نا ہنجار تو اس قابل ہوں کہ سنگسار کردیا جاؤں آپکی شفقت محبت اور خدمت کا یہی معاوضہ ہو سکتا تھا کہ بہو گستاخیاں کرے میں بیٹھا اپنے کانوں سے سنوں اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور خاک انتظام نہ کرسکوں؟ لعنت ہے میری زندگی پر اور تف ہی میری ہستی پر، مجھ جیسا نالائق بیٹا خدا دشمن کو نہ دے۔ اماں دنیا تو خیر جس طرح لکھا تھا مرکرا ور پٹ پٹ کر گذر گئی۔ عاقبت کا کیا کروں۔ اعمال جس قابل ہیں وہ ظاہر۔ افعال جس لائق ہیں وہ معلوم مغفرت کی امید کس برتے پر۔ والدین کی رضامندی بھی رضائے الٰہی کا ایک جزو ہے۔ میری تقدیر میں یہ بھی نہ تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کرونگا اور کیا کہونگا۔ جرم آشنا سنگین۔ ثبوت معقول۔ بریت خاک نہیں۔ غرض دین اور دنیا دونوں گئے اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے اولاد بھی خدا نے اس قابل نہ دی کہ اُسی کو دیکھکر جی خوش ہوتا۔ صاحبزادے ہیں اُن کا نمبر بد معاشوں سے بھی بڑھا ہوا ہی صاحبزادی ہیں وہ ماں سے بھی ایک حصہ چڑھی ہوئی اُنکی ناہمواری کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو گا کہ خدا ہی کو نہیں پہچانتے۔ پہچانیں کہاں سے ماں کو خدا نے اتنی نیک توفیق ہی نہ دی میرے ہاتھ پر حلف رکھد یجیئے میں نے آج تک آپ کی بہو کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا اگر خدا نخواستہ مرجائیں تو میں اُنکے جنازے پر نماز کس مُنہ سے پڑھوں۔ تعجب ہے کہ اس گھر پر اب تک کوئی عذاب الٰہی نہ نازل ہوا۔ سچ پوچھو تو یہ بھی ایک قسم کا عذاب ہی ہے جو گھر پر نہیں مجھپر نازل ہو گیا ممکن ہو کہ میں اس سے بھی زیادہ کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہوں اور اس کا بدلا مجھکو دنیا کی دنیا ہی مل گیا۔ آخرت کا حساب تو الگ رہا۔ مجبور یہ ارادہ کرلیا ہو کہ کسی طرف میں بھی نکل جاؤں۔ رہے یہ بچے انکی پرورش میں کیا اور آپ کیا جو اَب کرتا ہے وہ جب کریگا۔ میرا دل تو دنیا سے بھر گیا۔ بڑے کے مرتے ہی جی چھوٹ گیا تھا اب اور بھی نفرت ہو گئی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اسلام میں رہبانیت کی اجازت نہیں مگر کیا کروں بلا سے کسی طرح تو ان جھگڑوں سے چھٹکارا پاؤں۔ یہ تو۔ ہوگا کہ رات دن پریشان۔ نماز کا میں نہیں روزہ کا میں نہیں خدا

کا میں نہیں، رسول کا میں نہیں۔ دین کا میں نہیں دنیا کا میں نہیں۔ میں جانتا ہوں جسقدر میری مفارقت کا آپ کے دل پر اثر ہوگا مگر کیا کروں اسکے سوا کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ دنیا نہ ملی نہ سہی۔ دین کو تو ہاتھ سے نہ کھوؤں۔

ماں۔ بھائی ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے جو تم زندگی سے بیزار ہو گئے ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے جو دنیا سے بھاگنے کی ٹھان لی۔ بال ہوں بچے ہوں شادی کرو بیاہ کرو بہو لاؤ۔ داماد آئیں سب ارمان پورے ہو جائیں تو جاننا کہ دنیا دیکھی۔ بیوی کی ذرا سی نالائقی پر دنیا کو تجنے لگے۔ گھروں میں لڑائیاں ہوتی نہیں؟ اگر ایسی ذرا ذرا سی باتوں پر دنیا کو چھوڑنے لگیں تو دنیا کے کام خوب چلیں۔ خبر نہیں مجھ کمبخت کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ تمام دنیا کو موت ہے مجھ کو موت ہی نہیں۔ بیٹا! مجھ کو مر جانے دو۔ پھر جو جی چاہے کرنا۔ میاں بیویوں میں لڑائیاں ہوا ہی کرتی ہیں۔ لڑکی ہے بعض دفعہ ضد آجاتی ہے دو ایک دفعہ وہ درگذر کر جائیں ایک آدھ مرتبہ تم طرح دیجاؤ۔ چلو طے ہوا خدا کا شکر ہے۔ کسی طرح کی تنگی نہیں۔ غریبی نہیں۔ اللہ رکھے چار بیسی روپیہ۔ سر آئے پاؤں جائے۔

عابد۔ بہو کے ہاتھ میں تو چار بیسی کیا اگر ہزار بیسی دو گی تو صبح سے شام تک سب برابر ہیں۔ میں نے اسلئے سوچا تھا کہ سخاوت پوری تنخواہ گھر کے خرچ کی۔ یہ پچاس آپکے پاس رہیں۔ آپ نے یہ بھی اٹھا کر اُن کے حوالے کر دئیے آج جا کر پوچھ لیجئے جو ایک پیسہ بھی موجود ہو۔

ماں۔ بیٹا! اللہ کا شکر ہے میری ضرورت کے لائق اللہ نے مجھے دے رکھا ہے تمھاری کمائی بیوی بچوں کا حق ہے اللہ اُن کو لینی اور تم کو دینی نصیب کرے تم کماؤ وہ اٹھاویں میری تقدیر میں جو تھا میں کر چکی۔ ہزاروں آئے اور اٹھائے۔ مجھکو اب کوئی ارمان نہیں دنیا جہان میں مردوں کی کمائی بیویوں کے ہاتھ میں آتی ہے میں نے جا کر دیدی تو کیا گناہ کیا۔ لاکھ بے ڈھنگی ہوں اولاد کا ساتھ ہے۔ لڑکیاں آگے ہیں کچھ نہ کچھ وقت کے واسطے رکھیں ہی گی۔ جو کچھ اٹھائینگی وہ گھر میں۔ کہیں باہر تو پھینک آنے ہی سے ہیں آجکل

کا وہ زمانہ ہے کہ ایک پیسہ بھی مفت نہیں دیا جاتا۔ جو اٹھیگا وہ گھر میں، جو بچیگا وہ کام آئیگا یہ تمھاری سرتاسر بیوقوفی ہے جو ایسا خیال کرو۔ گھر والی ہے بزارن تھوڑی ہی۔ اسواسطے سر پر ہاتھ رکھکر نہیں لائی کہ سب کمائی ہضم کروں اور وہ مصیبت بھگتے۔ تم نے تو بیچ قوموں کو بھی مات کیا وہ بھی ایسی بات نہیں کہتے اب تو کہا ہے اب نہ کہنا۔

عابد کا مطلب کچھ اور ہی تھا۔ یہاں اُلٹی ٹانگیں گلے میں آگئیں۔ ماں نے ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ جی ہاں کے سوا کچھ کہتے بن نہ آئی۔ عابد کی تجویز اور ساس کی فہمائش کا حال کسی ذریعہ سے سائرہ کے کان تک بھی پہنچگیا مگر کیا اُلٹی سمجھ کی عورت تھی۔ ہوا کچھ سمجھی کچھ۔ کچھ لگانے والوں کی چالاکی۔ کچھ سمجھنے والے کی سمجھ کا پھیر جانا یہ کہ آئندہ سے تنخواہ میرے پاس آنی موقوف ہوئی اٹھی اور ساس سے لڑنے چلی۔ اتفاق سے شاکرہ بھی آئی ہوئی تھی۔ بیٹی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ سائرہ کا رنگ ہی اور ہوگیا۔

(۴۴)

شاکرہ دن بھر رہ کر شام کو چلی گئی۔ عابد اپنے وقت مقررہ پر بعد عشا گھر میں آیا تو خلاف معمول چوکی بچھی ہوئی، قلعی دار لوٹہ رکھا ہوا۔ الگنی پر تولیہ، گھر میں جھاڑو ملی بچھونا بچھا ہوا بہت ہی متعجب ہوا سوچ ہی رہا تھا کہ الٰہی یہ آج بیوی کے دل میں کیا آئی جو بیوی نے لوٹہ لیکر میاں کے ہاتھ دُھلائے۔ دھلا چکی تو جلدی دسترخوان بچھا کر کھانا رکھا۔ پانی بھر کر کٹورا رکھا۔ میاں نے کھانا شروع کیا۔ بیوی بیٹھ کر پان بنانے لگی رکھا چکا تو پھر ہاتھ دُھلائے۔ تولیہ دیا پان دیا۔ پھر آپ کھانے بیٹھی۔ عابد پلنگ پر لیٹا تو ششدر متحیر لاکھ عقل لڑاتا تھا مگر خاک کام نہ کرتی تھی۔

سائرہ نے تو ایسی کروٹ لی کہ جو دیکھتا تھا وہ تعجب کرتا تھا۔ جس بیوی نے کبھی سیدھے منہ میاں سے بات تک نہ کی۔ دس دس گیارہ گیارہ بجے رات تک انگیٹھی

پر کھانا لئے بیٹھی رہتی۔ سائرہ کا یہ حال دیکھ کر کہ لونڈی کو عذر ماما کو عذر اور بیوی کو عذر نہیں۔ عابد تو نہال ہوگیا۔

سائرہ کو عقل آئی تو سہی مگر بہت دیر میں۔ اتنی کیا اگر اس سے آدھی بلکہ چوتھائی خدمت بھی اوّل دن سے کرتی تو عابد اس مزاج کا آدمی تھا کہ بیوی کے سوا دنیا بھر کو بھول جاتا چنانچہ اب بھی ایسا نہ ہوا تو اتنا ضرور ہو گیا۔ دس بجے مدرسہ گیا اور دو بجے چلا آیا اُسوقت کا گھسا گھسا دوسرے دن دس بجے گھر سے نکلا کبھی ایسا ہی ہوا تو مسجد میں چلا گیا نہیں تو گھر ہی میں وضو اور گھر ہی میں نماز۔ خدا اور رسول معرفت و شریعت سب جا کر بیوی ہی بیوی رہ گئیں۔ مسجد میں ہے تو بیوی کی خدمت پیش نظر۔ مدرسہ میں ہے تو بیوی کی صورت آنکھوں کے اندر۔ غرض آٹھوں پہر عابد تھے اور بیوی تھیں۔ ماں کے پاس جانا بھی برائے نام رہ گیا۔ چلتے وقت کھڑے کھڑے گیا دو ایک باتیں کیں اور چل دیا۔ عابد سے زیادہ تو اب سائرہ آکر ساس کے پاس بیٹھتی تھی۔ جس دن سے میاں کی خدمت شروع کی اُسی دن سے یہ بھی معمول مقرر کر لیا اِدھر میاں نے نماز فجر کا سلام پھیرا اُدھر سائرہ ساس کے سلام کو پہنچی۔ میاں کے دل میں بیوی کی طرف سے ایسا گھر ہوا کہ دنیا و مافیہا جو کچھ تھی وہ بیوی۔ عابد اپنے دل میں جو چاہے سمجھا کرے۔ بڑی بی ان پھپڑولالوں میں آنیوالی نہ تھیں۔ سائرہ لاکھ چلتی ہوئی ہو مگر تجربہ بھی کوئی چیز ہے۔ بڑھیا نے دھولا دھوپ میں نہیں کیا تھا پہلے ہی دن کھٹک گئی تھیں کہ خدا خیر کرے۔ بہو کی یہ حالت دیکھ کر بجائے اس کے کہ وہ خوش ہوتیں انکو ایک اَور فکر سوار ہو گیا۔ بڑی بہو سے اُنھوں نے چھوٹتے ہی کہدیا تھا بوا خدا راست لائے۔ بھلا چھوٹی دلہن اور میرے سلام کو آئیں۔ کبھی تو دلہن بینے بیٹی نصیب ہوا نہیں۔ آج چھ بچوں کی ماں ہو کر بڑھاپے میں ساس کی عزت کرنے بیٹھی ہیں۔

عابد اب جو تنخواہ لائے ماں کو دکھانا کیسا خبر بھی نہ کی اور بیوی کو لا کر دے دی۔

تین چار روز بعد ماں نے بھی سُن لیا چپکی ہو گئیں۔ عابد کو چاہے خیال آ بھی جاتا ہو مگر ماں نے مطلق پروا نہ کی۔

تنخواہ کے براہ راست آنے کی سائرہ کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ وہ تو کچھ اور ہی بیڑا اٹھائے ہوئے تھی۔ کیا اور اس ڈھنگ سے کیا کہ پورا کر کے چھوڑا۔ کامیابی ہوئی اور کیسی کامیابی کہ تسمہ نہ لگا رکھا۔

تین ساڑھے تین مہینے تک تو سائرہ اسی رفتار سے چلتی رہی اس کے بعد مبتدا کی خبر نکلنی شروع ہوئی۔ میاں کے سامنے تو ساس کی مطیع و فرمانبردار اور میاں کے پیچھے صورت سے متنفر اور نام سے بیزار۔ ساس کے نزدیک یہ نتیجہ کوئی غیر متوقع نہ تھا ان کو پہلے ہی سے یقین تھا البتہ عابد پھنس گیا۔ ماں نے امر واقعی کا اظہار نہ کیا بیوی نے اپنی کوششوں میں رتی بھر کسر نہ رکھی۔ اس عقلمند کو یقین واثق ہو گیا کہ بیوی دن رات ساس کی خدمت میں لگی رہتی ہے۔

گیدڑ کی شامت آتی ہو تو شہر کی طرف منہ کر کے بھاگتا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا جمعرات کا دن، ساس نے کھڑکی میں آ کر کہا کہ چھوٹی دلہن بیٹی آج شام کو کھانا نہ پکانا گیارہویں کی نیاز دلواؤں گی۔ سائرہ تو عرصہ سے اس موقعہ کی منتظر تھی کوٹھے پر جا دو پیسے کے جمالگوٹے منگوا مٹکے میں گھول دیئے۔ کھانا کھا چکی تو آپ بھی اس میں سے پانی پیا بچوں کو بھی پلایا۔ ایک آدھ گھڑی کے بعد عابد کے سوا گھر بھر کو دست چھوٹ گئے سائرہ کو کچھ تو دستوں کا آنا کچھ کیا بہانا چاروں ہاتھ پاؤں پھیلا چت لیٹ گئی آنکھیں بند کر لیں اور زور زور سے سانس لینا شروع کیا۔ میاں نے پاس آ کر پکارا تو نہایت آہستہ سے کہا:۔

"خبر نہیں چاولوں میں کیا ستم کیا بُری تو میں تھی بچوں بیچاروں نے کیا بگاڑا تھا جو اُنکی بھی جان پر بنا دی۔ اسی واسطے بالکل الگ تھلگ رہتی ہوں۔ کسی کے

لینے میں نہیں دینے میں نہیں۔ آخر میں بھی تو کچھ سوچ کے ہی الگ ہوئی تھی۔ دیکھ لو وہی آگے آیا۔ خیر ہم تو چلے ہی مگر اٰلہی جیسا ہم نے کیا ہمارے آگے جیسا اور دن نے کیا اوروں کے آگے۔ میرا تو خیر کچھ نہیں مگر ہائے ان بچوں کو دنیا کی بہار دیکھنی نصیب ہوتی۔ میرا کہا سنا معاف کرنا۔ ان بچوں کی مٹی کیسی پلید ہوئی۔ کس کی ماں کو ماں کہیں گے"۔

سائرہ نے کچھ ایسی دردناک گفتگو کی کہ عابد کا دل بھر آیا اور لگا چیخیں مار مار کر رونے عابد کی آواز سنکر بڑے گھر میں سے سب دوڑ پڑے۔ ساس کی آواز سنتے ہی سائرہ پھر وہی پلنگ پر چت۔

دست خدا نخواستہ وبائی نہ تھے بدہضمی کے نہ تھے پانچ پانچ سات سات آکر تھم گئے بچے ہلکان ہوکر پڑ رہے۔ سائرہ ہار جھک مار کر سوگئیں۔ عابد رو پیٹ کر لیٹ گئے۔ یہ سب تو چین سے سوگئے مگر بڑی بی بیچاری نے تمام رات جاگ کر کاٹی۔ تھوڑی دیر کے بعد آتیں اور دیکھ جاتیں۔ صبح ہوتے ہی سائرہ لڑکھڑاتی ہوئی ساس کے سلام کو پہنچیں۔ عابد نے کہا ابھی تم سے چلا نہیں جاتا مت جاؤ وہ یہیں آتی ہونگی۔ مگر وہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ میاں کو یہ جواب دے کر چلی گئی۔ میں اپنی طرف سے مرتے دم تک کوئی بات بیجا نہ کرونگی میرا کیا میرے ساتھ اُن کا کیا اُن کے ساتھ۔

ساس پر بہو کا ایسا رعب غالب ہوا تھا کہ صورت دیکھتے ہی خون خشک ہوگیا۔ سائرہ سلام کرکے رخصت ہوئیں اور وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ بیٹے سے کہیں تو کیا کہیں اور بہو کو سمجھائیں تو کیا سمجھائیں۔ بہو کی ریاکاری ساس بیچاری کی جان کو ایسا غم لگا کہ کھانا پینا سب بھلا دیا۔ بھوک تھک گئی۔ نیند اُڑ گئی۔ آرام و اطمینان معدوم عقل و ہوش مفقود۔ ادھر بہو کی اطاعت روز بروز بڑھتی جاتی اُدھر اُنکی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ دائم المراض تو تھیں ہی۔ بیماریوں بھی پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ سائرہ کی فرمانبرداری ایسی ہاتھ دھو کے پیچھے پڑی کہ بڑیاں

ہی ہڈیاں رہ گئیں اندر ہی اندر گھلی جاتی تھیں۔

رات کو چمال گوٹوں کی واردات ہوئی، صبح اُٹھتے ہی میاں نے بیوی کو حکم دیدیا کہ کہ بڑے گھر کی کوئی چیز کسی کے ہاتھ کی کیوں نہ ہو آپ کھانا نہ بچوں کو دینا۔ عابد کا یہ خیال کامیابی سائرہ کی ابتدا تھی۔ مگر ابھی تو پیش خیمہ ہی تھا مطلب اصلی کوسوں دور پڑا تھا۔ عابد بیوی کی محبت میں روز بروز ایسا دیوانہ ہو رہا تھا کہ بڑے گھر کا آنا جانا اس نے قریب قریب بند کر دیا۔

پورے مہینہ بھر کے بعد سائرہ نے ایک اور وار کیا۔ کنبے میں ایک شادی ٹھہری چوری کے بعد جو کچھ باقی بچا تھا وہ ساس زبردستی اپنے ہاں لے گئی تھیں ایک دن جا جہیز کا صندوق کھول چوتھی کا جوڑہ چپکے سے نکال لائی۔ شادی کا دن آیا تو سب جانے کے واسطے تیار ہوئے۔ دونوں جٹھانیاں گہنا پہن چکی تھیں کپڑے بدل رہی تھیں۔ ساس زیور کی صندوقچی ہاتھ میں لئے ہوئے آئیں اور کہنے لگیں۔ چھوٹی دلہن لو جو کچھ لینا ہو لے لو اور کپڑے لتے جو کچھ نکالنے ہوں وہ بھی چل کر نکال لو۔ پھر میں کوٹھری کا قفل لگا دوں۔۔ سائرہ کو جانا منظور ہی نہ تھا۔ صبح سے درد سر کا بہانہ کئے پڑی تھی۔ میاں سے کہنے لگی اچھی تم اتنا کام کرو، میری چوتھی کا جوڑا نکال لاؤ۔ اماں جان بتا دینگی۔ عابد اچھا کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بیوی نے کنجیوں کا گچھا دیا۔ آگے آگے عابد پیچھے پیچھے ماں۔ صندوق کھولا، کپڑوں میں دیکھا تو جوڑا ندارد۔ سب کپڑے الٹ پلٹ کئے جوڑہ ہو تو ملے۔ عابد وہیں کھڑا رہا۔ ساس دوڑی ہوئی بہو کے پاس آئیں۔ پوچھا اے بی تم اُس دن شاید لے آئی ہو کہیں رکھکر تو نہیں بھول گئیں۔

سائرہ۔ بھلا اماں جان آپ کی بھی عقل ہے۔ میں پاگل تھی جو جوڑہ لاکر یہاں ڈالدیتی۔ اسی میں ہے چلئے میں چلوں۔

ساس بہو کو لیکر آئیں۔ بہو صندوق کے کپڑے دو ایک دفعہ اِدھر کے اُدھر نیچے

کے اوپر گر کر اسر پکڑ بیٹھ گئی۔

دس پانچ روپے کی بات ہوتی تو صبر آجاتا۔ تین چار سو روپیہ کا جوڑہ عابد اور ماں دونو کے ہوش اُڑ گئے۔

سائرہ۔ خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا۔ صندوق میں رکھا رکھا جوڑہ کہاں جاسکتا ہے؟ صندوق کھا گیا یا کوٹھری کھا گئی۔ مجھ ہی کمبخت کے جوڑے پر چور پڑنے تھے اور بھی تو سب کا رکھا تھا۔

ساس۔ بیٹی! میری عقل تو کام نہیں کرتی۔ صندوق کی کنجی تمھارے پاس۔ کوٹھری کی میرے پاس۔ صندوق کو کسی اور کی کنجی لگتی نہیں۔ کوٹھری میں سوا میرے کوئی اور آتا جاتا نہیں۔ آج انوکھا صندوق تو رکھا ہی نہیں۔ سینکڑوں چیزیں پڑی ہوئی ہیں۔ کھلی بھی ڈھکی بھی۔ کبھی تنکا بھی ادھر سے اُدھر نہیں ہوا۔ یوں کہو میرا مُنہ کالا ہونا تھا ہو گیا۔

سائرہ۔ میں تو اپنے مُنہ سے کچھ نہیں کہتی۔ آپ کا جو دل چاہے کہے جائیے۔ میری تقدیر کا نہیں تھا نہیں رہا۔ گہنا گیا تو میں نے کسی کا کیا کر لیا۔ رتی رتی حال معلوم ہو گیا مگر بتا دیجے جو آجتک کسی کے مُنہ پر رکھا ہو۔ گہنا لیا اچھا کیا۔ کپڑا لیا اچھا کیا اب ایک دو برتن اور رہ گئے ہیں یہ بھی چلے جائیں تو پاپ کٹے۔

سائرہ یہ کہتی ہوئی باہر نکلی اور روتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد عابد بھی چلدیا۔ ساس خوب سمجھتی تھیں مگر خرابی یہ تھی کہ سمجھتی تھیں اور کہہ نہ سکتی تھیں، جانتی تھیں اور بول نہ سکتی تھیں۔ شادی کی تمام خوشی خاک میں مل گئی۔ جوڑے کا سوگ سوار ہو گیا۔ بہو کی خدمت اچھا روگ پیچھے لگا۔ مُنہ ڈھانک کر چپکے چپکے رونے لگیں۔

سائرہ نے گھر جا کر رونا شروع کیا۔ بیوی کو روتا دیکھ میاں کیوں نہ روتے۔ ماں باپ رو رہے تھے تو پھر بچوں نے کیا خطا کی تھی۔ غرض پندرہ بیس منٹ تک چھوٹے

اور بڑے سب پر رقت طاری رہی۔ آخر میاں عابد اٹھے آپ پانی پیا بیوی کو لاکر پلایا لڑکیوں کے سر پر ہاتھ پھیرا لڑکوں کو چمکارا اور بیوی کی طرف مخاطب ہوئے۔

اب دل بھاری کرنے سے کیا فائدہ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اگر تمھاری تقدیر میں ہے تو خدا اور دیگا۔ حکم الٰہی میں کچھ چارہ نہیں۔ جانے والی چیز ہر طرح جاتی۔ ہزار احتیاط سے رکھتیں لاکھ حفاظت کرتیں سات قفلوں میں رکھتیں پھر بھی جاتی اب خدا سے دعا کرو کہ اور دے۔

سائرہ۔ چوری ہوجاتی تو صبر آجاتا۔ گھر میں سے اور کون لے سکتا ہے۔ کوٹھری کی کنجی اُن کے پاس۔ صندوق کی میرے پاس۔ دیکھ لو میں نے تو گھنٹے تک کا حال تم سے نہ کہا۔ یہانتک سُن لیا کہ آج بکنے جا رہا ہے مگر دم نہ مارا۔ میرے کیا باپ کا تھا جو میں بولتی۔ اپنی چیز ہے چاہے دی چاہے نہ دی۔ یہی سمجھ کر جوڑے کو صبر کر لونگی۔

عابد ناہنجار بیوی مکار کے دام تزویر میں گرفتار ہو کر ماں سے بیزار ہوگیا۔ کھلنے ہی پر بدظن ہوگیا تھا جوڑے کا جانا سمند ناز پر ایک ورتازیانہ ہوا۔ عابد ماں کا جنا تھا، ماں عابد کی جنی نہ تھی۔ بیٹے کے تیور دیکھتے ہی پہچان گئیں کہ یہ مجھ سے برگشتہ ہوگیا۔ مگر انکو پروا کی ضرورت تھی۔ نہ کی۔ وہ عابد کی محتاج نہ تھیں عابد کے در پر نہ تھیں۔ عابد کی روٹی پر نہ تھیں۔ عابد کی اطاعت خدمت جو کچھ تھی اپنی عاقبت کی درستی تھی اُن پر احسان نہ تھا دنیا تعریف کرتی تھی سُننے والے خوش ہوتے تھے، دیکھنے والے بھلا کہتے تھے، ماں کے دل سے دُعائیں نکلتی تھیں۔ کمبخت اگر اُن ہی اطوار پر قائم رہتا اور اسی رفتار سے چلے جاتا تو ماں کی زندگی کونسی سیکڑوں ہزاروں برس کی تھی۔ برس دو برس کا عذاب اور سمجھ لیتا۔ ایسا ہی تھا تو دل میں رکھتا۔ ماں بیچاری لینے میں نہیں۔ دینے میں نہیں۔ روپیہ کی متوقع نہیں۔ خدمت کی خواستگار نہیں میٹھی زبان کی خواہشمند تھیں۔ فرمانبرداری کرتا اپنا بھلا کرتا دعا پاتا پھلتا پھولتا سعادتمند کہلاتا۔ منحرف ہوا

اُن کا کیا لیا اپنا کچھ کھویا۔ دنیا میں نکو بنا خدا کا گنہگار رہوا۔

اس واقعہ کا دسواں یا شاید گیارہواں روز ہوگا کہ سائرہ کو ایک موقع اور ملا۔ بچہ بڑے گھر میں بیٹھا کھیل رہا تھا پھوپی کے پاؤں کی چوڑیاں چاندوار ہاتھ میں تھیں دادی نے کہا بیٹا انہی چوڑیاں ہیں مٹی جم جائے گی وہ بیگم نہانے کیا گئیں وہیں مرگئیں۔لا چوڑیاں رکھدے۔لڑکا کس ماں کا بیٹا تھا اسی طرح لڑکا تا رہا۔اتفاق سے جوڑ کھل گیا۔دادی نے اُٹھکر زبردستی چھین لیں۔بچہ روتا ہوا گھر میں چلا گیا اور زمین میں لوٹنے لگا۔ چیخ پیٹ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔رودھو کر چپ ہوگیا۔بات گئی گذری ہوئی۔رات کو کہیں بچے کو بخار چڑھ آیا۔

جب سے یہ پلونٹی کا لڑکا مرا تھا عابد کی یہ کیفیت تھی کہ ذرا کسی بچہ کا بنڈا گرم ہوا اور اسکی جان پر بنی۔بیخبر پڑا سوتا تھا بیوی نے جگاکر کہا ذرا ہوشیار تو ہو۔دیکھو لڑکے کو کس ظلم کا بخار چڑھا ہے۔بخار کا نام سُنتے ہی عابد گھبرا کر اُٹھ بیٹھا بیوی سے کہنے لگا:۔ مغرب تک سنگھاڑے کھاتا پھرا ہے میں نے تم کو کتنا منع کیا کہ ثقیل ہوتے ہیں۔زیادہ نہ دو۔تم نے مطلق نہ سُنا اُسی سے بخار چڑھا۔

سائرہ۔اے ہے میرا مُنہ نہ کھلواؤ۔بچہ پڑ گیا۔خیر اللہ کا حکم ہوگا بخار اُتر جائیگا۔ نہیں مرضی خدا کی۔ابھی سچی بات کہدوں تو دیکھو گے کئے گھر لڑائیاں پھیلتی ہیں۔

عابد۔آخر بتاؤ تو سہی بخار تو ایسی چیز نہیں ہے جو کسی کے اختیار میں ہو۔

سائرہ۔خیر نہیں سہی۔

عابد۔تو بتانے میں کیا نقصان ہے۔

سائرہ۔کیا بتاؤں کچھ نہیں۔

عابد۔پھر کہا کیوں تھا؟

سائرہ۔میرا دل آپ ٹھیک نہیں ہے میرے سر کیوں ہوئے۔کرتہ اٹھا کر دیکھ لو۔

بدّھیوں کے نشان موجود ہیں یا نہیں۔ میری تو صبح ہی سے سہموں میں جان جا رہی تھی اسکو بھلا ایک انگلی کی تو برداشت ہے ہی نہیں پنکھے سے لیکر سوت دیا۔

عابد۔ ہوا کیا تھا کس بات پر مارا ؟

سائرہ۔ ہوتا کیا ایک ذرا جوڑیوں سے کھیل رہا تھا۔ اُنھوں نے مانگیں اس نے دی نہیں۔ جوڑ پہلے کا کھلا ہوا تھا نام اس کا ہو گیا۔ خیر چھین لیں اچھا کیا مگر مارنے کی کیا بات تھی۔ اگر مارنا بھی تھا تو تھپڑ دو تھپڑ یا دے پنکھے کہ تمام کمر نیلی ہو گئی۔

عابد۔ تم نے جا کر کچھ کہا نہیں ؟

سائرہ۔ میں جا کر کیا کہتی۔ مجھ سے تو بڑی بی نے آکر کہا "بیوی تم بچے کو کیوں جانے دیا کرتی ہو۔ دشمن کے بچے کو بھی تو اس بیدردی سے نہیں مارتے۔" وہ کہہ رہی تھیں جو یہ بلکتا ہوا آیا۔

عابد۔ ٹھہرو۔ میں ابھی جا کر کہتا ہوں۔

سائرہ۔ نہیں خدا کی قسم ایسا غضب نہ کرنا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اگر تم نے مُنہ سے بھاپ بھی نکالی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔

دو معاملوں کا تو ساس کو علم بھی ہو گیا۔ اس تیسرے کی خبر تک نہ ہوئی بچے کو بخار نفصلی تھا۔ صبح تک اُتر اُترا گیا مگر عابد ماں کی طرف سے دل میں بخار لے بیٹھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اٹھواڑوں بڑے گھر میں جا کر نہ پھرتا۔ بیوی کی بدولت ماں صورت کو بھی ترس گئی۔ اُن کے آنے کا جو وقت مقرر تھا اس سے پہلے جان کر ٹل جاتا کبھی خلاف معمول آگئیں تو چھوٹے ہی گھر میں ٹُٹ بھیڑ ہو گئی۔ اگر پہلے سے دیکھ لیا کہ آرہی ہیں تو اُٹھ کر چلدیا۔ لاعلمی ہی میں سر پر آپہنچیں تو مُنہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ ماں نے بے غیرت بن کر کوئی بات کی تو جواب اس طرح دیا گویا کاٹ کھانے کو دوڑا۔ عابد کی یہ حالت دیکھ کر ماں نے بات کرنی چھوڑ دی اور زیادہ لاپروائی دیکھی تو آنا بھی چھوڑا۔

میاں کو اس حد تک یقین دلانے کے بعد جب سائرہ کے ارادے پورے، کوششیں کامیاب، مرادیں حاصل ہوگئیں تو وہ عارضی رنگ و روغن اُترنے لگا۔ سب سے پہلے ساس کی اطاعت پر لعنت بھیجی، مگر میاں کی نمائشی ٹیپ ٹاپ ابھی بدستور رہی۔

سائرہ نے ان تین چار مہینوں میں جس قدر خاوند کی خدمت کی اگر اس میں مکر وریا شامل نہ ہوتا اور اس کا مقصد اس قدر خوفناک نہ ہوتا تو بلاشبہ اس کی اطاعت تمام شکایتوں پر حاوی ہو جاتی مگر وہ تو جو کچھ کر رہی تھی اوپری دل سے۔ اس لئے سب کیا کرایا مٹی تھا۔

اس عرصہ میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوا ہو تو ہوا ہو جو سائرہ نے اپنے تئیں تندرست بتایا ہو۔ روز صبح ہوئی اور ایک شکایت موجود۔ میاں مدرسے سے واپس آیا، بیوی کسی نہ کسی مرض میں گرفتار۔ مگر بیماری جو آئی اندرونی آئی۔ بخار کبھی نہ چڑھا کہ دیکھنے والوں کو بھی یقین آجاتا۔ امراض کا زیادہ تر حصہ متفرق مقامات کے درد میں منقسم تھا۔ تڑپتی اور اتنا تڑپتی کہ بعض اوقات بیہوش ہو جاتی۔

عابد کی آنکھوں پر ایسے غفلت کے پردے پڑے تھے کہ بیوی کے دوامی مریض ہونے سے محبت میں اور ترقی ہوگئی۔ روپے روپے آٹھ آٹھ آنے کے نسخے آتے۔ کس کا پینا کس کا پلانا۔ میاں نے اُدھر منہ موڑا۔ بیوی نے اٹھایا اور کوڑے پر پھینک دیا۔ عابد کی کمائی میں آٹھ دس روپیہ مہینہ عطاروں کا تھا وہ ہر طرح جاتا اس سے کوئی پوچھتا تو بلا تامل قسم کھا لیتا کہ بیوی دن رات میں مسا کر کے آدھ پاؤ اناج کھاتی ہوگی۔ حالانکہ تر بتر گھی کے چار پراٹھے اس طرح پکتے کہ بچوں تک کو خبر نہ ہوتی۔ دو سیر دودھ بچوں کے نام سے صبح کو آتا دن بھر جوش کھاتا رات کو جب پاؤ ڈیڑھ پاؤ کے قریب رہ جاتا تو دوائی کہہ کر بیوی نوش فرماتیں۔

سائرہ کو ایک چھوٹا سا موقعہ اور ملا ساس کے ہاں محرم اور کھیر کی قلفیاں

آئیں۔ سینی کی سینی یونہی اٹھاکر ساس کے ہاں بھجوادی اُنھوں نے اس وقت تو رکھ لی۔ دو پیسہ مزدوری کے دیدیئے۔ لانیوالی چلی گئی تو سینی ساتھ لیکر بہو کے پاس آئیں اور کہنے لگیں بیٹی! میں اتنی کیا کرونگی۔ مجھ کو ایک بہت ہے میں نے لے لی۔ تم اللہ رکھے اپنے گھر میں بانٹو بچوں کو کھلاؤ۔

اب یہ خدا جانے کہ لانیوالی کے ہاتھ سے۔ سائرہ سے کسی بچے سے یا ساس سے ایک قلفی ٹوٹ گئی۔ یہی ٹوٹی قلفی سائرہ نے شام کو میاں کے آگے رکھدی۔ عابد نے ایک ہی چمچہ کھایا تھاکہ تمام مُنہ میں کرکراہٹ ہونے لگی۔ بیوی سے یہ پوچھاکہ یہ کھیر کہاں سے آئی ہے۔ برابر کی خاک ملی ہوئی ہے۔

بیوی۔ اماں نے بھیجی تھیں میں نے اسی طرح اماں جان کے پاس بھیجدیں۔ تیرہ چودہ برس میرے بیاہ کو ہوئے بتادیں آج کی گھڑی تک کوئی چیز آپ رکھی ہو۔ وہ یہاں لاکر پھینک گئیں اور جو مُنہ میں آیا کہتی رہیں۔ میں تو درد میں پڑی تھی۔ خدا کی قسم یہ بھی نہیں دیکھا کہ آئیں۔ اس بیوقوف کو دیکھو۔ وہ تو بگڑ رہی ہیں اُن سے کہتی ہے دادی اماں تھوڑی سی بھونسی بھیجدو، حکیم جی نے ٹکور بتائی ہے۔ اُنھوں نے جواب بھی نہ دیا۔

یہ سائرہ کی سب سے آخر کوشش تھی جو پوری کارگر ہوئی۔ عابد کا دل ماں کی طرف سے ہٹتا چلا ہی جارہا تھا جو کچھ تھوڑی بہت گنجائش باقی تھی وہ بھی ختم ہوئی۔ بغاوت کا بخار جو اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا ہلا کر چڑھ آیا اور اُس نے بڑے گھر کی آمدورفت قطعًا بند کردی۔

ساس کی وقعت بہو کی نگاہ میں جب میاں بات بھی نہ پوچھتے تھے لونڈیوں سے بدتر تھی اب تو میاں پلے پڑے تھے جو کچھ نہ کرتی وہ تھوڑا۔ روسیاہ نملانیہ اُن بے گناہ کو ایسی باتیں کہتی تھی کہ سُننے والے پناہ مانگتے تھے کیسے کیسے بہتان جن کا سر نہ پیر

کیسے کیسے الزام جو دیکھے نہ سنے اور کیسے کیسے کوسنے کہ الامان الحفیظ۔

عابد کے ہاتھوں یہ صدمہ آخر وقت میں ماں کو ایسا پہنچا کہ بالکل ہی پڑا کر دیا۔ بخار چڑھا ہوا ہی آنکھ سے زار قطار آنسو بہ رہے ہیں الگ کونے میں پڑی ہوئی ہیں اور سائرہ کمبخت ناہنجار گستاخ مردار کھڑی باتیں بنا رہی ہیں۔

جزاک اللہ سائرہ کی ساس کو۔ بہو نے یہ کچھ اذیت دی مگر کیا مجال جو کبھی بیٹے سے شکایت کا خیال بھی کیا ہو۔ اس فریادی کی صاحبزادے کے اجلاس سے جسقدر داد ملتی وہ تو ظاہر ہے مگر کچھ تو کوشش کرتیں کہ ان آفتوں سے رہائی پاؤں لیکن نہیں آپ سب کچھ منظور کیا۔ بہو کے برخلاف آج کیا کبھی اور بیٹے کے آئے کیا کسی کے آگے ایک لفظ زبان پر نہ لائیں۔

یہ سائرہ کی محض حماقت و نادانی تھی کہ اس نے ساس سے عداوت رکھی اور اُن کو دشمن سمجھا۔ ساس اگر چاہتیں تو عابد بیوی کے گھر میں جا کر جھانکتا بھی نہیں۔ سب سلوک و اتفاق طاق میں رکھا رہ جاتا مگر وہ ہمیشہ یہی کہتی رہیں کہ میں نا اتفاقی کے لیئے تھوڑی لائی ہوں۔ میری زندگی چار دن کی ہے میں نے کیوں ایسا کام کیا کہ یہاں بھی بدنام ہوئی اور وہاں کا بھی عذاب لیا۔ میری تو جس طرح کٹنی ہے کٹ ہی جائے گی۔ ان دونوں میں پیار و اخلاص رہے کہ عمریں پار کرنی ہیں۔

عابد کی مولویت ملّانیت علمیت عقیدت جو کچھ تھی مفلسی ہی تک کی تھی۔ گھر میں فاقہ تھا تو سو بیوقوفوں کے بیوقوف تھے۔ چار پیسے پاس ہوئے تو حکیم سقراط کے بھی کان کترنے لگے۔ جس شخص کو لوگ گونگا کہا کرتے تھے اب وہ اس طرح بڑھ بڑھ کے بولتا تھا کہ جو سنتا تھا وہ تعجب سے۔ ۔ رجو دیکھتا تھا وہ حیرت سے۔ عقیل ہوئے۔ فہیم ہوئے۔ سنجیدہ ہوئے، ہوشیار ہوئے۔ ذہین ہوئے۔ متین ہوئے۔ پھر شوقین کیوں نہ ہوتے۔ یا تو بارہ مہینے جاڑا ہو یا گرمی سر ہے کہ چھلا ہوا کسیرو رکھا ہی یا اب بال رہنے لگے۔ دوسرے

تیسرے تیل بھی پڑنے لگا۔ تیسرے چوتھے کنگھی بھی ہونے لگی۔ کرتوں میں کف ہونے لگے۔ موریاں ٹخنوں سے نیچے ہونے لگیں۔ جوتی یا تو ادھوڑی استر کہ ایک دفعہ پہن لی تو دو برس کو فارغ ہوئے یا گول پنجہ سے سلیم شاہی ہوئی۔ سلیم شاہی سے گرگابی ہوئی گرگابی سے بوٹ ہوا۔

جب عابد جیسا میاں از سر نو جوان ہوگیا تو سائرہ جیسی بیوی جس کے دل میں خواہش دار مان کا خزانہ بھرا پڑا تھا کیا کچھ نہ ہوتی۔ ماں کا سایہ مرنے کے بعد سر سے اُٹھتا مگر سائرہ نے ساس کو اتنا تنگ کیا کہ انھوں نے جیتے ہی جی بہو کے ساتھ بیٹے سے بھی ہاتھ اُٹھا یا عابد آزاد ہوگئے سائرہ کھل کھیلیں۔ صبح اٹھی صابون سے مُنہ ہاتھ دھویا کنگھی چوٹی سے فرصت پاکر ناشتہ کیا۔ کچی چکن کا گھٹنوں تک کا ڈھیلا کرتہ۔ کنویز کی صدری، ساز لگا ہوا گھڑی پڑی ہوئی۔ساٹن کا تنگ چست آڑا پائجامہ بنی سنوری اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب مرحوم کا گھر تو گھر شاید بیوی بھی عمر بھر میں ایک آدھ دفعہ کرسی پر بیٹھی ہوں گی۔ تقدیر کی کیا خبر تھی کہ بہو بیگم کے ہاتھوں سب کرم پورے ہونگے۔ کھلی نہیں بیسن نہیں آنولے نہیں ریٹھے نہیں۔ مُنہ دھوئنگی وہ صابون سے سر دھوئیگی وہ صابون سے۔ جوتی پہنے گی تو وارنش کی۔ میاں نے ڈھیلی ڈوری چھوڑی۔ ساس نے بات کرنی چھوڑی۔ جٹھانیوں نے آنا چھوڑا مگر سائرہ نے اپنے کوتک نہ چھوڑے۔ جو جو کچھ کر سکتی تھی سب ہی کچھ کیا۔ گرمیوں میں ساڑھیاں باندھیں۔ جاڑوں میں گلو بند باندھے، ہاتھوں میں گھڑیاں، پاؤں میں گیٹس۔ غرض جو کیا ایسا کیا کہ تمام دنیا میں نام روشن ہوگیا۔

(۴۵)

عابد کی ماں اِدھر تو بڑھاپا اُدھر آئے دن کی بیمار۔ صاحبزادے برخوردار کے یہ کوتک بہو سلیقہ شعار کے یہ گُن۔ بخار نکالنے کا موقعہ ملا نہیں۔ غصہ کا اظہار کردیتیں کچھ نہ ہوتا

بھڑاس تو نکل جاتی۔ اندر ہی اندر جلتے جلتے اور گھلتے گھلتے چارپائی سے لگ گئیں۔ مگر لعنت ہے خدا کی کمبخت عابد پر۔ ماں کی یہ کیفیت ہو گئی اور نمک حرام جاکر نہ پھرا۔ رات کے وقت ایک دن ادھر تو کھائی گوبی بادی۔ اوپر سے شلجم کا اچار۔ ٹھنڈا برف کھانا تھا کہ سسکیاں لینے لگیں۔ عابد کو جانا اب بھی نصیب نہ ہوا۔ کام تو تمام ہو ہی چکا تھا مگر ابھی بڑی بی کی قسمت میں اور تھوڑے دن دنیا کا عذاب بھگتنا تھا۔ صبح تک لوٹ پیٹ کر ٹھیک ہو گئیں۔ ہوش آیا تو ایک اور صدمہ بیٹھا۔ دور دور کے رشتہ دار مرد اور عورتیں سب ہی عیادت کو آئے مگر نہ آیا تو پیٹ کا بیٹا اور سگی بہو۔ اب البتہ برداشت نہ کر سکیں۔ چھوٹی بیٹی کو بھیج کر (جو اب دو بچوں کی ماں تھی) عابد کو بلوایا۔ بہن نے ادھر اُدھر دیکھا کہیں نظر نہ آیا۔ سائرہ سے کہا:۔

بھابی جان چھوٹے بھائی کو اماں جان بلا رہی ہیں۔

سائرہ۔ پھر بلا رہی ہیں تو لیجاؤ میں نے کیا ٹانگ باندھ رکھی ہے۔

نند۔ بھلا بی میں نے کیا کیا۔ انھوں نے بھیجا میں آگئی۔ بات کرتی ہو کاٹنے کو دوڑتی ہو۔

سائرہ۔ بوا اور جو تمھارا دل چاہے کہہ جاؤ۔ لیتیا بناؤ۔ گدھی بناؤ۔ نند ہو ہنسی ٹھٹھا تھوڑی ہے۔

عابد (پاخانہ میں سے) بھاگ جاؤ یہاں سے کہدو نہیں آتے۔

بہن بڑبڑاتی ہوئی گھر چلی آئی۔ عابد کھانا کھا کر مدرسہ چلدیئے۔ تیسرے پہر واپس آرہا تھا۔ اتفاق سے بڑی بھاوج ڈولی میں سے اُتر رہی تھی۔ دیور کو دیکھ کر پاس بلایا اور باتیں کرتی ہوئی اندر لائی۔ عابد آئے تو سہی مگر سوجے اور پھولے ہوئے۔ ماں کے دل میں پہلے ہی برسوں کا غبار بھرا ہوا تھا۔ عابد کو پھولا ہوا دیکھ کر اور بھی آگ بگولا ہو گئیں۔ ابھی کچھ بولنے نہ پایا تھا کہ ماں نے کہا:۔

بٹیا! اسی دن کے لیئے تم کو پال پوس کر جوان کیا تھا کہ ہم کو دشمن سمجھو۔ عابد میاں ہم نے اسی واسطے تمھاری خدمت کی تھی کہ غیر جبر کو آئیں اور تم دیوار بیچ بیٹھے رہو۔ اسی لیئے تمھاری اللہ آمین کی تھی کہ مہینوں تمھاری صورت کو ترسیں۔ دروازے سے دروازہ ملا ہوا اور تم کو دم بھر کے آنے کی فرصت نہیں۔ اللہ تم کو اس سے زیادہ ثروت دے۔ دولت ہو جاتی ہے تو کیا ماؤں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ تمھارے پیسہ کی طلبگار نہیں۔ تمھاری صورت کی بھوکی ہوں۔ تمھاری یہ کیفیت کہ میری شکل سے بیزار۔ لڑائی پر آمادہ۔ فضیحتے پر تیار۔ جو کہیں تمھارے در پر آ پڑتی تو کتّے کے ٹھیکرے میں پانی پلا دیتے۔ میاں وہ خدمت اور اطاعت کہاں گئی۔ اسی واسطے شادی کروائی تھی کہ ماں کے منہ کو آگ لگاؤ۔ باپ مر کر چھوٹے۔ اماں کو جیتے جی چھوڑا۔ میں نے کیا گناہ کیا۔ بہو کی شان میں کیا گستاخی کی۔ تمھاری جناب میں کیا قصور کیا جو سزاوار ہو گئی۔ اللہ اللہ میاں عابد! حفیظہ تم کو بلانے جائے اور تم گھرک کر نکال دو۔ بیوی کی محبت ایسی غالب ہوئی کہ ماں بہنیں سب پاؤں کی جوتی ہو گئیں۔ سدا دنیا میں رہنا نہیں ہے خدا کے ہاں کیا منہ دکھاؤ گے۔ اللہ رکھے اپنے آگے بھی بچے ہیں۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھکر دیکھو ہم نے بھی اسی طرح خدمت کی ہے۔ رات بھر جاگ کر صبح کی اور دن بھر ایک ٹانگ سے لیئے پھری ہوں۔ جب یہ صورت دیکھنی نصیب ہوئی ہے۔ میں تو جس طرح ہوگا اپنی زندگی پوری کر ہی جاؤنگی مگر تم اپنی کہو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔ دنیا کیا جنم میں تھوک رہی ہے۔ میری تو مامتا ہے جس وقت سامنے آ کھڑے ہوگے چھاتی سے لگا لونگی مگر خلق کا حلق تھوڑی بند کر سکتی ہوں۔ میری زندگی کو غنیمت سمجھو۔ مر جاؤنگی تو سر پر ہاتھ رکھکر روؤ گے۔ میری آج کی بات یاد رکھنا۔ یہ میرا ہی دم ہے جو الگ گھر کیئے چین سے بیٹھے ہو۔ میری آنکھ بند ہوئی تو کوئی بات بھی نہ پوچھیگا۔ یہ میری ہی دعا کا اثر ہے کہ لالوں کے لال بنے ہوئے ہو۔ تم نے اتنا کچھ کیا اور میں برداشت کرتی رہی

آج مجبور ہو کر زبان سے نکالا ہے مگر اب کہے دیتی ہوں۔ عابد! میرا کلیجہ پک گیا۔ میری آہ نہ لو۔ دین و دنیا دونوں سے جاتے رہو گے۔ تم ہم سے بیٹھے بے قصور ایسے فرنٹ ہو گئے ہم کو دیکھو تمھاری خفگیاں سُنیں، تمھارا غصہ اُٹھائیں اور تمھارے پھانس لگ جائے تو بے چین ہو جائیں۔ بیٹا! وہ وقت یاد کرو۔ جب لاچار گود میں پڑے تھے۔ آج جوان ہو کر فرنٹ۔ خیر میاں عابد! خوش رہو آباد رہو۔

عابد کا منہ ہی کیا تھا جو ماں کی بات کا جواب دے سکتا۔ چپکا اُٹھ چلا آیا۔ بیوی سے باتیں کر رہا تھا کہ سردی لگنی شروع ہوئی بخار چڑھ آیا، سینے میں درد ہونے لگا۔ گھنٹہ ہی بھر میں درد نے یہ کیفیت کر دی کہ ہاتھ پاؤں بالکل سرد ہو گئے۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ ماں کے سنتے ہی حواس جاتے رہے۔ دوڑی ہوئی آئیں۔ یہاں آ کر دیکھا تو بہو بیٹھی شلجم کے اچار سے ارہر کی کھچڑی کھا رہی تھیں اور بیٹا پڑا ہائے ہائے کر رہا تھا اپنے ہاں سے لا کر کوئلے سلگائے، کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر روئی نکالا۔ اندھیرے میں ایک جگہ ٹکر کھا کر گر بھی پڑیں۔ مگر اس ماتا کمبخت کے آگے کچھ بھی نہ معلوم ہوا۔ بیٹھی سینکتی رہیں۔ کہیں بارہ بجے جا کر ذرا درد ہلکا ہوا۔ سائرہ اور بچے تو کبھی کے پڑ کر سو گئے تھے۔ درد تھما تو عابد کی آنکھ بھی لگ گئی مگر ماں بیچاری بیٹھی کوئلے دہکاتی رہیں۔ صبح کا ایک پھلکا کھائے ہوئے تھیں چل نہیں سکتی تھیں پھر نہیں سکتی تھیں مگر خدا جانے اس وقت اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ عابد کی پٹی پر بیٹھ کر تمام رات گزار دی۔

صبح اُٹھ کر پھر وہی بیوی اور وہی میاں۔ اماں وہی دشمن کی دشمن۔

(۴۶)

عابد مدرسہ میں نوکر ہوتے ہی نیم مُردہ ہو گئے تھے پروفیسر ہوتا تھا کہ پورے ہی مسٹر ہو گئے۔ وہ عابد کہ اگر بان میں ایک پھول تو درکنار روے کا ہاتھ لگ جائے

تو گھنٹوں اُبکائیاں لیتا پھرے دہڑتے سے سگریٹ اور سگار اُڑاتا۔ وہ شخص جو دن رات قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا بخاری اور مشکوٰۃ کے بعض مقامات پر شبہ کرنے لگا (نعوذ باللہ) نوبت یہاں تک پہنچی کہ نماز بھی پنجگانہ سے سہ گانہ رہ گئی۔ وہ بھی گھر میں جماعت سے نہیں۔ جن باتوں کو پہلے فرض و مستحب سمجھتا تھا اب اُن کو فروعات و مکروہات بتانے لگا۔ قیاس کا پچھلا ایسا لگا کہ احادیث صحیحہ کو ضعیف و کمزور سمجھا۔ شدہ شدہ یہ خبر تمام شہر میں مشہور ہوگئی۔ جو لوگ عابد کو اصلح و اسعد عالم و فاضل قابل و معقول نیک اور بھلا مانس سمجھتے تھے صورت سے تنفر اور صحبت سے گریز کرنے لگے۔

اس وقت عابد کی بڑی لڑکی تیرھویں بلکہ چودھویں برس میں تھی۔ دادی نے آپس کا ایک لڑکا جس کی ہر حالت ہر اعتبار سے بہت مناسب تھی۔ شادی کے واسطے تجویز کیا۔ (کہنا چاہیئے تو نہیں مگر کہنا پڑا یہ اُن کی غلطی تھی کہ بیٹے اور بہو کی بلا اجازت لڑکے والوں سے ہاں کرلی) عابد سے استفسار نہیں کیا بلکہ عابد کو اطلاع دیدی کہ میں نے لڑکی کی بات ٹھہرادی ہے۔ لڑکا ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ پڑھا لکھا غریب، نیک، پچیس روپے مہینہ کا کرایہ اس کے نام الگ ہے۔ میں تو جانوں جمعرات کو نکاح ہوجائے وداع ہوتی رہیگی۔

سائرہ۔ میں تو اُن کے ہاں مرکر بھی نہ دونگی۔ اچھی جگہ ٹھہرائی، وہ موئے کنجوس ملّانے، ست پچھڑے بہو کی کیا قدر جانیں۔ بڑی تو پہلے ہی بیٹھی نصیبوں کو جھیک رہی ہے۔ چھوٹی کو لاکر جدا ہی نہال کرینگے۔ خالہ جہانرا (جہان آرا) بیچاری نے دوہرے گہنے سے بیٹی کو رخصت کیا۔ جڑاؤ الگ سادہ الگ۔ برس کے اندر ہی اندر سب بیچ کر کھاگئے۔ تانبے کا تار بھی نہ رہا۔ زاہد کے بیاہ میں آئی تو تھیں۔ ڈوب مریں وہ ساس انھیں شرم نہ آئی اپنے کانوں میں تو جھپکے کے بالے۔ بہو کے کانوں میں ڈھنگ کے پتے بھی نہیں میں کیا سُن نہیں چکی، دیکھ نہیں چکی لونڈیوں سے بدتر بہو کا ہڈ را کر رکھا ہے۔

سو سیوں کے پاجامے دو دو گز کی اوڑھنیاں کھلا جوتی چیتھڑا کرتہ اُٹھتے جوتی بیٹھتے لات صبح چار بجے کی اٹھی دن بھر کولھو کے بیل کی طرح پھرتی ہو مگر جب سنو بُرا۔ ساس ہیں اُن کا مزاج نہیں ملتا۔ سسر ہیں اُنکے بھاویں نہیں۔ میاں ہیں وہ بغیر مردار کے بات نہیں کرتے۔ دن بھر ساس سسروں کی خدمت کرے۔ رات بھر میاں کے پیر دباوے۔ بہو کیا بے داموں کی لونڈی ہوگئی۔ ساس جن جن کے پھینکتی جائیں۔ بہو بچوں کو پالتی جائے میں تو زہر دیدوں اور اُن کے ہاں نہ دوں۔

عابد۔ آپ کی عقل ذرا بڑھاپے میں سٹھیا گئی ہے یا کچھ پوتی سے دشمنی ہو۔ ابھی تو میں جیتا بیٹھا ہوں مر تو نہیں گیا۔ مجھ کو آپ سے زیادہ فکر ہے آپ فکر نہ کیجیے میں آپ کر لونگا۔

ساس نے بہو کی گفتگو اور بیٹے کا یہ کلمہ سنکر جواب تو کیسا کیا مجال جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا ہو اُٹھکر اپنے ہاں چلی آئیں۔ تقدیر کی بدنامی بھی ہوئی کینے میں جھوٹا بنتا تھا بنیں۔ جیسا کیا ویسا پایا نہ پرائی اولاد کو اپنا سمجھتیں نہ یہ نوبت آتی۔

(۴۷)

میاں عابد نے جہاں اور خاک اُڑائی وہاں ناظم بھی بنے ناثر بھی بنے مہینے کے مہینے مشاعرہ ہوتا تھا۔ برس میں ایک آدھ ناول بھی لکھ لیتے تھے۔ احباب کی تجویز سے ایک عظیم الشان مشاعرہ تجویز ہوا۔ بڑے بڑے شعرا مدعو ہوئے۔ عابد کے ذی علم ہونے میں ہم کو مطلق کلام نہیں غزل لکھی اور بہت اچھی لکھی۔ طرح تھی۔ ع:-

شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

طرح شگفتہ محنت کی لکھی ہوئی غزل ہر شخص سے داد چاہتا تھا۔ حالانکہ ابھی مشاعرہ میں آٹھ دس روز باقی تھے مگر تمام شہر میں غزل کی شہرت ہوگئی۔ عابد کو کچھ ایسا خبط سوار ہوا کہ کہیں ہو اور کسی حال میں ہو۔ جس سے ملا دوست ہو، عزیز ہو جان پہچان ہو نہ ہو۔ سمجھدار ہو بیوقوف ہو۔ نہ تجھے سلام علیک کی اور غزل شروع کردی۔

وہی میر صاحب (بڑے میاں) جو بازیافت تنخواہ کا ذریعہ ہوئے تھے اور عابد ہی کو نہیں بلکہ مولوی صاحب کے تینوں لڑکوں کو اپنے لڑکوں سے سوا سمجھتے تھے۔ مدرسہ کی ملازمت میں گو وہ وجہ کامیابی نہ ہوں۔ مگر مشیر و صلاح کار وہی تھے۔ انھوں ہی نے عابد کو دوبارہ آمادہ کیا ورنہ وہ تو کنارہ کش ہو ہی چکا تھا۔ اب عابد کے حالات سُن سُن کر انگاروں پر لوٹتے تھے۔ حالانکہ اس نے اُن کے پاس آنا جانا قطعاً ترک کر دیا تھا۔ مگر میر صاحب کا گھر کون سے ہزاروں کوس تھا۔ دو چھوڑ تیسرا گھر میر صاحب کا۔ دم دم کی خبر پہنچتی تھی۔ دو تین دفعہ سمجھانے کا ارادہ بھی کیا۔ کئی دفعہ مُٹ بھیڑ بھی ہوئی مگر کچھ ایسی نفرت سی ہوئی کہ مُنہ پھیر کر چلے گئے۔

عابد تو نشۂ غزل میں سرشار ہو ہی رہا تھا ظہر کی نماز کے بعد میر صاحب بیٹھے تلاوت کر رہے تھے کہ عابد ٹخنوں تک بوٹ پہنے ہوئے ننگے سر ہاتھ میں سگریٹ، عینک لگی ہوئی، غزل لیئے ہوئے چرچراتا پہنچا۔ میر صاحب لاحول پڑھ کر تلاوت میں مصروف ہو گئے۔

عابد۔ ذرا اس غزل کو ملاحظہ فرمائیے۔ دیکھئے کس محنت سے لکھی ہے۔ اور اس صنعت کو دیکھئے کہ عشق حقیقی اور مجازی دونوں کھپا دیئے۔

میر صاحب۔ بہتر ہوگا کہ آپ مجھ سے زیادہ گفتگو نہ کریں۔ ممکن ہے میری کوئی بات ناگوار خاطر ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ آپکی اس غزل کو سُنکر تضیع اوقات کروں۔

عابد۔ تعجب ہے کہ آپ کو مضامین سے بالکل لگاؤ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سخنور بالکل ناپید ہو گئے۔ ایک شخص تو محنت و مصیبت اٹھا کر خون جگر کھا کر کچھ لکھے اور دوسرے بجائے قدر دانی کے اس کی جانفشانی کو انگشت نما کریں اسکو مطعون کریں۔ اگر آپ ذرا اوراق تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ شعر کیا چیز ہے اور اس نے کس کس وقت کس کس کے ساتھ کیا کیا کام کیا ہے۔ کوئی زمانہ کوئی ملک کوئی قوم اس سے

محروم نہیں۔ایک وہ وقت تھا کہ شاعر کے عیوب بھی مستحسن سمجھے جاتے تھے۔ایک آج کا دن ہے کہ آپ میری غزل کا سُننا "تضیع اوقات" فرماتے ہیں۔شاعری ایک ملکہ خداداد ہے جو اکتساب کے بس کا نہیں۔سچ پوچھئے تو شاعری ذریعۂ قرب الٰہی ہے جو نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے اخلاق ذمیمہ کی اصلاح کرنے والی چیز ہے۔اگر سلف سے آجتک ایسی ہی ناقدری ہوتی تو آج بائرن، ملٹن، شیکسپیر، ہومر، سروالٹر سکوٹ، رودکی، فردوسی، حافظ، سعدی، انوری، خاقانی، ظہیر، فاریابی وغیرہ کا کوئی نام بھی نہ جانتا۔ان بزرگواروں نے جس قدر ملک و قوم کی خدمت کی اور فائدہ پہنچایا وہ نہاں نہیں مگر اُسکی وجہ کیا تھی صرف یہ کہ لوگ تعریف کرتے تھے۔دل بڑھاتے تھے چلئے دنیاوی معاملات کو جانے دیجئے حقیقت و معرفت کی طرف آئیے۔خوض و فکر محنت و مصیبت عشق و محبت کا ایک حمد و نعت کا شعر پچاس برس کی عبادت پر سبقت لیجاتا ہے۔نمازی کی نماز وہ بھی اگر صمیم قلب سے ہو ادا اُسکی فرض ہے، لیکن شاعر اپنے شعر کے ذریعہ سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں لاکھوں بندگان خدا کے خیالات کی اصلاح کرتا ہے۔

میر صاحب۔میاں صاحبزادے! جاؤ اپنا کام کرو، مجھ کو نہ ستاؤ۔میں بھرا بیٹھا ہوں۔تم میرے پھوڑے پر نشتر دے رہے ہو۔سیروں مواد بھرا ہوا ہے۔یہ تمام اُجلے اُجلے کپڑے خراب ہو جائینگے۔شہر میں سینکڑوں ہزاروں آدمی اس مذاق کے ہیں۔غزل سُناؤ۔تعریفیں سنو۔ایک شخص نے نہ کی نہیں سہی۔

عابد۔اس خیال کی کوئی وجہ۔نفرت کا سبب۔مخالفت کی دلیل۔میں آپ سے مدلل گفتگو کرنی چاہتا ہوں تاکہ جو غلط فہمی آپ کو واقع ہوئی ہے وہ رفع ہو جائے۔

میر صاحب۔تمھارے باپ اگر کہتے تو بجا تھا۔تم ٹانگ برابر کے لونڈے میری غلط فہمی کیا رفع کرو گے۔تمھاری غرض اس غزل سے جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ سُننے والے تعریف کریں۔مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے لگائیں۔ملک میں تمھاری طرف سے

آگ لگ جائے۔ قوم تمھاری طرف سے برباد ہو جائے۔ مگر تمھارا کلام باعث شہرت ہو جائے تمھارے ارادوں میں خود غرضیاں مضمر۔ تمھاری کوششوں میں ہوسِ نام و نمود پوشیدہ نام آوری تمھاری علت غائی۔ مدح و ثنا تمھاری توقع تحسین و آفرین۔ تمھاری امید تمھارے اقوال افعال تحریر تقریر چوٹی سے لیکر ایڑی تک نفسانیت سے آلودہ۔ تمھارے ذاتی سے پُر۔ اغراض خسیس سے وابستہ۔ گمراہی کا ذریعہ۔ ترغیب و تحریص کا مخزن۔ شہرت تمھارا مطلوب عزت تمھارا مقصود۔ بس یہ کل کائنات ہے جس پر پھولے پھر رہے ہو۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اگر آج رات کو کوئی ایسی ہوا چلے کہ تمھارے سوا تمام دنیا سوئی کی سوئی رہ جائے تو اپنے بیوی بچوں کو چھوڑکر باقی سب کا تم کو صرف اتنا رنج ہو کہ غزل سُنانے کا موقع میسر نہ ہوا۔ ملک و قوم کو تو جانے دو۔ محلے اور کوچے کو اگر تم سے کوئی فائدہ پہنچا تو یہ کہ جس پر تمھارا پرچھاواں پڑا وہی لامذہب ہو گیا۔ خدا کو بُرا کہنے میں تمھیں باک نہیں رسول اللہؐ کی شان میں کلمات ناشائستہ استعمال کرنے میں تم کو گریز نہیں ائمۂ عالی مقام کو بُرا کہو۔ صحابۂ کرام کو خود غرض بتاؤ۔ مذاہب میں تدشات پیدا کرو۔ معجزات کو غلط ثابت کرو۔ واقعات کا بطلان کرو۔ عقائد میں خلل ڈالو۔ احادیث کی ہنسی اڑاؤ۔ کلام الٰہی میں غلط معنی لگاؤ۔ لوگوں کو برگشتہ کرو۔ حسن و عشق کی تصویریں کھینچو۔ مردوں کو بہکاؤ عورتوں کو ورغلاؤ۔ لڑکے جوان ہوتے ہی عشق کے بندے ہو جائیں۔ لڑکیاں آنکھ کھولتے ہی حُسن کی چیری ہو جائیں۔ اس پر قدردانی کے متوقع اور صلہ کے خواستگار۔ لعنت تمھاری توقع پر اور پھٹے منہ تمھارے صلہ پر (یہ میں صرف تم کو کہہ رہا ہوں عام شعرا سے مراد نہیں) پھر یہ بھی تو نہیں کہ کہکر پشیمان ہو اور کرکے نادم۔ کہتے ہو اور علی رؤس الاشہاد کرتے ہو اور علانیہ۔ تمھاری نالائقی کا حال میں بہت عرصہ سے سُن رہا ہوں۔ تمھاری والدہ ماجدہ نے کیسی کیسی محنت و مصیبت سے تم کو پالا پوسا۔ کیا اُن کی خدمت کا یہی صلہ و منہ تھا کہ آخر وقت تمھارے ہاتھوں اُن کا دم ناک میں آ جائے

وہ اسی کی مستحق تھیں کہ تم اُن کو نکال کر اس طرح پھینکدو جیسے دودھ میں سے مکھی۔ کیا ہمیشہ یہیں بیٹھے رہوگے یا اسکی بازپرس نہ ہوگی۔ اس کا مواخذہ نہ ہوگا اسکی سزا نہ ملے گی۔ والدین کی ناراضگی اگر کہیں باعث مغفرت لکھی ہوئی ہو تو مجھے بھی بتادو کیا جواب دیتے ہو النادعن یمینی والنادعن شمالی والنادعن تحتی والنادعن فوقی کا؟ یہ بھی قیامت کے قریب ہونے کا ایک ثبوت ہے واطاع الرجل امرأتہ عن امہ۔ اسی برتے پر مغفرت کی امید کرتے ہو، یہی اعمال و افعال سبب بخشش ہو سکتے ہیں؟ شعرا کی تقلید پر جو تم کمربستہ ہوگئے یہ نہ دیکھا کہ وہ کیا زمانہ تھا اور آج کا کیا دن ہے۔ جتنا وقت تم نے ان مشاغل لایعنی میں ضائع کیا اگر کسی کار خیر میں صرف کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں تمھارے ناول طالب و مطلوبہ عاشق و معشوقہ دیکھ چکا ہوں۔ اس کے سوا اور کیا داد دے سکتا ہوں کہ پھوٹ جائیں وہ آنکھیں اور ٹوٹ جائیں وہ ہاتھ جس سے لکھے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ تم نے حتی الوسع بھلے مانسوں کے گمراہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ہاں اُردو کو تم سے اتنا فائدہ ضرور پہنچا۔ بیکس تو پہلے ہی سے پڑی ہوئی تھی۔ تم نے اپنا دست شفقت پھیر کر اور بھی حلال کردیا۔ میں تمھارے باپ دادا بلکہ اور دو ایک پشتوں تک سے واقف ہوں۔ گو دیکھا نہیں مگر اُن کے محامد اخلاق اُنکی علمیت فضیلت کا آج تمام شہر میں ڈنکا بج رہا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کی خدمت میں کچھ نہیں تو دن رات میں چار پانچ گھنٹے مجھ کو بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اگر ایک دفعہ بھی اُن کی زبان سے ایسے الفاظ سنتا تو صبر کرلیتا کہ خیال متوارث ہوگیا مگر تعجب یہ ہے کہ اُنکے سامنے تو ایسے متزلزل عقائد آدمی کا گذر بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ خدا کی شان ہے، ولیوں کے ہاں بھوت ہوجائیں۔ میرے خیال میں تم مفقود العقل نہیں ہو۔ میں تم کو صحیح الحواس دیکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ اگر ذرا عقل سے کام لو تو سمجھ جاؤ کہ یہ میرا کہنا کہاں تک درست ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ کہوں بلا کم و کاست منظور کرلو۔ میں عالم نہیں فاضل نہیں مذہب کا محقق نہیں

محدث نہیں مگر یہ ضرور کہونگا کہ چار میں سے تین نہیں تو دو باتیں ضرور ایسی نکلیں گی کہ پتھر کی لکیر۔ تم مغلوب ہوسہائے نفسانی ہو رہے ہو کہ فلاح و بہبودی کا جال پھیلا کر اس آڑ میں شکار کھیلتے ہو۔ تم غالباً میرے خیالات کو محاسدات سے تعبیر کرو گے مگر بخدائے لایزال تمھاری موجودہ طرز زندگی کا جس وقت گذشتہ اوراد و وظائف سے مقابلہ کرتا ہوں تو کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ خدا اس سے زیادہ تم کو اعزاز و ثروت دے مگر للہ اپنے خیالات کی درستی اور اپنے حالات کی اصلاح کرو۔ ان توہمات سے کنارہ کرو اور اس خود پسندی پر لعنت بھیجو۔ تمھاری قسمت میں آوارگی لکھی تھی۔ ملازمت اور صحبت موجبات ترغیب ہوگئیں لیکن میری رائے میں اب بھی تمھاری حالت ممکن الاصلاح ہے۔ تمھاری طبیعت ان نقائص کی عادی ہوگئی ہے۔ خلقی و فطری نہیں ہے۔ استخفاف مذہب ایک ایسا برا مرض ہے کہ رفتہ رفتہ مزمن ہو کر دین و دنیا دونوں سے کھو دیتا ہے۔

عابد کی غزل تو بندر کا ناریل یا اندھے کی بٹیر تھی۔ میر صاحب اپنا مغز مار رہے تھے اور وہ اپنے مضمون میں مخبوط تھا۔ بعض باتیں سنی تک بھی نہیں سوچ رہا تھا کہ کس آفت میں پھنس گیا۔ میر صاحب نے ذرا دم لیا تھا کہ سلام علیک کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

منزل چہارم

عالم ضعیفی

چمنستان شباب کے اُس کنارے پر حیات آباد سے ملا ہوا دریائے انحطاط لہریں لے رہا تھا۔ ضعیفی کی کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر لوگ پار اُترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ موجوں کے تھپیڑے، پانی کے گرداب، پہاڑوں کی چٹانیں، باد مخالف کے جھونکے

دھارے کے سامنے مشکل سے آنے دیتے تھے۔غفلت ولاپروائی کے ناخدا جب کسی بلا کا سامنا ہوتا ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ جاتے۔مسافروں کی آنکھوں پر ایسے غفلت کے پردے پڑے تھے کہ ساتھ کی کشتیاں برابر ڈوبتی چلی جاتی تھیں اور اپنی بربادی کا خیال بھول کر نہ آتا تھا۔

حیات ابدی کا تکیہ لگائے ہوئے ہوس وارمان کے میٹھے ترانے سنتے چلے جاتے تھے۔اختتام سفر کا کوئی وقت معین نہ تھا۔زندگی کے تمام سامان کشتیوں میں موجود تھے اور دنیا بھر کے کاروبار یانی میں ہو رہے تھے۔عاقبت اندیشی کا گذر نہ تھا۔انجام پر نظر نہ تھی۔غرور کا سودا دماغوں میں سمایا تھا۔طمع زردست شفقت پھیر رہی تھی۔ذرائع ناجائز گود میں لوٹ رہے تھے۔بے ایمانی کی گھٹا سروں پر چھائی ہوئی تھی۔نام ونمود کے کھرے نے کوسوں تک تیرو تار کر رکھا تھا۔ناپائیداری دنیا کا ابر تلا ہوا سروں پر کھڑا تھا مگر ہٹ دھرمی وخود پسندی کی خوبصورت دیبیاں آنکھ اٹھانے کی مہلت نہ دیتی تھیں۔ریاکاری کا تلاطم برپا تھا۔مکر وفریب کے گھڑیال منہ کھولے بیٹھے تھے۔اتلاف حقوق کے بھنور جابجا پڑ رہے تھے۔مگر یہ امید کے بندے ہیچو من دیگرے نیست کے نعرے مار رہے تھے۔

گناہ وقصور کے اونچے اونچے پہاڑ پر جمائے کھڑے تھے۔قطب نما اور دوربینیں خاک کام نہ کرتی تھیں۔پاپ کی ناؤ ٹکر کھا کر بیچ منجدھار میں ڈوبتی تھی۔

ساتھ کی کشتیوں کو ڈوبتا دیکھ کر بھی باقی ماندہ ہمسفر احتیاط نہ کرتے تھے۔اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ جو ڈوبا وہ اسی نتیجہ کا سزاوار تھا۔مجھ کو کوئی کھٹکا نہیں۔دوسری کشتیوں کی تباہی دیکھکر ہنستے تھے اور جب اپنے اوپر آکر پڑتی تھی تو چیختے جاتے تھے اور ڈوبتے جاتے تھے۔

دریائے انحطاط میں ایک جزیرہ ندامت نظر آیا۔چند نیک سیرت بزرگ صورت پھونس کی جھونپڑیاں ڈالے سرنگوں بیٹھے تھے اُن کی سپید ڈاڑھیاں

اُن کے چہروں پر نور برسا رہی تھیں۔ فضیلت کے بڑے بڑے عمامے سر سے بندھے ہوئے تھے مگر فتنہ پردازی کی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں اور گٹے پڑے ہوئے پیشانیوں پر کلنگ کا ٹیکا چمک رہا تھا۔ افعال گذشتہ کا تاسف اور اعمال کی پشیمانی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ از فرق تا پا عرقِ خجالت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آسمان پر نگاہ تھی اور لب پر اللہ ہی اللہ تھا۔

ایک گروہ دیکھا قویٰ بالکل بیکار ہوگئے تھے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ سر پر موت منڈلا رہی تھی، مگر حسرت و ارمان دونو طرف مورچھل ہلا رہے تھے۔ انقلابِ زمانہ نے اُنکی صورتیں بگاڑ دی تھیں۔ دُنیا اُن سے بھاگ رہی تھی۔ اور وہ دنیا کو لپیٹ رہے تھے۔

ایک جمِ غفیر عورتوں کا ایسا ملا کہ اس کبر سنی میں بھی جبکہ قبروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اپنی نمائش ظاہری سے فرصت نہ تھی۔ بغض و حسد کا کاجل آنکھوں میں پھیلا ہوا تھا۔ نخوت و غیبت کے تیل سے سر گُندھے ہوئے۔ کذب و افترا کا زیور پہنے ہوئے نا فرمانی کا جھومر لگا ہوا شرک و بدعت کے پھول بھرے ہوئے مکر و فریب کا تکیہ لگائے ہوئے حیاتِ ابدی کا پٹہ لکھائے ہوئے تن تن کر اپنے حسن و صورت کو دیکھ رہی تھیں۔

ایک شخص کو دیکھا آنکھوں سے اندھا ہاتھوں سے لولا پاؤں سے لنگڑا منہ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں ڈاڑھی سفید بگلے کا پر پلکیں روئی کا گالا ایک درخت کے نیچے کھڑا بیاج کے ٹوٹے کو رو رہا تھا۔

اس سے ملی ہوئی سرحد عدم آباد تھی جسکی پختہ و سنگین فصیل آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ بلندی کا یہ حال تھا کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ وسعت و رفعت کی یہ کیفیت کہ اندر کی آواز باہر نہ آتی تھی۔ مسافروں کو لوگ پھاٹک تک پہنچا سکتے تھے۔ آگے کا حال کچھ معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا

"مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنا سفر نیکنامی کے ساتھ پورا کر کے آئے۔ اپنی حالت میں شکر گزار رہے۔ جس قافلہ میں پہنچ گئے اس کے احکام پر کاربند رہے! خوش نصیب ہیں وہ عورتیں جنھوں نے اپنے خاوندوں کے دل میں جگہ کی۔ ماں باپ کو خوش رکھا۔ عزیزوں سے اچھے سلوک کیئے ہمسفروں کو شکایت کا موقعہ نہ دیا اور اپنے مذہب کے بموجب اچھے عمل کرتی رہیں۔

سائرہ اس منزل میں زیادہ قیام نہ کر سکی۔ جزیرۂ ندامت میں قدم رکھتے ہی عدم آباد کا رستہ لیا۔ ماں باپ، بہن بھائی، میاں، ساس سسرے، بیٹا بیٹی، عزیز و اقارب جو اس پردیسن کو اپنا سمجھ رہے تھے اور جنھوں نے مسافرہ سے دل لگایا روتے پیٹتے رہے اور وہ اپنا سفر ختم کرتے ہی چلتی ہوئی۔

اس منزل کے بعد آگے کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ سائرہ نہ رہی مگر اس کی یادگار اس کے عادات و اطوار باقی رہ گئے۔ سفر حیات کی چاروں منزلیں چشم زدن میں طے ہو گئیں وہی لوگ جو کل اس کی پیدائش کا سامان کر رہے تھے آج رخصت کی تیاریوں سے فارغ ہو گئے۔

(۴۸)

سائرہ کی لڑکی اب ماشاء اللہ سولھویں برس میں تھی۔ ساس نے ایک دفعہ اور سمجھایا مگر عابد اور سائرہ کس کی ماننے والے تھے۔ اپنی مرضی سے بیٹی بیاہی اپنی خوشی سے بیٹا بیاہا اس خودسری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹی تیسرے ہی دن کوٹھے سے آ لگی۔

سائرہ اور عابد دونوں کی حالت روز بروز ترقی پذیر تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عابد کا نماز روزہ سب گیا گذرا ہوا۔ دوستوں کا مجمع دروازہ پر رہتا، قہقہوں کی آوازیں دور تک پہنچتیں۔ دیوان خانہ ماشاء اللہ پری خانہ بنا ہوا تھا۔ میزیں، کرسیاں دیوار گیریاں بجلی کے لیمپ، چلونیں، پردے، گملے آرام کرسیاں تصویریں وغیرہ وغیرہ غرض

آرائش کا تمام سامان موجود تھا۔ باہر میاں نے بیٹھک کو غنچہ کر رکھا تھا۔ اندر بیوی صحن کو چمن بنائے ہوئے تھیں گملے بھی تھے بیلیں بھی تھیں چنبیلی بھی تھی۔ بیلا بھی تھا۔ میاں نے کتے پالے بیوی نے بلیاں پالیں۔ میاں ولائتی چوہے لائے۔ بیوی نے رنگ برنگ کی مچھلیاں منگوائیں۔ قصہ مختصر، اب بی سائرہ کا گھر عجائب خانہ تھا۔

جنوری کا شروع مہینہ تھا سردی خوب زور شور سے چمک رہی تھی، رات کے گیارہ بجے ہونگے۔ کسی شخص نے آکر بڑے گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ عابد کی ماں اندر کے دالان میں لیٹی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ بڑی بہو بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ منجھلی کے بھائی کا بیاہ تھا۔ دولہن کے موباف میں چمپا ٹانک رہی تھی۔ بڑی بہو نے کہا اماں جان کوئی ہمارے ہاں ہے۔ ماما سو گئی تھی۔ منجھلی بولی جاؤ دیکھو تو سہی کون ہے۔

بڑی۔ مجھے تو اکیلے ڈر لگتا ہے۔ چلو تم بھی چلو میں بھی چلوں۔

منجھلی۔ اچھی بوا اپنے گھر میں کاہے کا ڈر چلو میں بھی چلوں۔

بڑی۔ ڈر نہیں تو چلی جاؤ مجھکو کیوں لیتی ہو۔

ساس۔ بڑی بی کو جگادو۔

منجھلی۔ نہیں میں دیکھتی ہوں۔

ساس۔ بڑی دُلہن تم بھی چلی جاؤ۔

بڑی۔ ٹھیرو بنّو میں بھی آئی۔

اتنے عرصہ میں کنڈی کی آواز دو مرتبہ آچکی تھی۔ دیورانیاں جٹھانیاں ہمت کرکے پہنچیں اور پاس جاکر پوچھا کون ہے؟

جواب جو کچھ ملا وہ تو چنداں تعجب آمیز نہ تھا مگر آواز کچھ ایسی بھاری اور غیر معمولی تھی کہ دونو ڈر کر پیچھے ہٹ گئیں۔ ساس ٹھکرائیں، ماما آئیں، لڑکی آئی، غرض سب دروازے کے پاس آکر جمع ہوگئے۔ اب جو دیکھا تو صاف مولوی صاحب مرحوم

کی آواز تھی۔ مگر یہ کچھ ایسا راز تھا کہ سب کے سب متحیر کھڑے ہوئے تھے۔
ہائے تعلقات دنیا مرنے کی خبر سنکر تو یہ رنج و الم اور مرنے والے کی آواز سنکر یہ وحشت و خوف۔ بیوی بھی تھیں، بیٹی بھی تھی، بہوئیں بھی تھیں، ماما بھی تھی مگر ایک کی اتنی جرأت نہ تھی کہ کنڈی کھول دیتا۔ ادھر عورتیں حیران کہ یہ کہاں سے آگئے۔ ادھر مولوی صاحب پریشان کہ سب کھڑے بول رہے ہیں اور کنڈی ایک نہیں کھولتا۔ عابد کی ماں اور تو کچھ بن نہ آئی، کھڑکی کھول چھوٹے گھر میں گئیں اور بیٹے کو جگا کر لائیں عابد نے لالٹین لا کر کنڈی کھولی۔ باپ کی شکل دیکھتے ہی اوسان خطا ہو گئے۔ مولوی صاحب کا قدم بڑھانا تھا کہ عابد ڈر کر بھاگا، بہوئیں اپنے اپنے کمروں میں گھس گئیں۔ بیوی دالان میں جا بیٹھی۔ بیٹی ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ آدھی رات کا وقت مردوں میں لے دے کر ایک میاں عابد عورتوں کے دلوں کا اللہ ہی مالک تھا۔ مولوی صاحب یہ کیفیت دیکھ کر بہت ہی متعجب ہوئے۔ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے تھے وہی بھاگتا تھا ایک سکتے کا عالم تھا سب متحیر کھڑے تھے۔ سلام آداب ملنا جلنا سب گیا۔ جو ہے وہ قرآن شریف کی سورتیں پڑھ رہا ہے۔ مجبور ہو کر بیوی سے پوچھا۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے تم لوگ تو مجھ سے اس طرح ڈر رہے ہو جس طرح مُردے سے۔ بیوی بیچاری کی آپ روح فنا ہو رہی تھی جواب کیا خاک دیتیں۔
مولوی صاحب کا واپس آنا اور مولوی صاحب بھی کیسے کہ مردہ آناً فاناً تمام محلہ میں خبر پھیل گئی۔ جس نے سُنا دوڑ پڑا۔ رات بھر لوگوں کا تا ربندھا رہا۔ ایک آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ کہیں صبح تک جا کر گھر والوں کو مولوی صاحب کی زندگی کا یقین آیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ محض لغو خبر تھی۔ مولوی صاحب کا واپس آنا تھا کہ گھر والوں کو عید ہو گئی۔ محلہ والے باغ باغ ہو گئے۔ مریدوں کی جان میں جان آگئی۔ درگاہ جو بالکل کھنڈر

پڑی ہوئی تھی اس میں ایک چہل پہل ہو گئی۔ دلوں کا شوق، مریدوں کی کثرت، سچی عقیدت رات بھر گلی میں بازار رچا۔ باپ کی خبر سنکر دونوں بیٹے پردیس سے آئے۔ غرض دم بھر میں وہ سنسان مکان گلستان ہو گیا۔ عابد کی ماں کو مولوی صاحب کے ملنے کی ایسی مسرت و فرحت ہوئی کہ سب بیماریاں خود بخود اچھی ہو گئیں۔ مولوی صاحب کی عدم موجودگی میں اِنے گنے چار آدمی اور اتنا بڑا عالیشان مکان یا اب ماشاء اللہ ہر وقت آدمیوں کی بستی تھی۔ فقیر آتے خیرات ملتی۔ سائل آتے سوال پورا ہوتا۔ رئیس آتے دعا پاتے۔ مریض آتے شفا پاتے۔ محتاج آتے کھانا پاتے۔ ننگے آتے کپڑا ملتا۔ بھوکے آتے روٹی ملتی۔

امیر اور غریب بڈھے اور جوان ہندو اور مسلمان شہر بھر میں شاید دو چار ہی آدمی وہ بھی ڈھونڈھے سے ایسے نکلینگے جو مولوی صاحب کو اپنا بزرگ نہ سمجھتے ہوں ورنہ قریب قریب تمام شہر کو مولوی صاحب سے عقیدت تھی۔ مولوی صاحب کے مزاج میں لاکھ روپے کی ایک بات یہ تھی کہ ہندو ہو یا مسلمان یہودی ہو یا کرسٹان ہر شخص کو اسی کے عقائد پر کاربند ہونے کی نصیحت فرماتے تھے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ مولوی صاحب نے کسی ہندو کو مسلمان ہونے کی ترغیب دی ہو۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ کوئی لا مذہب مسلمان ہو کر مولوی صاحب کی شفقت مزید کا متوقع ہوا۔ مگر اُنکی نگاہ میں جسقدر اسکی عزت پہلے تھی اب آدھی بھی نہ رہی۔ مولوی صاحب کا اصول ہمیشہ یہ رہا کہ جو شخص جس مذہب کا ہو اسکے احکام کی اور اسی کے بموجب خدا کی پرستش کرے۔ یہی وجہ ہی کہ اُن جیسا ہر دلعزیز شخص ہندوؤں میں کیا اور مسلمانوں میں کیا دنیا میں ایک آدھ ہی پیدا ہوا ہو تو ہوا ہو۔ مسلمان تو خیر مولوی عالم فاضل بزرگ پیر درویش ولی جو کچھ سمجھتے ہوں مگر ہندو بھی رشی اور مُنی سے کم نہ سمجھتے تھے۔

میاں عابد کی عنایت سے جو تھوڑی بہت نئی روشنی گلی میں پھیلتی چلی تھی

مولوی صاحب کے قدموں کی برکت سے سب فرد ہوگئی۔ دس دس برس کے لڑکے چار بجے سے اُٹھکر مسجد میں نماز کو آجاتے۔ جاڑے کا موسم صبح کا مؤثر وقت ہی میاں امام الدین جیسا خوش الحان مؤذن اس طرح جھوم جھوم کر اذان دیتا تھا کہ کلیجے پر چوٹ لگتی تھی۔

اس دار المحن میں کیسے کیسے اللہ کے بندے ہوگئے ہیں کہ عقل رسا کام نہیں کرتی۔ مولانا صاحب کے اوصاف حمیدہ سُنکر تعجب ہوتا ہے کہ یہ باخدا لوگ کس خمیر سے بنائے گئے تھے۔ جو دل آزاری سے موت کی طرح ڈرتے تھے۔ مصیبت میں شریک ہونا فرض سمجھتے تھے۔ حاجتمندوں کی مدد لازم جانتے تھے۔ سُنا ہے کہ مولوی صاحب شام کے کھانے کو اُس وقت تک ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ جب تک یہ اطمینان نہ کر لیتے تھے کہ محلے بھر میں کوئی فاقے سے تو نہیں سو رہا۔ نیاریوں اور بٹیوں کے پانچ پانچ سات سات برس کے لڑکے لڑکیاں دادا میاں دادا میاں کہکر چمٹ جاتے اور اُن کو گود میں بٹھا لیتے۔ اے مادر گیتی ایسی نیک کوک کے لوگ اور یہ متبرک صورتیں اب پیدا نہیں ہوتیں۔

عابد اور سائرہ کی صورت دیکھ کر پہلے ہی دن مولوی صاحب کا ماتھا ٹھنکا تھا کیفیت سُنکر تو ہوش اُڑ گئے مگر جہاں دیدہ اور تجربہ کار آدمی شکایت اور فضیحت کیسی کبھی حقارت سے بھی نہیں دیکھا۔ جب بولے محبّت سے اور جب بات کی عنایت سے سائرہ آتی یا نہ آتی مولوی صاحب دو ایک مرتبہ بہو کے پاس ضرور ہو آتے۔ عابد کو سمجھانے کی تو ضرورت بھی نہ ہوئی۔ باپ کا آنا تھا کہ روز بروز رو براہ ہوتا گیا۔ میاں کا کروٹ لینا تھا کہ سائرہ صاف ہتّے سے اُکھڑ گئی۔ خدمت رہی نہ اطاعت وہی ہر وقت کا جھینکنا اور پیٹنا۔ سائرہ سمجھتی تھی میاں فرمانبرداری کے چکناؤ پر عمر بھر کے واسطے گردان ہو گیا جو کہوں گی وہ کرے گا۔ جو سُناؤں گی وہ سُنے گا ممکن ہے

کہ سائرہ کا قیاس درست ہوا اور یہ اسکی بدقسمتی اور عابد کی خوش قسمتی ہو کہ مولوی صاحب آگئے۔ مولوی صاحب تو غیروں کے بچوں پر جان چھڑکتے تھے عابد کی اولاد تو اُن کا خون جگر تھا۔ چھوٹی بچی آٹھ دس ہی روز میں ایسی مانوس ہوئی کہ دم بھر کو پاس سے نہ سرکتی۔ مولوی صاحب ایک روز ظہر کی نماز کو گئے ہوئے تھے اور وہ دروازے میں کھڑی دادا ابا دادا ابا چیخ رہی تھی۔ نماز پڑھ کر آئے تو دیکھتے ہی لپٹ گئی اور ہاتھ پکڑے ہوئے گھر میں چلی آئی۔ مولوی صاحب کا پاؤں ابھی چوکھٹ ہی میں تھا کہ ٹومی (کتے) پر نظر پڑی۔ قلعی دار پتیلی میں پانی پی رہا تھا اور بہو آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ غصہ میں لال ہوگئے مگر پھر بھی اتنا خیال کیا کہ اُلٹے پاؤں باہر نکل آئے ایک آدمی کو بلا کر حکم دیا کہ ان دونوں کتوں کی صورت میں اس محلے میں نہ دیکھوں۔ سائرہ تو کیا چیز تھی۔ محلہ بھر میں کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ دم مار سکتا فوراً تعمیل ہوگئی کتوں کی مفارقت کا سائرہ کی طبیعت پر اتنا اثر ہوا کہ دو وقت روٹی نہ کھائی۔ میاں سے کہا اگر مجھ کو اس گھر میں رکھنا ہے تو میرے کتے لاکر دو اور جو کتے نہیں تو میں بھی نہیں۔ جہاں وہ رہینگے وہاں میں رہونگی یا کتے لاؤ یا ڈولی لاؤ۔

اگلا زمانہ ہوتا تو کُتے کیا اگر بیوی آسمان کے تارے فرماتیں تو میاں لاتے تو کیا خاک مگر کوشش میں کمی نہ کرتے۔ اب اتنے بھی نہ تھے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ناخوش تھے اور اگر خوش بھی ہوتے تو کیا کر لیتے مولوی صاحب تو پیچھے رہے محلہ والوں ہی سے سلجھنا مشکل ہوتا۔ عابد جو کچھ کہہ سکتا تھا وہ کہا جتنا سمجھا سکتا تھا اُتنا سمجھایا مگر سائرہ وہی سبق رٹے گئی میاں سمجھا کر باہر گیا۔ بیوی نے اسباب باندھنا شروع کیا۔

سر اتو تھی ہی نہیں، پوٹلی بغل میں دبائی، لوٹا ہاتھ میں لیا چل کھڑے ہوئے گھر تھا کچھ نہیں تو تین چار دن میں خالی کر پاتی۔ ارادہ یہ کیا کہ بڑی بڑی چیزیں پلنگ چارپائی برتن وغیرہ ساتھ لیجاؤں۔ باقی یہیں چھوڑ دوں مگر چلی آج ہی جاؤں۔ بچوں کی گٹھری رکھنے

کے واسطے ایک بکس کی ضرورت ہوئی۔ کوٹھری میں اندھیرا گھپ۔ لیمپ جلا کر اندر گئی اوپر تھا مچان وہ بھی بانسوں کا۔ ٹکر لگی بانس سرک گیا۔ مچان پر تھا کاٹ کباڑ اوپر سے ایک خوان آپڑا چمنی ٹوٹ کر ہاتھ پر آئی۔ بیٹھک کے ٹکڑے ہوئے کلا تھا ڈھیلا بتی سمیت ہاتھ پر آپڑا۔ خیر یہ ہوئی کہ کرتہ بچگیا ورنہ اندر رہی اندر کام تمام ہو جاتا۔ ہائے ہائے کرتی باہر آئی۔ آنا جانا الگ رہا۔ انگوٹھے سے لیکر کہنی تک چربی نکل آئی۔ مچھلی کی طرح تڑپنے لگی میاں نے آکر دیکھا ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لایا، اپنے ہاتھ سے لگائی، تھوڑی سی دیر کو ٹھنڈک پڑگئی پھر وہی سوزش اور بے چینی۔

بہو کے عتاب اور تجویز کی خبر ذرہ ذرہ مولوی صاحب کے کان تک پہنچ رہی تھی۔ مگر وہ بالکل مطمئن بیٹھے تھے۔ جانتے تھے کہ ایک وعظ کی محتاج ہے جس دن سمجھانے بیٹھ جاؤنگا اُسی دن ٹھیک ہو جائیگی۔ چاہتے یہ تھے کہ سمجھانے کی ضرورت نہ ہو بیٹے کی طرح بہو بھی راہ راست پر خود بخود آجائے مگر بہو کا جوہر شرافت اس قدر زنگ آلود ہو گیا تھا کہ اس پر اچھے اچھے صیقل بے سود تھے۔ عمر بھر کا چڑھا ہوا زنگ دو ایک رگڑوں میں چھوٹنے والا نہ تھا۔ مولوی صاحب کی رائے کو غلط تو نہیں کہہ سکتے مگر نہ تو سمجھ ہی میں آتی تھی نہ کچھ جی ہی کو لگتی تھی کہ سائرہ ٹھیک ہو جائے گی۔ عابد کی اصلاح ایک سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ باپ کا خوف اسکی رگ رگ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جوان بچوں والا نوکر چاکر مگر یہ کیفیت تھی کہ آواز سنی اور خون خشک ہوا۔ سائرہ اس سے بالکل مستثنیٰ اس کے دل پر آج تک کسی کا خوف بیٹھا نہ خوف کی قدر جانی۔ اپنے گھر میں آنکھ کھول کر دیکھا تو سب سے پہلے دادا جن کا رعب داب تو درکنار کندھوں پر سوار ہوتی اور وہ ہنستے۔ اُن کے بعد باپ ماشاء اللہ دادا سے بھی بڑھے ہوئے۔ بیاہی گئی تو میاں ایسے ملے کہ خدمت ناجائز کو بھی عین سعادت سمجھتے رہے پھر سائرہ کے دل میں خوف بیٹھتا تو کس کا اور ڈرتی تو کس سے۔

خدا معلوم چمنی اور کلے میں کس غضب کا زہر تھا۔ ہر چند علاج کیا مگر ہاتھ تھا کہ روز بروز بگڑتا گیا۔ چھ سات روز میں انگلیاں اور ہتھیلی کہنی اور بازو سب خراب ہوگیا۔ صبح شام دو نو وقت جرّاح آکر پٹّی بدلتا۔ بھر بھر پیالے پیپ اور خون کے نکلتے عقل کام نہیں کرتی تھی کہ ہاتھ میں اس قدر مواد کہاں سے چلا آیا۔ ڈاکٹر حکیم جرّاح سب لاچار ہوگئے۔

جن اللہ کے بندوں کو بھول کر بھی خدا یاد نہیں آتا تکلیف اور مصیبت میں وہ بھی اسی سے مدد مانگتے ہیں۔ سائرہ نے میاں سے کہا میری طرف سے جاکر ابا جان سے کہو میرا قصور معاف کریں اور دعا کریں جو میں اس تکلیف سے نجات پاؤں عابد کا کیا بگڑتا تھا۔ حرف بحرف جاکر باپ سے کہدیا۔ مولوی صاحب تو ایسے موقع کے منتظر ہی تھے۔ عابد کو لئے ہوئے چھوٹے گھر میں چلے آئے۔ سائرہ نے اُٹھکر آداب کیا۔ مولوی صاحب نے دعا دی۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ کر فرمانے لگے:۔

چھوٹی دلہن بیٹا! یہ غضب الٰہی سمجھو کہ تمھارا ہاتھ کھٹائی میں پڑگیا۔ میں نے جہانتک تمھارے حالات سُنے اور دیکھے تعجب ہوتا ہے کہ تم مرنے کو کیوں بھول گئیں اس چند روزہ زندگی نے تمھاری آنکھوں پر ایسے غفلت کے پردے ڈال دیئے کہ تم خدا سے بالکل ہی منحرف ہوگئیں۔ عذاب قبر کا اندیشہ سزائے دوزخ کا ڈر نام کو بھی نہیں رہا۔ رہتا کہاں سے جب خدا ہی نہیں تو موت کیا اور موت نہیں تو سزا کیا اور جزا کیا۔ بڑے صدمے کی بات ہے تم مسلمان ہو مسلمان کے ہاں پیدا ہوئیں مسلمان کی بیٹی۔ مسلمان کی بہو اور شیطان نے تم کو ایسا ورغلایا کہ خدا کے آگے سجدہ کرنا حرام۔ نماز تمھارے اوپر فرض کی گئی تم اس سے اس قدر غافل کہ پڑھو نہ پڑھنے کا افسوس کرو کیا تم کو مرنا نہیں ہے اور جو کچھ کر رہی ہو اس کا جواب دینا نہیں ہے۔ جب تم اُنکی عبادت سے منحرف ہوکر اپنے تئیں قیدِ عبودیت

سے بری کر لیا۔ تو بڑی بے عزت ہو جو پھر اس سے واسطہ رکھو۔ سانس لینے کے واسطے
تھوڑی سی ہوا بناؤ۔ پینے کے لئے پانی لاؤ، کھانے کے لئے غلہ بناؤ۔ مرض کی شکایت کرو
عسرت کا گلہ نہ کرو۔ جب چاہو تندرست ہو جاؤ۔ جب ضرورت ہو متمول ہو جاؤ۔ ذرا
عقل پر زور دو تو معلوم ہو جائے کہ یہ ہی معمولی چیزیں زمین آسمان چاند سورج
دریا پہاڑ ندی نالے درخت کنوئیں جانور غرض جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو گی
خدا کی عظمت کا پتہ دے رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پھولوں کو دیکھو، پھولوں کے پتوں
کو دیکھو، پتوں کی گلکاری کو دیکھو، غرض کائنات دہر میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو
اظہار قدرت نہ کر رہی ہو۔ پرندوں کی تسبیح و تہلیل کو دیکھو اور اپنی اس ہمت ذلیل کو،
آج کوئی شخص تم کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا ہے تو اسکی صورت دیکھنے کی روادار نہیں ہوتیں اس
عزیز الحکیم کی شفقت و محبت پر نظر کرو کہ تمھاری ان نافرمانیوں، احسان فراموشیوں،
نالائقیوں پر بھی تم کو اپنی نعمت سے محروم نہیں رکھا۔ آنکھیں تم کو اس لئے دی گئی تھیں
کہ خدا کی قدرت کو دیکھو اس کی عظمت کو پہچانو۔ حفاظت ایمان کرو۔ تلاوت قرآن
کرو، غریبوں کو دیکھ کر رحم کرو، اپاہجوں کی خدمت کرو، اندھوں کو دیکھ کر شکر کرو، زمانہ
کا انقلاب دیکھکر ڈرو، یا اس لئے کہ دوسروں کی حالت دیکھ کر حسد کرو۔ بتاؤ تم نے آجتک
کتنے اندھوں کو پانی پلایا، کتنے اپاہجوں کی خدمت کی، تمھاری آنکھیں اس قابل نہ تھیں کہ
دونوں چوپٹ ہو جاتیں۔ زبان تم کو اس لئے دی گئی تھی کہ خدا کی تسبیح کرو بھلی بھلی باتیں کہو،
یا یہ غرض تھی کہ بزرگوں کی شان میں گستاخی کرو، چھوٹوں کی دل آزاری کرو۔ تمھارا منہ
(خدانخواستہ) بند کا بند رہ جاتا تو تم کیا کرتیں۔ تمام جسم میں سے اگر ایک عضو بیکار
ہو جاتا تو زندگی دوبھر ہو جاتی۔ دیکھ لو ایک ذرا سے ہاتھ جلنے نے کیا ناچ نچا رکھا ہے۔
تمھاری اس ناشکری سے اسکی شان کبریائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اپنی نافرمانیوں
کا اس شہنشاہ دوجہاں کی شفقتوں سے مقابلہ کرو۔ تم کو اشرف المخلوقات

پیدا کیا، ماں کو دودھ دیکر تمھاری خدمت کرنا ئی۔ تم پل بلاکر ایسی نکلیں کہ اس کے مراحم خسروانہ پر بالکل ہی خاک ڈالدی۔ بولو اس کی عنایتوں کا یہی معاوضہ تھا اور تمھاری نالائقیوں کی کیا یاد اش ہو۔ کیسے کیسے واقعات تم کو پیش آئے۔ مگر پھر بھی تمھارے کان پر جوں نہ چلی۔ جس زندگی پر تم پھولی بیٹھی ہو فقط سانس ہی کا تو کھیل ہے یا کوئی پٹہ لکھوالائی ہو۔ یہ ہی تمھاری ماما ذرا پرسوں دیر کرکے آئی تھی تو تم اس طرح بگڑ رہی تھیں کہ مجھ تک صاف آواز آرہی تھی۔ تم نے اپنے آقا اپنے مالک کی کتنی خدمت انجام دی؟ ذرہ بھر نہیں، رتی بھر نہیں، مفت کی روٹیاں توڑیں اور بے غیرتی کی تنخواہیں ماریں۔ ایک دن بھی اپنا فرض منصبی ادا نہ کیا۔ غور کرو اور گریبان میں منہ ڈالکر دیکھو صبح سے شام تک کتنے کام اچھے کرتی ہو اور کتنے بُرے۔ رات کو سوتے وقت سوچو کہ دن بھر کیا کیا۔ تمھارے دادا اللہ بخشے اس مزاج کے آدمی نہ تھے میں نے اکثر اُن کو جمعہ میں دیکھا مگر آج مجھکو آئے ہوئے دو مہینے کے قریب ہوگئے۔ تم کو ایک وقت کی نماز پڑھتے ہوئے سُنا بھی نہیں۔ چوتھا یا پانچواں روز ہوگا۔ میاں سلیم سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی تم سے کچھ خوش نہیں۔ ماں کو بھی ناخوش سُنتا ہوں۔ غرض کوئی ایسا نہیں جو تمھاری تعریف کرتا ہو۔ قرآن شریف تو شاید تم نے پڑھا ہے وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ۝ (ترجمہ) اور ماں باپ سے بھلائی۔ کبھی پہنچ جاویں تیرے سامنے بڑھاپے کو وہ ایک یا دونوں تو نہ کہہ ان کو ہوں اور نہ جھڑک اُن کو اور کہہ اُن کو بات ادب کی اور جھکا اُن کے آگے کندھے عاجزی کر کر نیاز سے اور کہہ اے رب ان پر رحم کر جیسا پالا اُنھوں نے مجھ کو چھوٹا۔

ماں جس نے پیٹ میں رکھا خدمت کی پالا پوسا دن کو دن نہ سمجھا رات کو رات نہ سمجھی وہ بھی نالاں، باپ۔ ہے وہ فریادی، بتاؤ تو سہی خدا کو کیا منہ دکھاؤ گی اور کیا جواب

دو گی۔ تم خود بھی تو ماں ہو۔ سمجھ سکتی ہو جان سکتی ہو اور جانتی ہو کہ کس مصیبت سے بچے پلتے ہیں۔ ماں جیسی نعمت کی تم نے یہ قدر کی اس کا خمیازہ تم کو دنیا میں یہ ملا کہ جو ہے وہ تم سے بیزار۔ آخرت کا تو حال معلوم ہی نہیں کہ کیا ہو گا۔ کواری تھیں تو ماں باپ کا دم ناک میں رکھا۔ بیاہی گئیں تو ماں کو غلام سمجھا۔ ساس ہی کو خوش رکھا ہوتا۔ تم نے تو خاک بھی کچھ نہ کیا اور بھی تو دو بہوئیں ہیں یا تم ہی انوکھی ہو کہ خدا کی نہ رسول کی روزے کی نہ نماز کی۔ باپ کی نہ ماں کی۔ میاں کی نہ ساس کی۔ میں تمھاری ساری داستان سُن چکا ہوں مگر اس کا دُہرانا مصلحت نہیں سمجھتا۔ خود ہی خیال کرو کہ کیا کر چکی ہو اور کیا کر رہی ہو۔ سُسرال تمام دنیا کی لڑکیوں کے واسطے دوسری دنیا کہی جاتی ہے مگر تمہاری سُسرال انصاف کرو تو میکے سے کم نہ تھی۔ ذرا انسانیت سے کام لیتیں تو عابد جیسے میاں کے دل میں گھر لینا اور اس کی ماں جیسی ساس کو پرچا لینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اب بھی اگر صدق دل سے توبہ کرو اور جو کیا ہے اس پر منفعل ہو تو کچھ نہیں گیا وہ غفورٌ رّحیم ہے معاف کرے گا۔ ماں باپ تم سے لاکھ بیزار ہوں۔ جس وقت سامنے جا کر سرنگوں کھڑی ہو گی تمھاری خطاؤں پر خاک ڈالیں گے۔ ساس کو اگر آج تمھاری اصلاح کا حال معلوم ہو جائے تو میں سچ کہتا ہوں کہ وہ عابد سے زیادہ تم کو سمجھیں۔ عابد گو میرا بیٹا ہے مگر تم بھی اس کے مزاج کو سترہ اٹھارہ برس سے برت رہی ہو اسکو رضامند کرنا کیا مشکل کام ہے۔ سچ پوچھو تو تمھاری برابر کوئی خوش نصیب نہیں کہ ابھی سب باتیں تمھارے اختیار میں ہیں۔ خدا کی عنایت سے والدین بھی زندہ ہیں ساس بھی موجود ہیں اب رہا سب سے بڑا معاملہ خدائے وحدہٗ لاشریک کا۔ اس کا دریائے رحمت ہر وقت موجزن ہے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جب سر جھکاؤ گی اور اپنے پچھلے قصوروں کی معافی چاہو گی جو مانگو گی وہ عطا کرے گا۔ سائرہ بیٹی! دنیا تو ہر طرح گذر ہی جائے گی مگر وہاں کیا کرو گی جہاں ان اعمال کی باز پرس ہونی ہے

یاد رکھو اُس وقت کوئی چیز کام نہ آئے گی۔ ہاتھ پاؤں جنکو اپنا سمجھ رہی ہو تمھارے برخلاف شہادت دے رہے ہونگے۔ زبان تمام کچا چٹھا کھولدیگی۔ یقین کرو کہ تمھارے افعال اعمال نشست برخاست حرکات سکنات سب قلمبند ہو رہے ہیں اور یہ دفتر ایک دن کھلنا ہے اُس دن کو سامنے سمجھو اور اُس وقت کو آیا گنو۔ چھوٹی دُولہن بیٹی! دل سے زبان سے ہاتھ سے پاؤں سے اپنے سے غیر سے جو کچھ کرو یہ سمجھ لو کہ اس کا حساب دینا پڑیگا۔ موت کو دور نہ سمجھو۔ کیسے کیسے کڑیل جوان اُٹھے چلے جا رہے ہیں دیکھ لو وبا نے محلہ کا محلہ خالی کر دیا۔ میرے سامنے کے بچے جنکا سبزہ بھی آغاز نہ ہوا اجل کا شکار ہو گئے۔ یہ سب نمائشی ٹیپ ٹاپ عارضی تعلقات ہیں۔ اصل مکان وہی ہے۔ یہ وہ رستہ ہے کہ دن رات چل رہا ہے۔ ڈولیاں لگی کھڑی ہیں چلنے کے واسطے تیار رہو، اس ظاہر فریب دنیا کے بے اصل فروعات و جزئیات میں آشیانہ پھنسو کہ وقت پر انکا فراق ناگوار خاطر ہو، یہ رشتے فانی یہ تعلقات سریع الزوال یہ حیات بے ثبات دولہن بیوی! وہ رستہ بہت ٹیڑھا ہے۔ اچھے اچھے نمازی پرہیزگار عابد و تہجد گزار ایک ذرا سی بھول چوک میں خطا وار ہو جاتے ہیں۔ کام وہ کرو کہ یہاں نیک نام رہو اور وہاں شادکام۔ دنیا کو اس طرح برتو کہ جو دیکھے وہ خوش ہو اور جو سُنے وہ تعریف کرے۔ خدا کے سامنے اس طرح جاؤ کہ اعمال کا تاسف نہ کرنا پڑے۔ دنیا ایک سرا ہے اور زندگی زمانۂ سفر، یہ اچھے بُرے واقعات جو تم کو پیش آرہے ہیں سب عارضی ہیں۔ مسافر ہو کر چند روز سرا میں رہ کر اپنے اصلی گھر کو واپس چلی جاؤ گی۔ ایمان تمھارا زادِ راہ ہے اور شیطان قزاق۔ اس طرح غافل ہو کر نہ سوؤ کہ جمع پونجی سب غارت ہو جائے۔ جن آنکھوں سے آئی ہو انھیں آنکھوں سے جاؤ۔ ان بے ثبات جھگڑوں کی دلدادہ نہ بنو۔ تم کیا اور تمھاری محبت کیا۔ مسافر کا کوچ کیا اور مقام کیا۔ منزل کی صبح کیا اور شام کیا۔ اللہ کے بندوں کی دُعائیں لو یہ تمھاری سوغات ہے۔ روح کو پاک صاف لیجاؤ جو تمھارے پاس امانت ہے۔ عرب میں مجھکو ایک ایسے بالاخانہ پر ٹھہرنے

کا اتفاق ہوا کہ جس کے نیچے سرا تھی۔ میں دن بھر یہی دیکھتا تھا کہ بیسیوں مسافر آئے ایک دو روز ٹھہرے اور چلے گئے۔ اس سرا کو دیکھ کر مجھ کو بالکل دنیا کا نقشہ یاد آتا تھا بعینہ یہ ہی کیفیت سرائے دنیا کی ہو۔ آئے کچھ عرصہ ٹھہرے اور چل دیئے۔ آگے پیچھے اوپر سویر سب چلے جا رہے ہیں۔ تمھاری دادی کے غسل صحت میں باہر کے دیوان خانہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ جب مہمان رخصت ہو گئے اور گھر ہی گھر کے آدمی رہ گئے تو تمھارے پیپل والے مکان میں میں نے خود گنا تھا بائیس آدمی سپید ڈاڑھی والے ایک خاندان کے موجود تھے اب بتاؤ کتنے ہیں سب نے جا کر قبروں کو آباد کر دیا۔ ایک تمھارے چھوٹے نانا کا دم باقی ہے سو وہ بھی کوئی دن کی ہوا کھا رہے ہیں۔ تمھاری شادی میں اُن صورتوں میں سے ایک صورت بھی نہ دکھائی دی۔ سائرہ بیگم اس گھر کو تو خوب سنوارا کرسیاں اور میزیں پردے اور چلونیں گھنٹے اور گھڑیاں پھول اور پھلواری سب کچھ لگایا۔ اُس گھر کا بھی تو کچھ فکر کرو جہاں ابد الآباد رہنا ہے کوئی چار دن ادھر گیا کوئی چار دن اُدھر۔ جا سب ایک ہی جگہ رہے ہیں۔ منزل وہی رستہ وہی قبر وہی کفن وہی کسی کے واسطے خارستان اور کسی کے واسطے گلستان۔

تم کو دنیا میں اگر زور دیا گیا تو کیا اسلیئے کہ کمزوروں پر شیر ہو۔ بیچاری مظلومہ جبکی میں اور تمھاری ساس دونوں عزت کرتے ہیں۔ اس ٹوٹے ہوئے گھر میں پڑی ہے اور آج سے نہیں بیس پچیس برس سے کیا شریف عورت ہے۔ تمام رنڈاپا ہماری آنکھوں کے سامنے اس در پر کاٹ دیا۔ مفلسی میں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ فاقہ میں کسی سے بھیک نہ مانگی بیوہ دکھیاری مصیبت کی ماری مگر ایسی ایماندار اور پرہیزگار کہ جائے اور نماز نہ چھوڑے۔ اس فقیری میں یہ کیفیت ہے کہ دن بھر کے ٹکڑے جو کچھ میسر ہوتا ہے اُس میں سے بھی ایک آدمی کی روٹی مسجد میں بھیجدیتی ہے۔ وہ تمھارے لینے میں نہیں دینے میں نہیں۔ آس نہیں پاس نہیں تم نے خواہ مخواہ

بلاوجہ بلا قصور سینکڑوں باتیں سُنا ڈالیں۔ بیٹی میں سچ کہتا ہوں اسکا چہرہ معبود حقیقی کے سامنے چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا اور تم سرنگوں کھڑی ہوگی۔

تم نے جس روز سے ہوش سنبھالا اُس روز سے آجتک عمر گزشتہ پر ایک نظر ڈال جاؤ اور دیکھو کہ تمھارے اعمالنامے میں کتنی نیکیاں ہیں اور کتنی بدیاں۔ یہ تمھارے افعال تخم ریزی ہے جسکی کھیتی تم کو مرکر کاٹنی پڑیگی۔ جو بویا ہے وہ لے لینا۔ بیٹی! وہ بہت نازک وقت ہوگا اس وقت کی شرم خدا ہی کے ہاتھ ہے۔ عابدُ زاہد ولی و نبی سب سراسیمہ و پریشان ہونگے۔ اعمال کے سوا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔ خدا کے واسطے اپنی حالت پر رحم کرو مرنے کا یقین کرو اور اس آنیوالی گھڑی کا خوف کرتی رہو۔ کام ایسے کرو کہ رستہ آسانی سے طے ہو جائے۔ ایسی ہلکی پھلکی جاؤ کہ چشم زدن میں بیڑا پار ہو جائے۔

ہاتھ کی اذیت نے سائرہ کو پہلے ہی خدا کی طرف کچھ کچھ متوجہ کردیا تھا۔ مولوی صاحب کا وعظ شروع کرنا تھا کہ کانپ اٹھی۔ آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ مولوی صاحب کہتے جاتے تھے اور اس کی طبیعت بے اختیار ہوتی جاتی تھی۔ اتنا روئی اتنا روئی کہ ہچکی بندھ گئی۔ افعال گزشتہ پر نظر ڈال کر دیکھتی تھی تو تمام اعمال نامہ سیاہ نظر آتا تھا۔ تل بھر سفیدی باقی نہ تھی۔ سوچتی تھی کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو دس بیس گناہ سرزد نہ ہوئے ہوں۔ مولوی صاحب وعظ فرماکر عصر کی نماز کو چلے گئے۔ سائرہ روتے روتے بیہوش ہوگئی۔ وہی خیالات خوف و عذاب جو بیقرار کررہے تھے خواب کی صورت میں ظاہر ہوگئے۔ کیا دیکھتی ہے کہ گھر میں مرد اور عورتیں بھری ہوئی ہیں اور آپ مُردہ پڑی ہے۔ شاکرہ ایک کونہ میں کھڑی رو رہی ہے، بچے سر پھوڑ رہے ہیں۔ دادی پھوپی چیخ رہی ہیں اور نہلانے کی تیاریاں کرتی جارہی ہیں۔ ماں اور نانی نے لے جاکر تختے پر لٹایا اور غسل دینا شروع کیا۔ نہلا چکیں تو عطر لگایا۔ گلاب لگایا۔ کافور لگایا۔ کفن پہنایا۔ اور چارپائی پر لٹادیا۔ ماں روتی رہی۔ نانی بیٹھی

رہیں۔ بچے چیختے رہے۔ مردوں نے کلمہ پڑھ چارپائی اٹھائی اور لے چلے۔ شہر سے باہر نکل کر ایک ٹوٹی ہوئی مسجد میں نماز پڑھی اور قبرستان میں لے گئے۔ قبر پہلے سے تیار تھی۔ باپ اور نانا نے مل کر قبر میں اُتارا اور پٹاؤ رکھکر مٹی ڈالنی شروع کی۔ بہتیرا چیخی چلائی آوازیں دیں نام لے لے کر پکارا مگر کسی نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ پٹاؤ کا رکھنا تھا کہ قبر نے اس زور سے بھینچا کہ تمام ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ فشار قبر سے فارغ ہوتے ہی دو ایسی صورتیں دکھائی دیں کہ تمام عمر دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ہاتھوں میں گرز اور موگریاں تھیں۔ چند سوال کیئے مگر سائرہ ایسی سٹ پٹائی ہوئی تھی کہ ایک سوال کا بھی جواب نہ دے سکی۔ دہکتی ہوئی موگریاں اور چمکتے ہوئے گرز پڑنے شروع ہو گئے۔ مارپیٹ چکے تو اُن میں سے ایک نے باآواز بلند کہا:۔

سائرہ! تیرا سفر ختم ہوا تو دنیا میں اس غرض سے بھیجی گئی تھی کہ نیک عمل کرے اور اس گھر میں آنے کے واسطے ہمیشہ تیار رہ۔ افسوس تو نے مسافر ہوکر ایسی دُھونی دی کہ نکلنے کو جی ہی نہ چاہا۔ تو چاہتی تو یہ گھر آج تجھ کو روشن و منور ملتا جواب اندھیرا گھپ پڑا ہے۔ تجھ کو اپنے اعمال کی سزا بھگتنی ہے۔ دوزخ تیرے واسطے تیار ہے۔ تیرے اوپر یہ سات جرم قائم کیئے گئے ہیں ان کا جواب دے تاکہ سزا شروع ہو جائے۔ چونکہ تو مسلمان تھی اور تیرا ایمان قرآن تھا، یہ ساتوں جرم کلام الٰہی کی آیتوں کے بموجب ہیں اور تیری بریت کے واسطے تجھ کو اتنا اختیار دیا جاتا ہے کہ تو احکام الٰہی سے ان کی تردید کردے۔

"خدا[1] کو کبھی سجدہ نہ کیا۔ ماں[2] باپ کو ناراض رکھا۔ خاوند[3] کی اطاعت نہ کی مال[4] یتیم غصب کیا۔ عزیزوں[5] کی دل آزاری کی۔ جھوٹ[6] سے تو نہ بچی۔ حسد تو نے کیا۔ زکوٰۃ[7] نہ دی خیرات نہ کی۔

جس چورا ہے نے تیرا بچہ اچھا کیا تھا اُس کو بلا کہ اب اس مصیبت سے بچائے یہ کہکر ایک گرز اس زور سے مارا کہ نعش کا تمام جسم پاش پاش ہوگیا۔ گرز کا پڑنا تھا کہ سائرہ نے چیخ ماری۔ آنکھ کھولکر دیکھا تو ساس سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں وعظ کا اثر خواب کا دھڑکا، بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ اب سائرہ کو یقین ہوگیا کہ واقعی میں خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق ہوئی۔ اگر میں مرگئی ہوتی تو ہمیشہ کے واسطے وہ عذاب تھا اور میں تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی ان جرائم کا انسداد اور اعمال کی تلافی میرے اختیار میں ہے۔ اٹھی اور ساس کے گلے لپٹ کر رونا شروع کیا قصور معاف کرایا۔ ماما سے پانی کا لوٹا منگواکر وضو کیا۔ خدا کی شان کڑکڑاتے جاڑوں میں ٹھنڈا برف پانی ہاتھ پر تو تیر کی طرح لگا مگر خاصیت میں اکسیر ہوگیا۔ وضو کیا نماز پڑھی۔ یہ عمر بھر میں پہلی نماز تھی جو سائرہ نے پڑھی۔ سجدے میں پڑی تھی اور آنکھ سے آنسو کی لڑی بہہ رہی تھی۔ نماز سے فارغ ہوئی۔ میاں کے آگے ہاتھ جوڑ قصور معاف کرایا۔ اجازت لے کر ڈولی منگوائی اور ماں کے پاؤں میں جاکر گر پڑی ماں نے اٹھاکر کلیجے سے لگایا۔ سائرہ کی ندامت وانفعال دیکھ کر شاکرہ اور سلیم دونوں نہال ہوگئے۔ ماں کے ہاں سے آئی دونو جیٹھانیوں سے گلے ملی۔ محلے کے بچے بچے سے معافی مانگی۔ مظلومہ کے آگے ہاتھ جوڑے اور نہایت عاجزانہ ودیندارانہ زندگی بسر کرنے لگی۔ خدا کی شان بڑی ہے۔ جسکو چاہے دم بھر میں جو کچھ کردے۔ وہی بی سائرہ جو کبھی بھول کر بھی خدا کا نام نہ لیتی تھیں۔ ایسی عابدو زاہد ہوئیں کہ جو دیکھتا وہ تعجب کرتا۔ صبح چار بجے سے نماز کو اٹھتی۔ نماز سے فارغ ہوئی۔ قرآن شریف لیکر بیٹھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک پڑھتی رہی۔ اس کے بعد وظیفے شروع کیے۔ غرض نافلۂ اشراق تک مکروہات دنیوی کو ہاتھ لگانا قسم تھا۔ وہ سائرہ جو ساس کی جان کی دشمن اور خون کی پیاسی تھی۔ ساس کی

ایسی خدمت کرنے لگی کہ ماماؤں کو پرے بٹھا دیا۔ میاں کی ایسی طاعت کی کہ کیا کوئی لونڈی کریگی۔ جس بیوی نے کبھی میاں کے انگرکھے میں بند تک نہ ٹانکا بارہ بارہ ایک ایک بجے تک پاؤں دباتی۔ وہ بیٹی جس نے ماں کو کبھی جوتی کے برابر نہ سمجھا دور سے شکل دیکھ لیتی تو تعظیم کو کھڑی ہو جاتی۔ وہی محلے کی عورتیں جو سائرہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتی تھیں۔ جو منہ میں آتا کہہ جاتیں اور وہ سنکر چپ ہو جاتی گھر کا تمام اسباب بڑے گھر میں بھجوا دیا اور ساس کے ساتھ رہنے سہنے لگی۔

سائرہ کی اصلاح ایک ایسا اچنبھا تھا کہ جو سنتا تھا وہ جھوٹ سمجھتا تھا۔ اتفاق سے کنبے میں ایک شادی ٹھہری۔ ڈومنیوں کے ناچ کے وقت سب بیویاں اکھٹی ہو کر بیٹھیں تو سائرہ کی تلاش ہوئی۔ سائرہ نماز تہجد کی نیت باندھ چکی تھی۔ فجر تک جانماز پر بیٹھی پڑھتی رہی۔ سائرہ کی یہ کیفیت دیکھ کر اس بھرے مجمع میں کوئی عورت ایسی تھی جو اس کی تعریف نہ کرتی ہو۔ کئی دفعہ مرید ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر مولوی صاحب اپنی طرف سے ایک عرصہ تک ٹالتے رہے۔ جب سائرہ کے اس استقرار کا مولوی صاحب کو اعتبار ہو گیا تو ایک روز مولینا ولی اللہ شاہ کا مرید کرا دیا۔ مرید ہونا تھا کہ بے ثباتی دنیا کا نقش دل پر جم گیا۔ دن رات سائرہ تھی اور ذکر خدا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جو خدا کی عظمت کو یاد کر کے گھنٹہ آدھ گھنٹہ نہ روتی ہو۔ چند روز میں نوبت یہانتک پہنچی کہ مال اور اولاد غرض دنیا و مافیہا سے بیزار ہو گئی۔ کوئی سائل دروازے پر آتا تو ننگے پاؤں دوڑ کر کھانا دیتی۔ نماز و تلاوت سے جو کچھ وقت بچتا اپاہجوں کے کپڑے سیتی۔ یتیموں کی خدمت کرتی۔ مسافروں کا کھانا پکاتی جس اللہ کی بندی نے عمر بھر رمضان کا بھی کوئی روزہ نہ رکھا جمعہ جمعرات کا روزہ رکھنے لگی۔ بیوی کی یہ کیفیت دیکھ کر عابد کا دل خود بخود بے ثبات دنیا سے بیزار ہوتا چلا۔ آپ بھی مرید ہوا اور دونوں میاں بی بی ہر وقت اللہ اللہ کرنے لگے۔ ماں باپ

کی یہ کیفیت دیکھ کر بچوں پر ایسا اثر پڑا کہ وہ چھوٹی سی بچی بھی ماں کے ساتھ جانماز پر سجدے کیا کرتی۔ کچھ ایسی خدا کی برکت ہوئی کہ بیٹے اور بیٹیاں بہو اور داماد غرض دونوں میاں بیوی اور ساری اولاد دینداراتہ زندگی بسر کرنے لگے۔ جس گھر میں رحمت کا فرشتہ کبھی بھول کر بھی نہ آتا تھا روز و شب یاد خدا سے منور رہنے لگا۔

افکار دنیوی کے بدلے اندیشۂ آخرت سائرہ کے پیچھے ایسا لگا کہ دن رات اسی خوف سے گھلی جاتی تھی۔ کوئی لمحہ ایسا نہ جاتا تھا کہ عذاب قبر اسکے دل سے فراموش ہوتا ہو۔ یہ ڈر سائرہ کے دل میں ایسا بیٹھا کہ بخار شروع ہوا۔ کھانسی ہوئی۔ علاج میں کی لاپروائی بخار جم گیا۔ کھانسی بڑھ گئی۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں یہ کیفیت ہوگئی کہ بخار دم بھر کو بھی مفارقت نہ کرتا۔ مولوی صاحب اور عابد نے سینکڑوں علاج کر ڈالے۔ شاکرہ اور سلیم نے بیسیوں حکیم تبدیل کئے مگر بخار کو مطلق جنبش نہ ہوئی۔ ڈاکٹروں نے سل تجویز کی۔ حکیموں نے دق بتائی۔ غرض سب نے جواب دیدیا۔ علاج پورے ہوئے اور تدبیریں ختم۔

چھ سات مہینے تک سائرہ بیماری کی مصیبتیں جھیلتی رہی مگر کیا مجال جو ایک وقت کی نماز قضا کی ہو یا اوقات معمولی میں فرق آنے دیا ہو۔ بخار زور شور کا چڑھا ہوا ہے کھانسی ہو کہ دم نہیں لینے دیتی۔ مگر وضو کیا اور نماز کو کھڑی ہوگئی لیکن کہاں تک۔ بخار ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ سب ڈیل ڈول خاک میں مل گیا۔ سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ طاقت بالکل سلب۔ چند روز یہ کیفیت رہی کہ دو آدمی پکڑ کر بٹھا دیتے اور نماز پڑھ لیتی۔ جب اس لائق بھی نہ رہی تو لیٹے ہی لیٹے جس طرح ہوسکتا اور جتنا کچھ ہوسکتا پڑھ پڑھا لیتی۔ بھوک تھک گئی۔ تیمارداروں کی زبردستی سے شوربے کے دو ایک چمچے پیئے۔ مگر ادھر پیئے اُدھر نکل گئے۔ جس دن سے سائرہ بیمار پڑی تھی۔ شاکرہ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی۔ چپکے چپکے بیٹھی رو یا کرتی۔ سلیم نے ایک دفعہ سمجھایا کہ تم کیوں رو کر بدشگونی

کرتی ہو انشاء اللہ اچھی ہو جائیگی۔ میاں کا اتنا کہنا تھا کہ شاکرہ نے بے اختیار ہو کر کہا۔ یہ شیرنی میری آنکھوں کے سامنے سے اٹھی چلی جارہی ہے۔ تم مجھکو بہلاتے ہو میں ایسی بچہ نہیں ہوں جو اتنی بات بھی نہ سمجھ سکوں۔ کیا کہتے ہو سائرہ مجھ سے چھوٹ جائے اور میں اُف نہ کروں۔

دوپہر کے وقت ایک روز شاکرہ نے چنبیلی کا تیل ڈال کر سائرہ کے سر میں کنگھی کی۔ کپڑے بدلے۔ شاکرہ کے ہاتھ میں خدا نے کچھ ایسی برکت دی کہ سائرہ خود بخود اٹھ بیٹھی شوربا منگوا کر پیا۔ اپنے ہاتھ سے پانچ چھ دانے انار کے کھائے۔ خاصی اچھی طرح بیٹھی سب سے باتیں کر رہی تھی کہ پھر مواخذۂ عاقبت کا تصور بندھا۔ ماں سے کہنے لگی مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا۔ ماں باپ کو میں نے تکلیف پہنچائی۔ سسرال والوں کو میں نے اذیت دی۔ خدا کی عبادت مجھ سے نہ ہوئی۔ خدمت والوں کی خدمت مجھ سے نہ ہوئی۔ گنہگار رہی۔ شرمسار چلی۔ مجھپر جو کچھ عذاب ہو سب بجا اور درست ہے۔ میں روسیاہ اسی قابل ہوں۔ عمر ختم ہوئی۔ دو چار سانس باقی ہیں۔ وہ پورے کر رہی ہوں۔ دنیا کا سفر پورا ہوا۔ اب آخرت کی منزل درپیش ہے جو کچھ لائی تھی سب لٹا چکی۔ خالی ہاتھ۔ کوئی سنگ نہ ساتھ۔ سفر ہولناک۔ رستہ کٹھن منزل کڑی اماں کیسی مصیبت آکر پڑی۔ غریبوں پر ظلم کئے۔ یتیموں کے مال مارے بے ایمانیاں کیں غیبتیں کیں حسد کیا۔ غرض کوئی کام ایسا نہ کیا جو انجام اچھا ہوتا۔ ایک جمنی نے میری جان پر بنا دی۔ دوزخ کی آگ کس طرح برداشت کرونگی۔ میں نے تو ایک بھی نیک کام نہ کیا۔ مغفرت کی امید کس برتے پر۔ خدا کے واسطے مجھ پر رحم کرنا میرا کہا سنا معاف کرنا۔ ابا جان آپ بھی میرے قصوروں کو معاف کیجئے۔ مجھکو اتنی جلدی نہ بھول جائیے گا کہ میں فاتحہ کو بھی محتاج ہو جاؤں۔ اس کے بعد سائرہ میاں سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ کھانسی اٹھی اور اس غضب کی کہ سانس لینا

مشکل ہو گیا۔ اسی حالت میں سائرہ نے خاوند کے اوپر نگاہ ڈالی ہاتھ دونوں جوڑے آنکھیں پھر گئیں۔ سب نے ملکر چیت لٹا یا۔ شاکرہ کے ہاتھ پر سر تھا کہ سائرہ کی روح نے عالم بالا کو پرواز کیا۔

سائرہ کا مرنا ایک ایسی بھاری موت تھی کہ سب کے دل بیٹھ گئے۔ شاکرہ کی آس ٹوٹی۔ سلیم کی کمر ٹوٹی عابد کا دل ٹوٹا۔ سائرہ آپ مرگئی اور پس ماندگان کو مُردہ سے بدتر بنا گئی۔ شاکرہ یا تو ہر وقت بیٹی کو بُرا بھلا کہتی رہتی تھی یا یہ کیفیت ہوئی کہ دن رات منہ سر اوندھائے پڑی رہتی۔ بیٹی کے ساتھ ہی کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ کسی نے کچھ زبردستی کھلا دیا تو تھوڑا بہت کھا لیا۔ ورنہ وہ تھی اور سائرہ کا خیال۔ عابد یا تو بیوی کے ہاتھوں زندگی سے تنگ آگیا تھا یا ہر وقت گم سم بنا بیٹھا رہتا۔ بچے بے وارثے ہوگئے۔ سر پر باپ دادا نانی سب موجود تھے۔ مگر ماں کی بات ماں ہی کے ساتھ تھی۔ سلیم یا تو ایسا بیزار تھا کہ شکل دیکھنے تک کا روادار نہیں۔ یا ایسا بے قرار ہوا کہ قبر پر بیٹھ کر گھنٹوں روتا۔ ساس جب تک زندہ رہیں رات کو سوتے وقت ایک سورۂ یوسف، ایک وقت کا کھانا بہو کے نام کا برابر بھیجتی رہیں مولوی صاحب نے یہ معمول کر لیا کہ جمعہ کو نماز مغرب اور پیر کو نماز صبح قبرستان میں جا کر پڑھتے۔ وہاں کا حال تو خدا ہی جانے مگر بظاہر سائرہ اپنے ہمسفروں کے پاس آخر منزل میں اتنی محبت چھوڑ گئی کہ اس بیکسی و تنہائی کے عالم میں بھی اس کے پاس کچھ نہ کچھ پہنچ جایا کرتا تھا۔



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] لازم [illegible]

[illegible]

[illegible]